یہی ہے زندگی اپنی، یہی ہے بندگی اپنی
کہ ان کا نام آیا اور گردن جھک گئی اپنی

داستانِ خانوادہ
مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

یہ ایک عظیم خانوادہ کی داستانِ حیات ہی نہیں، بلکہ اس
برصغیر میں مسلمانوں کے فکر کی پوری تاریخ ہے!

جلد اوّل

عبد اللہ ملک

کوثر پبلشرز ۔ ۶۵ شوکت حیات کالونی
ماڈل ٹاؤن لاہور
ٹیلیفون نمبر ۸۵۱۴۰۰

یہی ہے زندگی اپنی، یہی ہے بندگی اپنی
کہ ان کا نام آیا اور گردن جھک گئی اپنی

داستانِ خانوادہ

مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

یہ ایک عظیم خانوادہ کی داستانِ حیات ہی نہیں، بلکہ اس برصغیر میں مسلمانوں کے فکر کی پوری تاریخ ہے!

جلد اوّل

عبداللہ ملک

یہی ہے زِندگی اپنی ، یہی ہے بندگی اپنی
کہ ان کا نام آیا اور گردن جھک گئی اپنی

داستانِ خانوادہ

مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

یہ ایک عظیم خانوادہ کی داستانِ حیات ہی نہیں ، بلکہ اس
برصغیر میں مسلمانوں کے فکر کی پوری تاریخ ہے !

جلد اوّل

عبداللہ ملک

کوثر پبلشرز - ۴۶ شوکت حیات کالونی
ماڈل ٹاؤن لاہور
ٹیلیفون نمبر ۸۵۱۴۰۰

باراول ـــــــ جون ١٩٧٩ء

صفحات ـــــــ ٣٣٦

قیمت ـــــــ ١٤٠/٠ روپے

ناشر ـــــــ کوثر پبلشرز

تزئین وکتابت ـــــــ شیخ عبدالمجید

طابع ـــــــ پاکستان ٹائمز پریس لاہور

کوثر پبلشرز ـــــ ٤٦ ـ شوکت حیات کالونی

فون ٨٥١٤٠٠ ـــــــ ماڈل ٹاؤن لاہور

انتساب

حضرت مولانا عبید اللہ انور کے نام

ترتیب

حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح کی پہلی جلد مکمل ہوگئی ہے اور آج جب ۱۹۷۸ء کے سال کا سورج غروب ہوئے دس گیارہ گھنٹے گزر چکے ہیں اور اب اس کی رات بھی ڈوب رہی ہے اور ۱۹۷۹ء کے سال کی صبحِ نو ہونے کو ہے ابھی فجر کی اذان بھی نہیں ہوئی تو میں ان تین سو صفحات پر پھیلی ہوئی پہلی جلد کا ابتدائیہ رقم کر رہا ہوں

خیر اے عہد محبت ترے انجام کی خیر
انتہا کی یہ مسرت ہے جو آغاز میں ہے

آج صبحدم میں واقعی بہت ہلکا محسوس کر رہا ہوں، جیسے ایک گراں قدر ذمہ داری کا تھوڑا بہت بوجھ سر سے اتر گیا ہو، فرض کی قدرے تکمیل ہوگئی ہو۔ قرض سے ایک گونہ فراغت حاصل ہوگئی ہو، اس لیے کہ میری شخصیت، اس کی تربیت، اس کے نکھار، اس کے نشو ونما اور اس کے اظہار میں مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کا بے پایاں حصہ ہے اور یہ اسی احسان کا تقاضا ہے کہ جو مجھے اس سوانح پر کام کرنے پر اکساتا رہا۔

یہی ہے زندگی اپنی یہی ہے بندگی اپنی
کہ ان کا نام آیا اور گردن جھک گئی اپنی

میں ان ہستیوں کے قرضے تلے دبا ہوا ہوں اور اسی لیے میں آج اس قرض کی تھوڑی بہت ادائیگی سے بے پایاں مسرور و شادماں ہو رہا ہوں۔

غلط ہو جاتے ہیں سب رنج و غم ایسا بھی ہوتا ہے
کبھی اس بت کا اندازِ کرم ایسا بھی ہوتا ہے

دراصل میرا خاندان ان ہر دو خانوادوں سے عقیدت و محبت کے بہت ہی مضبوط اور پائیدار رشتوں میں منسلک تھا، ویسے میرے دادا منشی نور الٰہی[1] بڑے متشدد اہل حدیث تھے۔ وہ اہل حدیثوں کی لاہور شہر میں سب سے بڑی مسجد چینیانوالی واقع کوچہ چابکسواراں[2]

---

[1] منشی نور الٰہی مرحوم اللہ تعالےٰ ان کو مغفرت کرے میرے دادا تھے، انھوں نے میری پرورش کی تھی کیونکہ میرے والد جوانی میں ہی فوت ہو گئے۔ اس وقت میری عمر بھی کوئی دس بارہ برس ہوگی۔ ان کی تاریخ پیدائش تو مجھے یاد نہیں لیکن ان کی وفات مارچ ۱۹۴۲ء میں ہوئی میرے دادا انیسویں صدی کے آخری سالوں میں ڈسٹرکٹ ناظر ہوئے اور پھر ۱۹۰۱ء میں سول جج مقرر ہوئے، اسی وجہ سے وہ منشی کہلانے لگ گئے تھے۔

[2] کوچہ چابکسواراں ! یہ کوچہ شہر لاہور کی فصیل والے علاقہ کے بالکل وسط میں ہے یعنی ایک طرف رنگ محل کا چوک ہے، دوسری طرف سنہری مسجد، کشمیری بازار، ڈبی بازار کا علاقہ ہے۔ میرا خاندان قبیلے کے لحاظ سے ککے زئی پٹھان ہے لیکن پیشے کے لحاظ سے چابکسوار کہلاتے تھے۔ جسے پنجابی گھوڑے دلال کے نام سے موسوم کرتے ہیں چنانچہ اسی وجہ سے ہمارے محلہ کا نام بھی کوچہ چابکسواراں پڑ گیا تھا۔ کیونکہ جاگیرداری دور میں شہروں کی ساخت اور محلوں کی آبادکاری پیشوں پر ہوتی تھی۔ کیونکہ یہ پیشے ہی اس زمانے میں جاگیردار حاکموں کی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے اب ایک طرف ہمارا محلہ کوچہ چابکسوار جس میں بسنے والوں کا کام بادشاہوں، نوابوں، مہاراجوں، فوجوں، رسل و رسائل کے گھوڑے اور خچریں مہیا کرنا ہوتا تھا تو دوسری طرف ہمارے آس پاس محلہ تیر اندازاں، محلہ کمان گراں، کسیرا بازار بزاز ہٹہ وغیرہ وغیرہ تھے۔

کے ٹرسٹی تھے اور مرتے دم تک وہ اس عہدے پر فائز رہے۔ جب ان کی ۱۹۴۲ء میں وفات ہوئی تو ان کی جگہ مجھے ٹرسٹی چن لیا گیا لیکن بعد میں میری سیاست نے مجھے اس سے قدرے بے تعلق کر دیا۔ میرے دادا غزنوی خاندان کے بہت ہی معتقد تھے۔ اس زمانے میں اہل حدیثوں کے دو ہی مکاتیب تھے ایک مولانا ثناء اللہ امرتسری کا اور دوسرا غزنویوں کا۔

میری جب چشم ہوش وا ہوئی تو اس وقت اہل حدیثوں کے مشہور عالم مولانا عبدالواحد غزنوی رحمتہ اللہ علیہ مسجد چینیاں[۳] والی میں خطابت کے فرائض ادا کیا کرتے تھے۔ اسوقت ان کی عمر ستر برس سے تجاوز کر چکی تھی لیکن مجھے ان کی امامت میں نمازیں ادا کرنے کی سعادت حاصل رہی ہے۔ میں نے ان کے پیچھے فجر کی نمازیں ادا کی ہیں جو کہ خاصا مشکل کام تھا اور اس وقت میری عمر بھی کوئی پانچ یا چھ برس ہوگی۔ کیونکہ اہل حدیثوں کی نماز بہت ہی علی الصبح جب ابھی صبح کاذب بھی نہیں ہو چکتی تو ادا کی جاتی ہے اور اس وقت نیند سے بیدار ہونا خاصا دقت طلب ہوتا تھا۔ لیکن دادا مرحوم مجھے ساتھ لے جایا کرتے تھے اور سحر خیزی کی عادت اسی بچپن کی عادت کی مرہونِ منت ہے اور آج جب میں اپنی عمر کے اٹھاون سال گزار چکا ہوں تو سحر خیزی کی یہ عادت اب بھی اسی طرح قائم و دائم ہے

---

[۳] چینیاں والی مسجد : کوچہ چابکسواراں میں ایک بہت ہی تاریخی مسجد ہے جسے چینیاں والی مسجد کہتے ہیں۔ کیونکہ اس پر کاشی کا بہت شاندار کام کیا گیا تھا اور اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے اسے منقش کیا گیا تھا جس سے اس کا نام چینیاں والی مسجد پڑ گیا۔ تاریخ لاہور کے مصنف لطیف کے حوالے سے یہ مسجد ساڑھے تین سو سال قبل ۱۰۵۱ ہجری میں تعمیر ہوئی تھی۔ لیکن تحقیقات چشتی کے مصنف مولوی نور احمد اس مسجد کی تعمیر کا سال ۱۰۸۱ ہجری بتاتے ہیں۔

کہ عہدِ گزشتہ کو شریکِ غمِ امروز
خاکسترِ ماضی سے کچھ اٹھتا ہے دھواں بھی
فراق گورکھپوری

مولانا عبدالواحد نمازیں بہت ہی خشوع وخضوع سے ادا کیا کرتے تھے لیکن فجر کی نماز میں تو وہ باالتزام کافی طویل آیات کی تلاوت فرماتے اور بعض اوقات انسان کھڑے کھڑے تھکنے لگتا اور تلاوت میں شدید رقت طاری رہتی تھی صرف یہی نہیں بلکہ سجدوں میں بھی کافی دیر لگاتے اور مسلسل ان کے رونے اور گریہ وزاری کی آوازیں آتی رہتیں جس سے مقتدیوں پر بھی یہی کیفیت طاری ہو جاتی۔ چنانچہ میری رقیق القلبی بھی انہی ابتدائی ایام اور اسی تربیت کی یادگار ہیں۔ لیکن اب تو رونا بھی مشکل ہو گیا ہے

نہ تھی خرابہ دنیا میں اتنی وسعت بھی
کہ بیٹھ کر کسی گوشے میں رو لیا کریں

مولانا عبدالواحد غزنوی کے جمعہ اور عیدین کے خطبے مجھے اب بھی یاد ہیں وہ ہمیشہ اللہ کے ساتھ عزوجل کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ ان کی کھنک دار اور بارعب آواز کی گونج نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی میرے کانوں میں محفوظ ہے۔ ان کا نورانی چہرہ سفید شفاف رنگ، سفید دودھیا داڑھی۔ قدِ آدم عصا، سفید لباس، تنگ پائینچے کی شلوار اور ٹخنوں تک غزلوں کا سا کرتہ اور جمعہ کے خطبہ کے دوران عربی عبا زیب تن کرنا یہ مجھے اب تک یاد ہیں۔ مولانا سے میرے خاندان کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جب مولانا بیمار پڑے اور ان کی بیماری شدت اختیار کر گئی تو میرے دادا مولانا کو اپنے گھر لے آئے اور خود ان کی دیکھ بھال کرتے رہے

ایک طرف میرے خاندان کا غزنوی[۱] خاندان سے عقیدت واحترام کا یہ عالم تھا تو

---

[۱] غزنوی خاندان۔ متحدہ پنجاب میں اہل حدیث مسلک کے سلسلے میں غزنوی خاندان کو بہت بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس برصغیر میں اس خاندان کا سلسلہ مولانا عبداللہ غزنوی سے

(باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

دوسری طرف میرے خاندان کے مولانا احمد علیؒ کے خاندان سے بھی بہت گہرے مراسم تھے یہ مراسم ۱۹۱۷ء کے قرب وجوار میں شروع ہوئے جب مولانا احمد علیؒ لاہور میں ٹھہرنے پر مجبور ہوئے ان تعلقات کی نوعیت ابتداء میں عقیدت سے زیادہ خاندانی تعلقات پر مبنی تھی، کیونکہ مولانا کے سید محمد احمدؒ جو خضری محلہ کے قریب کی ایک مسجد میں امامت کیا کرتے تھے ان سے ہمارے خاندان کے بہت قریبی مراسم تھے چنانچہ جب مولانا نے لاہور میں رہائش اختیار کی تو باقاعدہ آمدورفت کا سلسلہ شروع ہوگیا اور مجھے اپنے بچپن میں مولانا کے رہائشی مکان واقع لائن سبحان خاں میں کھیلنا اب تک یاد ہے اور مولانا

شروع ہوتا ہے۔ مولانا عبداللہ غزنی کے رہنے والے تھے لیکن چونکہ اپنے وطن میں وہ اعلائے کلمۃ الحق کے سلسلے میں معتوب ہو گئے کیونکہ وہ شرک اور بدعت کے خلاف آواز بلند کرتے تھے جس سے خود افغانستان کے علماء اور مشائخ نے ان کا افغانستان میں جینا محال کر دیا۔ بالآخر شاہ افغانستان نے انھیں افغانستان سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ افغانستان کو خیرباد کہنے کے بعد وہ امرتسر چلے آئے اور اسی شہر کو انھوں نے اپنا مستقل مستقر قرار دے لیا۔ لیکن مولانا عبداللہ غزنوی چونکہ سنت کے سخت پابند تھے اس لیے حدیث میں دسترس کامل کا جذبہ ان پر ہمیشہ طاری رہا اور یہی جذبہ انھیں دہلی میں شیخ الحدیث میاں نذیر حسین کے ہاں لے گیا۔ مسجد میو، امامت کے فرائض ادا کرتے رہے۔

ویسے مولانا عبداللہ غزنویؒ سلوک میں مولانا حبیب اللہ قندھاریؒ کے خلیفہ تھے اور مولانا حبیب اللہ قندھاری کا تعلقِ روحانی وتلمذ سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ سے تھا۔

مولانا عبداللہ غزنوی کی اولادوں میں مولانا عبدالجبار غزنویؒ اور مولانا عبدالواحد غزنوی تھے۔ مولانا عبدالجبار غزنوی اپنے والد کی وفات کے بعد امرتسر میں ان کی جگہ رشد وہدایت کا سلسلہ جاری کیے رہے اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالواحد غزنوی لاہور میں چینیانوالی

(اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

کی زوجہ محترمہ بہت شفقت فرماتی تھیں اور وہ بھی اکثر ہمارے ہاں آیا کرتی تھیں اور بعض اوقات ہمارے ہاں دو دو تین تین دن قیام فرماتی تھیں - اسی طرح میری دادی مرحومہ بھی ان کے ہاں آیا جایا کرتی تھیں - غمی اور خوشی میں مولانا اور ان کی اہلیہ بالالتزام ہمارے ہاں آیا کرتے تھے - بعد میں جب مولانا کے زہد و تقویٰ اور ذکر و فکر کا چرچا ہوا تو یہ تعلقات اور

۵؎ مولانا ثناء اللہ! مولانا ابوالوفا ثناء اللہ اہل حدیث کے ایک مکتب فکر کے مسلمہ رہنما تھے مولانا کا تعلق بھی امرتسر سے ہی تھا اور وہ امرتسر میں ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم کے بعد انھوں نے وزیر آباد کے نابینا عالم حافظ عبدالمنان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا - اس کے بعد دہلی میں مولانا نذیر حسین سے درس لیتے رہے بعد میں دیوبند میں بھی تعلیم کے لیے قیام کیا - جب مولانا تعلیم سے فارغ ہوئے تو اس وقت عیسائی مشنریوں کا چاروں طرف چرچا تھا اور یہ مشنری باوردی سامراج کی پشت پناہی میں برصغیر کے تمام مذاہب سے نبرد آزما ہو رہے تھے - چنانچہ مولانا ثناء اللہ نے تمام مذاہب کی تعلیمات پر عبور حاصل کیا اور مناظرے کے میدان میں اترے انھوں نے مادر بو سے لے کر سناتن دھرمیوں اور برہما سماجیوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا اور سب سے زیادہ مناظرے انھوں نے احمدیوں سے کیے اور ان کو چاروں شانے چت کیا - مولانا ثناء اللہ صاحب تصنیف بھی تھے انھوں نے ان گنت رسائل تصنیف کیے اور معرکۃ الآراء تفسیر جو تفسیر ثنائی کے نام سے موسوم ہے لکھی - مولانا کی وفات ۱۹۴۸ء میں پاکستان میں ۸۰ سال کی عمر میں ہوئی -

۶؎ مولانا عبدالواحد غزنویؒ! بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں لاہور منتقل ہوئے اور مسجد چینیا نوالی میں امامت و خطابت کے فرائض ادا کرنے لگے وہ مرتے دم تک یہ فرائض ادا کرتے رہے اور وفات کے بعد ان کے بھتیجے مولانا عبدالجبار غزنوی کے بڑے صاحبزادے مولانا داؤد غزنوی ان کی جگہ امام و خطیب مقرر ہوئے اور وہ بھی مرتے دم تک یہ فرائض سرانجام دیتے رہے -

بھی زیادہ پائیدار اور راسخ ہو گئے اور ان میں عقیدت کا جذبہ بھی شامل ہو گیا۔ چنانچہ جب مولانا نے تعلیم یافتہ سرکاری ملازمین کے لیے شام کو درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا تو ابتدائی شرکاء میں میرے والد مرحوم بھی تھے۔

عقیدتوں کا یہ سلسلہ جو قریب قریب ساٹھ برس پہلے شروع ہوا تھا وہ میری طرف سے اب بھی قائم ہے اور یہ خانوادہ بھی نگاہِ کرم کرتا ہے۔ مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے صاحبزادے مولانا حافظ حبیب اللہ مرحوم سے تو میرے بہت ہی گہرے دوستانہ مراسم تھے اور اب مولانا عبید اللہ انور سے بھی میرے اور میری بیوی بچوں کو گہری عقیدت کا سلسلہ جاری ہے اور تعلقات کی یہ استواری جو دادا اور دادی مرحومہ کے حوالے سے شروع ہوئی تھی وہ آج تیسری اور چوتھی پشت میں بھی جاری و ساری ہیں۔

سب سے منہ موڑ کے راضی ہیں تری یاد سے ہم
اس میں شانِ فراغت بھی ہے راحت کے سوا

حسرت موہانی

میرے پڑھنے والے بجا طور پر یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ کیا میں نے یہ تمام دفتر صرف عقیدت کا بوجھ اتارنے کے لیے رقم کیا ہے؟ یہ سوال بعض حلقوں میں میرے سیاسی اعتقادات کی بنا پر اور بھی شدت اختیار کر جاتا ہے کیونکہ ہمارے ہاں کا ۹۹ فیصد پڑھا لکھا طبقہ اس میں خواہ مغربی تعلیم سے بہرہ ور لوگ ہوں یا دینی مدارس سے وابستہ اصحاب ہوں یہ ہر دو طبقے اور گروہ اس امر پر یقین کیے ہوتے ہیں کہ کمیونسٹ افکار کے حامل لوگ کو مذہبی اعتقادات، مذہبی تحریکوں اور دینی شخصیتوں پر اظہار رائے کا کوئی حق نہیں پھر میں نے کیونکر اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور مولانا احمد علی کی ذات اور شخصیت کو سمجھنے کے لیے برصغیر کے پورے مسلمانوں کی فکری تحریک کو کیوں کھنگال ڈالا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ میں اور میری قبیل کے لوگ جو سامراج دشمن تحریک سے منسلک

ہوئے وہ اس برصغیر کے علمارحق کی شعلہ بیانیوں اور ان کی چلائی ہوئی تحریکوں سے ہی متاثر ہوئے تھے اور سچ یہ ہے کہ اس برصغیر کی آزادی کی تحریک کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے علماء کی ان تحریکوں کو جاننا، سمجھنا اور ان کو ایک وسیع کینوس میں رکھ کر پرکھنا ازبس لازمی ولابدی ہو جاتا ہے اور یہ جو بظاہر دینی تحریکیں ہوتی ہیں یہ بھی ہماری آسوں، پیاسوں اور عوام کی خواہشوں اور تمناؤں کا اظہار کرتی ہیں اور انہی علمائنے جو سیاسی کارنامے انجام دیے وہ اگر ایک طرف دینی تھے تو دوسری طرف سیاسی بھی تھے اس لیے ان شخصیتوں کو صرف مسجد و منبر تک محدود کرنا اور ان کی زندگیوں کو صرف ذکر و فکر کے دائرے میں رکھ کر دیکھنا غلط ہے اس لیے یہ شخصیتیں ہمارے ایک دور کا مظہر ہیں۔

آپ کا سودائی ہے، کافر ہو یا دیندار ہو
بات اتنی ہے، اب اسکا جسقدر طومار ہو

دوسری اہم حقیقت یہ بھی ہے کہ علماء کے حوالے سے ہی میں نے سامراج دشمن سیاست کے میدان کارزار میں قدم رکھا۔ انہی کے حوالے سے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر و تقریر کا مداح بنا اور انہی علماء کا اثر تھا جس نے مجھے بالآخر مولانا ابوالکلام کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر اکسایا۔ غرضیکہ کمیونسٹ پارٹی سے منسلک ہونے تک جس کوچے سے بھی گزر ہوا وہیں مولانا داؤد غزنوی اور مولانا احمد علی کی گہری چھاپ نے میرا پیچھا کیا اور سچ یہ ہے کہ آج بھی یہ چھاپ گہری بھی ہے اور زندہ و تابندہ بھی۔

نہ بت خانے کو جاتے ہیں نہ کعبے میں بھٹکتے ہیں
جہاں تم پاؤں رکھتے ہو وہاں ہم سر پٹکتے ہیں

اس لیے یہ واقعہ ہے کہ جب میں کمیونسٹ پارٹی کا کل وقتی کارکن بنا تو اس وقت میری سیاسی تربیت میں مذہب سے شیفتگی، سامراج دشمنی، انگریز سے نفرت اور تحریر و تقریر سے دلبستگی یہ سب اپنا اپنا حصہ ڈال چکے تھے اور یہی وہ دور تھا جب

مجھے علمائے ہند کے افکار کو جاننے اور پرکھنے کا موقع ملا تھا اعلائے کلمۃ الحق کے لیے ان علماء کی قربانیوں نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا چنانچہ جب مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی خود نوشت سوانح تذکرہ میں امام محمد بن حنبلؒ کے متعلق لکھا تھا تو اس نے اپنی خون کی حرارت تیز کر دی تھی اور وہ سطور مدتوں ازبر رہیں۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں۔

جب معتصم باللہ نے جلادوں کو ضرب تازیانہ کے لیے حکم دیا تو وہ علمائے اہل سنت بھی دربار میں موجود تھے جو شدت محن و مصائب کی تاب نہ لا سکے اور اقرار کر کے چھوٹ گئے۔ ان میں سے بعض نے کہا "من صنع من اصحابك فی هذا الامر ما تصنع" خود تمھارے ساتھیوں میں سے کس نے ایسی ہٹ کی جیسی کہ تم کر رہے ہو؟ امام احمد نے کہا۔ یہ تو کوئی دلیل نہ ہوئی اعطونی شیأ من کتاب اللہ او سنۃ رسولہ حتیٰ اقول بہ"۔ عین حالتِ صوم میں کہ صرف پانی کے چند گھونٹ پی کر روزہ رکھ لیا تھا تو تازہ دم جلادوں نے پوری قوت سے کوڑے مارے یہاں تک کہ تمام پیٹھ زخموں سے چور ہوگئی اور تمام جسم خون سے رنگین ہوگیا۔ خود کہتے ہیں کہ جب ہوش آیا تو چند آدمی پانی لائے اور کہا کہ پی لو مگر میں نے انکار کیا کہ روزہ نہیں توڑ سکتا۔ وہاں سے مجھ کو اسحاق بن ابراہیم کے مکان میں لے گئے ظہر کی نماز کا وقت ہوگیا تھا۔ ابن سماعہ نے امامت کی اور میں نے نماز پڑھی نماز کے بعد ابن سماعہ نے کہا کہ تم نے نماز پڑھی حالانکہ تمہارے کپڑوں میں خون بہہ رہا ہے یعنی دم جاری و کثیر کے بعد طہارت کہاں رہی؟ میں نے جواب دیا۔ "قد صلی عمر وجرحہ یثعب دما"۔ ہاں مگر میں نے وہی کیا جو حضرت عمرؓ نے کیا تھا صبح کی نماز پڑھانے جا رہے تھے کہ قاتل نے زخمی کیا مگر اسی حالت میں انھوں نے نماز پوری کی۔

ابن سماعہ کے جواب میں حضرت امام نے حضرت عمرؓ کی جو نظیر پیش کی تو یہ ان کی تشفی کے لیے بس کرتی تھی مگر میں کہتا ہوں کہ جو خون اس وقت امام احمد بن حنبل کے زخموں سے بہہ رہا تھا اگر وہ خون ناپاک تھا اور اس کے ساتھ نماز نہیں ہو سکتی تھی تو پھر دنیا میں اور کونسی ایسی چیز ہے جو انسان کو پاک کر سکتی ہے اور کون سا پانی ہے جو طاہر و مطہر ہو سکتا اگر یہ ناپاک ہے تو دنیا کی تمام پاکیاں اس ناپاکی پر قربان اور دنیا کی ساری طہارتیں اس

برنچھاور۔ یہ کیا بات ہے کہ پاک سے پاک اور مقدس سے مقدس انسان کی میت کے لیے بھی غسل ضروری ٹھہراکہ غسلوہ بماء وسدر وکفنوہ فی ثوبین [1] مگر شہیدان کے لیے یہ بات ہوئی کہ ان کی پاکی شرمندگیٔ آب غسل نہیں لم یصل علیھم ولم یغسلھم [2] بلکہ ان کے خون میں رنگے ہوتے کپڑوں کو بھی ان سے الگ نہ کیجیے یبعثون یوم القیامۃ بثیابھم ودمائھم اور اسی لباسِ گلگوں وخلعتِ رنگین میں وہاں جانے دیجیے جہاں ان کا انتظار کیا جا رہا ہے اور جہاں خونِ عشق کے سرخ دھبوں سے بڑھ کر شاید اور کوئی نقش ونگار مقبول ومحبوب نہیں۔ عند ربھم یرزقون فرحین بما اتاھم اللہ۔

خون شہیداں را ز آبِ اولیٰ ترست
ایں گناہ از صد ثواب اولیٰ ترست

اللہ! اللہ! یہاں طہارت جسم ولباس کا کیا سوال ہے؟ امام احمد بن حنبل نے اپنی تمام عمر میں اگر کوئی پاک سے پاک اور سچی سے سچی نماز پڑھی تھی تو یقیناً وہ وہی ظہر کی نماز تھی ان کی تمام عمر کی وہ نمازیں ایک طرف جو دجلہ کے پانی سے پاک کی گئی تھیں اور وہ چند گھڑیوں کی عبادت ایک طرف جو راہِ ثباتِ حق میں بہنے والے خون نے مقدس ومطہر کر دیا تھا۔

سبحان اللہ جس کے حق میں چار چار بوجھل بیڑیاں پاؤں میں پہن لی تھیں جس کی خاطر سارا جسم زخموں سے چور اور خون سے رنگین ہو رہا تھا اسی کے آگے جبین نیاز جھکی ہوئی، اسی کے ذکر میں قلب ولسان لذت یاب تسبیح وتحمید! اسی کے جلوۂ جمال میں چشم شوق وقفِ نظارہ ودید! اور اسی کی یاد میں روح مضطر محو سرشار عشق وخود فراموشی!

یوں عبادت ہو تو زاہد ہیں عبادت کے مزے

اور یہ جو امام موصوف نے افطار سے انکار کر دیا اور نماز کا وقت آیا تو یہ اول

---

[1] اخرجھا البخاری عن ابن عباس رضی اللہ عنہ

[2] بخاری وترمذی میں شہداء کی نسبت غالباً حضرت جابرؓ کی روایت ہے یہ اس کے الفاظ ہیں (او کما قال)

وقت و با جماعت ادا کرنے سے باز نہ آئے۔ حالانکہ جسم زخموں سے چور اور پیٹھ کا خون پاؤں تک بہہ رہا تھا تو اب بتلاؤ کہ وہ تمہارا رخصت والا معاملہ کیا ہوا؟ کیا ایسی حالت میں رخصت نہ تھی کہ روزہ کھول دیتے اور نماز کے لیے اس قدر توقف کر جاتے کہ زخموں پر مرہم تو لگا دیا جاتا؟ اور اگر تم اس عالم ہو کہ امن و فراغت اور طاقت و فرصت کی حالت میں بھی مصائب و خطرات کے بچنے کے لیے دعوتِ الی الحق کو ترک و ملتوی اور عزم و ثبات حق سے انحراف کیا جاسکتا ہے اور تمہارے نزدیک مصلحت و رخصت اسی میں ہے کہ بطلان و ضلالت کے آگے سر جھکا دیا جائے۔ تو خدا را بتلاؤ کہ یہ عالم کون سا تھا؟ کبھی اس عالم کی بھی کوئی خبر تم تک پہنچی ہے۔

یہ درست ہے کہ آئمہ اور علماء کی ان قربانیوں، ان کی سرفروشیوں، اپنے اعتقادات کے لیے جان ہار دینے کے ان جذبوں نے بے پناہ طور پر متاثر کیا گو مجھے اس وقت ان قربانیوں، ان سرفروشیوں اور ان اعتقادات کو وسیع پس منظر میں اور سیاسی و سماجی و معاشی عوامل کے بڑے کینوس میں رکھ کر سمجھنے اور جاننے کا ملکہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ لیکن بہر حال ان قربانیوں اور سرفروشیوں نے دل ضرور موہ لیا تھا اور اپنے اندر بھی کچھ کر گزرنے کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ اسی لیے مجھے مجلس احرار عزیز ٹھہری تھی جمعیۃ العلمائے ہند محترم ٹھہری تھی اور ان کے بہادر اور جیالے رہنما ایک عرصہ تک میرے محبوب ٹھہرے تھے۔ لیکن جب دوسری جنگ عظیم کے بادل امڈنے شروع ہوئے اور جب ہٹلر اور مسولینی کی فسطائیت کے خلاف ملک ملک اور دیس دیس میں مورچے ترتیب دیے جارہے تھے مورچے ترتیب دیے جارہے تھے تو مجھے کمیونسٹوں کی سرفروشی نے متاثر کرنا شروع کیا اور جب ہسپانیہ کی جمہوری حکومت کے خلاف ہسپانیہ کے بڑے بڑے زمین داروں اور فوجی افسروں نے جنرل فرانکو کی قیادت میں بغاوت کا پرچم کھولا تو یہ پہلا عالمی مورچہ تھا جس میں ایک طرف دنیا بھر کی ترقی پسند طاقتیں ہسپانیہ کی جمہوری حکومت کی امداد و تائید کے لیے کمر بستہ نظر آرہی تھیں تو دوسری طرف

دنیا بھر کے فسطائی اور سامراجی فرانکو کی امداد کے لیے میدان میں اتر رہے تھے۔

اس معرکے نے میرے اندر بین الاقوامی تحریکوں کو سمجھنے کا شعور پیدا کیا اور یہی وہ زمانہ تھا جب میں فضل الٰہی قربان، فیروز الدین منصور، کرم سنگھ مان سے ملا اور ان کی صحبتوں نے مجھے کمیونزم کو سمجھنے اور پڑھنے کی طرف مائل کیا۔

بین الاقوامی تحریکوں سے متاثر ہونے کا جذبہ بھی مجھے انہی علماء اور ان کے قبیل کی سیاست سے ہی ملا تھا اور یہ جذبہ بدرجہ اتم سرایت کر گیا تھا کہ برطانوی سامراج کی شکست ہی مشرق وسطیٰ اور دنیائے اسلام کی نجات ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب بھی برطانیہ نے مشرق وسطیٰ اور دنیائے اسلام کے خلاف کوئی سازش کی تو یہاں کے علماء نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ غالباً ۱۹۳۴ء میں برطانیہ نے حجاز میں ریلوں کا جال بچھانے اور اسے شام وغیرہ سے ملانے کے لیے سلطان ابن سعود سے گفتگو شروع کی تو اس کے خلاف مجلس احرار اور جمعیۃ العلمائے ہند نے آواز بلند کی اور باقاعدہ مولانا مظہر علی کی قیادت میں سلطان ابن سعود کی خدمت میں ایک وفد روانہ کیا گیا۔ چنانچہ یہ منصوبہ ترک کر دیا گیا۔ چنانچہ اس لحاظ سے بین الاقوامیت ہماری سامراج دشمن تحریک کا ایک اہم جزو رہی ہے۔ یہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایت پر مولانا عبیداللہ سندھی کا افغانستان جانا۔ وہاں راجہ مہندر پرتاب کے ساتھ مل کر اس کی سربراہی میں عارضی عبوری حکومت کا قیام، ترکی کی حکومت سے رابطہ، سوویت روس کی بولشویک سے تعلق، یہ تمام بین الاقوامی رابطے اور پھر تحریک خلافت یہ تمام اقدام ایک بین الاقوامی سامراج دشمن تحریک کا سلسلہ نہیں تھے تو کیا تھے؟

اس لیے جب ہسپانیہ میں ۱۹۳۶ء میں فاشزم کے خلاف مورچہ باندھا جانے لگا تو اس نے ایک عالم کو متاثر کیا اور اس دور کے تاثر کو میں نے اپنے ایک خط میں جو میں نے ۱۹۷۱ء میں کوٹ لکھپت جیل سے لکھا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یحییٰ خاں کے مارشل لاء نے مجھے ایک سال کی قید، پچاس ہزار روپے جرمانہ اور پندرہ کوڑوں کی سزا دی

تھی میں اس دور میں مجرم صرف اس لیے ٹھہرا تھا کہ میں نے بنگلہ دیش اور اس وقت کے مشرقی پاکستان میں ہماری فوج کی طرف سے روا رکھے جانے والے مظالم پر احتجاج کیا تھا آواز بلند کی تھی۔

جسے کبھی سرِ منبر نہ کہہ سکا واعظ
وہ بات اہلِ جنوں زیرِ دار کہتے ہیں

یہ جیل سے رقم شدہ مکتوب بعد میں میری کتاب "دار و رسن" میں شائع ہو گیا، اس مکتوب میں چونکہ آج سے قریب قریب ۴۰ برس پہلے کی کیفیات کا تذکرہ ہے اور مجھ پر ان کیفیتوں کے کیا اثرات مرتب ہوتے اس لیے اس مکتوب کے ایک حصے کا اقتباس میں یہاں نقل کر رہا ہوں۔

"ہسپانیہ ہماری نسل کا پہلا مظہر تھا۔ یہ اس دور کا ویت نام تھا۔ اس نے دنیا بھر کے جمہوریت پسندوں کو للکارا تھا۔ اس نے آواز دی تھی کہ یہ پہلا امتحان ہے اگر یہاں فاشزم کو شکست ہو گئی تو یہ جہان رنگ و بو دوسری جنگ سے محفوظ رہے گا۔ اس دیس نے، یہاں کی جمہوری حکومت نے پہلی دفعہ یہ تجربہ کیا کہ فاشزم کے خلاف لڑائی کسی ایک ملک کے عوام کی لڑائی نہیں یہ ہر دیس کی ہر دیس کے بسنے والوں کی لڑائی ہے یہ ہر جمہوریت پسند کی لڑائی ہے جو بھی معاشرتی عدل پر یقین رکھتا ہے یہ اس کی لڑائی ہے چنانچہ اس آواز کی گونج اس للکار کا شور ایک عالم نے سنا دیس دیس کے لوگ ہسپانیہ میں پہنچنے لگے کہ جمہوریت کی اس پہلی لڑائی میں حصہ لیا جا سکے۔ یہ عجیب زمانہ تھا۔ اس نے ہماری نسل کو بہت دنوں تک گرمایا اور میں جو ادب کی راہ میں ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوا تھا، انقلاب کا پجاری بنا تھا۔ تبدیلی کا خواہاں ہوا تھا اور آزادی و جمہوریت کے نغموں سے متاثر ہوا تھا۔ جب دیس دیس کے شاعروں اور ادیبوں کو ہسپانیہ جاتے دیکھا، ہسپانیہ کے شہروں اور دیہات کی حفاظت میں سینہ سپر ہوتے

دیکھا۔پھر ان ادیبوں کو جن کی تخلیقات نے میری فکر کو جلا دی تھی کو مرتے اور زخمی ہوتے دیکھا تو یہ عجیب و غریب تجربہ تھا جس نے مجھے دنوں اور راتوں کو پریشان رکھا۔ان شاعروں نے ان ادیبوں نے خندقوں میں بیٹھ کر گیت لکھے، شعر کہے، اپنی محبوباؤں کو یاد کیا۔اس وقت بھی وہ مسکراتے رہے اور لڑتے رہے تاکہ وہ زندگی اور اس کے حسن کو محفوظ رکھ سکیں تاکہ فاشزم کی یلغار کو روک سکیں اور پھر اسی خانہ جنگی میں مصروف، زندگی اور موت کی کش مکش میں الجھے ہوتے ہسپانیہ کے ہی ایک شہر میں فاشسٹ دشمن ادیبوں کی بین الاقوامی کانگریس منعقد ہوئی جس میں دیس دیس سے ادیب آئے اور انھوں نے ہسپانیہ کی جمہوری حکومت کی حمایت اور اپنی حکومتوں کی لشکر کشیوں کی مذمت کی۔اسی موقع پر رومن رولاں[1] نے اپنے پیغام میں کہا تھا کہ جب تہذیب عالم فاشسٹوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو رہی ہے اس وقت ادیب کا کام تہذیب اور حسن کی حفاظت کے لیے جد وجہد کرنا ہے اور میں یہاں جمع ہونے والے ادیبوں کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔میں ان کے ساتھ ہوں۔میں فاشسٹوں کی زندگی کے خلاف سینہ سپر ہوں اور پھر اسی موقعہ پر جب بین الاقوامی بریگیڈ قائم ہوا تو ہسپانیہ کے جواں سال شاعر البرٹی نے کہا تھا۔

تم دور دراز سے آتے ہو
لیکن تمھیں ان فاصلوں کی کیا فکر
تمھارا خون ان فاصلوں سے ماوراء ہے
یہ خون سرحدوں سے بے نیاز ہے لیکن پھر بھی وہ گائے جا رہا ہے۔
تم کسی دن، کسی رات، کسی لمحے
موت سے ہم آغوش ہو جاؤ گے
لیکن کون جانتا ہے کہ یہ موت تمھیں کہاں آئے گی۔

---

[1] فرانس کا عالمی شہرت رکھنے والا ادیب۔

کس شہر میں کس قصبے میں، کس گاؤں میں۔
کس کھیت میں اور کس سڑک کے کنارے
یہ بھی کون جانے کہ یہ کونسا ملک ہوگا
چھوٹا یا بڑا، وسیع یا مختصر
یہ ملک کسی نقشہ عالم پر ابھرا بھی ہوگا یا نہیں
انسان ایک ہی باوا کی، آدم کی اولاد ہیں
وہ ایک ہی جڑ سے پھوٹا ہے، وہ ایک جیسے خواب دیکھتا ہے۔
تم بے نام ہو، بے نشان ہو، تمھاری زبان کچھ اور ہے۔
لیکن حقیقت صرف اتنی ہے کہ تم یہاں آئے ہو۔
ایک ایسے ملک میں جس کو تم نہیں جانتے۔
تم اس دیوار کے رنگ کو بھی نہیں جانتے۔
جس مکان کی حفاظت کے لیے تم سینہ سپر ہو۔
اب جس مکان میں تم دفن ہو۔
جس مٹی میں تم پنہاں ہو
تم اس مٹی سے محبت کرتے تھے
یہ دھرتی، یہ زمین تمہیں کتنی پیاری تھی۔

جرمنی کے ایک شاعر نے ۔ جرمن رجمنٹ جو تھالمین[۱] رجمنٹ کے نام سے ہسپانوی جمہوریہ کی حفاظت میں سینہ سپر تھی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

ہم اپنی خندقوں میں جب بندوق بدست دشمن کے منتظر ہوتے ہیں

---

[۱] جرمن کمیونسٹ پارٹی کا سیکرٹری جنرل جو روپوش رہ کر ہٹلر کے خلاف سیاسی مزاحمت منظم کر رہا تھا اور بالآخر ہٹلر نے اس کو ۱۹۴۴ء میں مروا دیا تھا۔

تو اس لمحے ہمیں ہسپانیہ کے آسمانوں کے چمکتے ستارے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔
اسی خندق میں پھر صبح طلوع ہوتی ہے۔
یہ صبح ایک نئی جنگ کا بلاوا ہوتی ہے۔
ایک نئے معرکہ حق و باطل کا۔
ہمارا وطن دور ہے، بہت دور ہے۔
اس کے باوجود ہم چاق چوبند اور تیار ہیں۔
لڑائی کے لیے عظیم جہاد کے لیے۔
تمہاری حفاظت کے لیے
فتح ہماری ہوگی، تمہاری ہوگی۔
ہم سب آزاد ہوں گے۔
امریکی شاعر (LANGSTON HUGHES) نے امریکی شہید کے منہ سے کہا تھا۔
میں یہاں آیا ہوں
ایک بحر بیکراں عبور کر کے
نیم براعظم سے گزر کر
میں نے کئی سرحدیں پار کی ہیں
کئی پہاڑوں کو پھلانگا ہوں
ایسے پہاڑوں کو جو آسمانوں سے محوِ گفتگو تھے۔
میں ایک ایسی حکومت سے آیا ہو
جس نے مجھے یہاں آنے سے روکا تھا۔
میں پھر بھی یہاں پہنچ گیا
ایک ایسے خطے میں جس کی سرحدیں درخشاں مستقبل کو چھوتی ہیں۔
میں نے اپنی عمر، اس کا تجربہ، اپنی ذہانت سب داؤ پر لگا دی ہے۔

یہ کوئی زیادہ نہیں، اس لیے کہ میں جواں ہوں۔
مجھے ماضی کا صیغہ استعمال کرنا چاہیے تھا۔
میں جواں تھا، کیونکہ اب میں مر چکا ہوں۔
میں نے زندگی تو قربان کردی جو میں قربان کرنا چاہتا تھا
یہ مجھے بہرحال قربان کرنی تھی۔
تاکہ دوسرے زندہ رہیں
جب گولیوں نے میرے دل کی دھڑکنوں کو روک دیا۔
جب میں خون میں لت پت تھا۔
تو یہ احساس ختم ہو چکا تھا کہ یہ لہُو ہے
یا یہ میری موت ہے
اس وقت میری موت میری زندگی بن گئی
یہ سب ایک ہیں
ہماری خوابیں
میری موت
تمہاری زندگی
ہمارا خون
ایک شعلہ
یہ سب ایک ہیں

ہسپانیہ کے شاعر ہوں یا باہر کی دنیا کے ان سب نے پانچویں رجمنٹ کو نہایت ادب سے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ یہی وہ رجمنٹ تھی جو کمیونسٹ انٹرنیشنل کی اپیل پر دیس دیس کے عوام نے منظم کی تھی اور جس کی بہادری، جرأت اور جان نثاری کی داستانیں زبانِ زدِ عام ہوتی تھیں چنانچہ ہسپانوی شاعر (RAFAEL ALBERTI) نے اسی رجمنٹ

کے بارے میں لکھا تھا۔
کل میں اپنے گھر کو خیر باد کہہ دوں گا۔
اپنے وطن اور اپنے لوگوں کو خدا حافظ کہہ دوں گا۔
خدا تمہارا حافظ و ناصر ہو
تم کہاں جا رہے ہو اتنا تو بتاؤ۔
میں پانچویں رجمنٹ میں جا رہا ہوں
اُدھر! پہاڑوں کی دوسری طرف
کھیتوں سے دُور
میں فتح و نصرت کے گیت گاتا
پانچویں رجمنٹ میں جا رہا ہوں۔
یہی میری رجمنٹ ہے یہی میرا مستقبل ہے

اور پھر جب فسطائی درندے آگے بڑھنے لگے اور جمہوری فوجیں پسپا ہونے لگیں تو اسی پانچویں رجمنٹ میں شریک ایک ہٹلری جرمنی کے شاعر نے کہا تھا۔

میڈرڈ تمہارے دروازوں پر
تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہارے مکانوں کی دہلیزوں تک
آن پہنچی ہے تاریکی اندھیرا لیے تہہ در تہہ
یہ ہولناک درندے منہ پھاڑے تم پر جھپٹنے کو ہیں۔
میڈرڈ کے لوگو! ہتھیار اٹھاؤ
خاموش اور پر سکون دور قصہ پارینہ بن گیا۔
چاروں طرف ہتھیاروں کی جھنکار سنائی دے رہی ہے۔
آسمانوں میں گولیوں کی گونج سنائی دے رہی ہے۔
توپوں کے دھماکے شہر کے در و دیوار ہلا رہے ہیں۔

زمین سے گرد و غبار کے سیاہ مرغولے اٹھ کر پوری فضا کو محیط کر رہے ہیں۔
فاشسٹوں کے ہوائی جہاز آسمانوں کو ڈھانپے ہوتے ہیں۔
مرد و زن، جوان، رعنا اور پیر مرد سبھی
ان بموں کی زد میں ہیں۔
میڈرڈ! میڈرڈ! حسین و جمیل میڈرڈ
بہادر جوانمرد میڈرڈ
مہیب سیاہی بڑھے آ رہی ہے
اب بھی وقت ہے
اے میڈرڈ کے باسیو، ہتھیار اٹھاؤ
کرائے کے فوجی نازیوں کے کاسہ لیس بڑھ رہے ہیں، یہ جانے نہ پائیں
یہ درندے تمہارے خون کے پیاسے ہیں
تمہارے بچوں کے منہ سے نوالے چھیننے والے ہیں۔
یہ تمہاری زندگیوں، تمہاری محنت کے دشمن ہیں۔
جلدی کرو، جلدی کرو، جلدی کرو، ہتھیار اٹھاؤ
یہ بندوق، یہ رائفل یہ توپ
یہ سب تمہارے ہیں ان کو ہاتھ میں لو
میڈرڈ کے باسیو ہتھیار اٹھاؤ

اور میں تمہیں آج سے تیس پینتیس برس بعد اور کتنے گیت سناؤں، کتنی تخلیقات کا تمہیں حوالہ دوں جنھوں نے تمہارے باوا کو، تم سے پہلی نسل کو متاثر کیا۔ ان کا خون گرمایا۔ آج میں جیل کے ہسپتال میں بیٹھا جب اس دور کو یاد کرتا ہوں تو پھر وہی جوانی کا جنون اور ولولہ خون میں حدت پیدا کر دیتا ہے لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ جس تجربے اور شعور کا میں ذکر کر رہا ہوں جو یا دیں میں تمہیں منتقل کر رہا ہوں اس تجربے کی شدت سے ہماری نسل کی ایک بہت ہی حقیر

سی اقلیت متاثر ہوئی اور میرا شعور اسی اقلیت کے شعور کا حصہ تھا لیکن یہ اقلیت اور اس کا شعور ایک اجتماعی خواہش، تمنا، اور عوام کی امنگوں کا مظہر تھی "

بہرحال اس عظیم مستقبل کے حصول کی خواہش نے میرے اندر نئے جذبوں کو جنم دیا، نئے ولولوں کو پروان چڑھایا، نئے خوابوں نے مجھے مسحور کر لیا اور کل جس طرح آئمہ اور علمائے حق کی قربانیوں نے مجھے متاثر کیا تھا آج کے سمے کمیونسٹوں کی سرفروشی نے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ ان کا فلسفہ، ان کا آدرش دنیا بھر کے محنت کشوں کے لیے ان کا جذبۂ الفت اس جہان رنگ و بو کے مجبوروں، مقہوروں اور مظلوموں کے لیے جان ہار دینے کا جذبہ، اس پر ان کی قربانیاں، ان کی سرفروشیاں خود اس برصغیر میں برطانوی سامراج کے کمیونسٹوں پر مظالم ان سب نے مجھے کمیونسٹ پارٹی کا گرویدہ بنا دیا اور پھر کمیونسٹوں کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔

زباں پر جب کسی کے درد کا فسانہ آتا ہے
ہمیں رہ رہ کے یاد اپنا دل دیوانہ آتا ہے

چنانچہ جب میں کمیونسٹ پارٹی کا رکن بنا تو اس وقت اس برصغیر میں کمیونسٹ پارٹی خلاف قانون تھی اور یہ پارٹی خفیہ طور پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے اس زمانے میں مَیں اس سے منسلک ہوا تھا یہ ۱۹۳۹ء کا زمانہ تھا۔ لیکن کمیونسٹ پارٹی کا کل وقتی کارکن مَیں ۱۹۴۲ء کے ابتدائی مہینوں میں بنا تھا۔ اور یہاں پنجاب کی کمیونسٹ پارٹی کے ہفت روزہ اخبار "جنگ آزادی" میں فیروز الدین منصور کے ساتھ کام شروع کیا۔ اور ۱۹۴۳ء میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار PEOPLES WAR اور "قومی جنگ" میں کام کرنے کے لیے بمبئی پہنچا تو وہاں اس دور کے کمیونسٹ رہنماؤں کی صحبتوں نے میرے علم کو وسعت دی یہ وہ دور تھا جب اس برصغیر کے بہترین دانشور کمیونسٹ پارٹی میں کھنچے چلے آ رہے تھے اور ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا پارسی، یہ سب پارٹی ہیڈ کوارٹر میں جمع تھے یا دور دراز سے اکثر آتے رہتے۔ ان میں پورن چند جوشی، جی ادھیکاری، ڈانگے، رندیوے

سندریا، کمارمنگلم، پاربتی، سید سجاد ظہیر، ڈاکٹر اشرف، سید سبط حسن، سردار جعفری یہ سب تھے جن کی صحبتوں میں میں نے بہت کچھ سیکھا بہت کچھ پایا۔ لیکن ایک عمر گزرنے کے باوجود بھی تشنگی ہے کہ ہنوز پریشان رکھتی ہے۔

ہزار حیف کچھ اپنی ہمیں خبر نہ ہوئی
تمام عمر لگی پر مہم یہ سر نہ ہوئی

بہر حال یہ صحبتیں مجھے آج بھی یاد ہیں اور ان صحبتوں اور ان مردان حر کا میں اسی طرح مقروض ہوں جس طرح میں اپنے دور کے جید علماء اور رشد و ہدایت اور آزادی وطن کے مجاہدین کا مقروض ہوں چنانچہ اسی زمانے میں مجھے مسلمانوں کی فکری تحریکوں کو وسیع پس منظر میں جاننے اور تحریکوں کی پشت پر کام کرنے والے محرکات اور عوامل کو سمجھنے کا موقع ملا۔ اس دور سے اب تک برصغیر کی فکری اور سیاسی تحریکیں میرے مطالعہ کا محبوب موضوع رہی ہیں کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ میرے کمیونسٹ پارٹی تک کے سفر میں ایک تسلسل ہے اور یہ سمجھنا کہ کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت نے اپنے ماضی کی عظمت، مذہب سے شیفتگی اور اسلام کے تہذیبی ورثے سے میری وابستگی کو ختم کر دیا تھا تو یہ سخت غلطی ہے اور ایک اتہام ہے ایک الزام ہے۔

ما قصہ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

بدقسمتی سے ہمارے ہاں اس قسم کی غلط فہمیاں اس قدر راسخ ہو گئی ہیں کہ ہم اصل حقائق کو جاننے، سمجھنے اور تجزیہ کرنے سے یکسر انکار کر دیتے ہیں اور اس کی وجہ بالکل واضح ہے کہ پچھلے ساٹھ باسٹھ سال سے یعنی جب سے سوویت یونین میں سوشلسٹ انقلاب بپا ہوا ہے اس وقت سے برطانوی سامراج نے مسلسل سوویت یونین اور اس کے ساتھ کمیونسٹوں کے خلاف مسلسل الزام و اتہام کی ایک زبردست مہم جاری کر رکھی ہے ان پر الزام لگایا گیا ہے کہ کمیونسٹوں نے بخارا و سمرقند کی مساجد گرا دی ہیں۔ قرآن جلا کر

خاکستر کر دیے ہیں نماز روزے پر پابندی لگادی ہے۔ اور تو اور ایک زمانے میں تو یہاں تک کہا گیا کہ کمیونسٹوں نے صرف کارخانوں کو قومی ملکیت قرار نہیں دیا ہے بلکہ عورت کو بھی قومی ملکیت میں لے لیا ہے۔ خاندانی حرمت ختم کر دی ہے وغیرہ وغیرہ، سوویت یونین اور سوشلزم کے خلاف اس التزام کے ساتھ کل بھی پروپیگنڈہ جاری تھا اور آج بھی جاری ہے۔ کہ ہم آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کر لیتے ہیں۔ لیکن اس سب پروپیگنڈے ان سب الزامات واتہامات کا مقصد یہ تھا کہ سوویت روس نے انقلاب کی جو جوت جگائی ہے اس کی لپیٹ میں برصغیر کا مسلمان نہ آجائے۔ کیونکہ برطانوی سامراج اور آج امریکی سامراج کو یہ کیسے گوارا ہو سکتا ہے کہ ان کا سامراج ختم ہو جائے۔ سرمایہ داروں اور جاگیر داروں کا طبقہ ختم ہو جائے کیونکہ انہی کے دم سے وہ مختلف ممالک پر اپنا تسلط بلاواسطہ جماتے ہوئے ہیں اسی لیے آج ہمارے ہاں کے اخبارات ورسائل بھی دن رات اس پروپیگنڈے میں مصروف رہتے ہیں اور ہمارے علماء بھی نادانستہ طور پر اس پروپیگنڈے کا شکار ہو کر وہی راگ الاپنا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس برصغیر کے جید علماء نے اس دور کو، اس انقلاب کو اور سوویت روس کے نظام کو خوش آمدید کہا تھا۔

آج یہاں کے "اسلام پسند" تاریخ کو کتنا ہی مسخ کرنا شروع کر دیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ حسرت موہانی اپنے کو مسلم کمیونسٹ کہتے رہے ہیں، اور سوویت روس کی تعریف بھی کی۔ مولانا عبیداللہ سندھی خود سوویت روس گئے اور انھوں نے بعد میں سوشلزم کی تعریف بھی کی۔ خود مولانا ابوالکلام نے "الہلال" میں کمیونسٹ مینی فیسٹو کا ترجمہ شائع کیا اور پھر اپنی قرآن کی تفسیر میں یہاں تک لکھا کہ سوشلزم بہرحال ایک نظام ہے جسے تجربے کا موقع ملنا چاہیے۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ جو بھی کمیونسٹ ہو جاتا ہے وہ اپنے ماضی سے کٹ جاتا ہے یا اسے اسلام سے اور اپنے دین سے کد ہو جاتا ہے۔ یہ بالکل غلط اور لغو پراپگنڈہ ہے کمیونسٹ صرف یہ چاہتے ہیں کہ مذہب کو لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقوں کے ہاتھ میں عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے ہتھیار کے طور پر استعمال نہ ہونے دیا جائے۔ یہ درست

ہے کہ کمیونسٹ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح مذہب کی بنیاد پر حکومتوں کے قیام کے حامی نہیں ہیں وہ ایک سیکولر نظام چاہتے ہیں لیکن اس نظام میں تمام روایات اور اعتقادات محفوظ و مامون ہوتے ہیں۔ ان کا اصرار ایک لوٹ کھسوٹ سے پاک معاشرہ ہونا ہے اور اسی کے لیے وہ مصروف جہد رہتے ہیں اور اس ضمن میں اس برصغیر کی تاریخ میں ان گنت علماء نے بھی ایسے ہی معاشرے کے لیے جدوجہد کی ہے یہ علماء کبھی بھی انقلاب سے لرزاں و ترساں نہیں ہوتے جیساکہ آج بدقسمتی سے درخشاں ماضی اور شاندار روایات کے حامل مفتی محمود افغانستان کے عظیم انقلاب سے لرزاں و ترساں ہو رہے ہیں۔

بہرحال یہ ایک حقیقت ہے اس برصغیر میں علماء کی ایک بہت بھاری اکثریت نے اس برصغیر میں جہاں برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد کی وہیں انھوں نے سماجی عدل و مساوات پر بھی زور دیا۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء میں جب مجلس احرار قائم ہوئی جس میں خود حضرت لاہوری بھی شامل تھے تو پہلی کانفرنس کے موقع پر مولانا مظہر علی اظہر نے مجلس استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ دیا تھا اس میں برملا کہا تھا۔

ہندوستان کے مدعیان قوم پرستی کو ابھی تک یہ سبق پڑھائے جانے کی ضرورت ہے کہ دنیا امیروں کی جولانگاہ نہیں اس میں غریبوں کا بھی حصہ ہے بلکہ اگر حق رائے دہی اور نظام حکومت کی ضرورت ہے تو غریبوں کو، امیر تو خود اپنی حفاظت کر سکتے ہیں اپنے لیے حفظان صحت کا انتظام کر سکتے ہیں۔ جائداد کی حفاظت کے لیے پہرہ دار مقرر کر سکتے ہیں اپنی اولاد کو تعلیم دے سکتے ہیں۔ لیکن غریب ہی ہیں جنھیں نہ آج تک تعلیم دی گئی نہ ان کے لیے حفظان صحت کا بندوبست کیا گیا نہ ان کی روزمرہ زندگی ہی انسانوں کی زندگی ہی کہلا سکتی ہے بلکہ امیروں کے اکثر کتے لاکھوں اور کروڑوں غریب انسانوں سے بہتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اگر اسی نظام حکومت کو قائم رکھنا ہے جو سرمایہ داری کی شان اپنے اندر رکھتا ہے اور غریب کو کچل کچل کر امیر کو مالا مال کرنے میں منہمک ہے، تو برطانوی کارتوس اور

ہم کچھ عرصے تک یقیناً ابھی غریبوں کو خاموش رکھ سکیں گے اور ہندو اور سکھ سرمایہ پرستی اسی امید پر ادھار کھائے بیٹھی ہے۔ مگر نوع انسانی کے غریب لیکن محنت کش افراد ہمیشہ کے لیے قعرِ مذلّت میں نہیں رہ سکتے۔ اگر پنجاب میں غریب طبقہ میں مسلمانوں کی نمائندگی زیادہ ہے تو باقی صوبوں میں غریب ہندوؤں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ قوم کے بہترین افراد کو جو شب و روز محنت کرتے ہیں اور اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے بھی اکثر محروم رکھے جاتے ہیں جنھیں نہ گرمی میں شملہ، ڈلہوزی اور مری کی ٹھنڈی ہوائیں نصیب ہوتی ہیں نہ سردیوں میں دہکتی ہوئی انگیٹھیوں کے پاس بیٹھنا ملتا ہے نہ یادو یاراں کے موسم میں ہی کہیں سر چھپا کر بیٹھنے کی توفیق ہوتی ہے۔ انھیں ہمیشہ اپنی اغراض کے لیے استعمال کرنا، انھیں شرفِ انسانیت سے محروم رکھنا۔ احسن تقویم میں خلق کی ہوئی دنیا کو اسفل السافلین میں رہنے پر مجبور کرنا۔ بالآخر آج کل کے سرمایہ دار اور فوقیت یافتہ طبقے کے لیے ہی نہ صرف مہلک بلکہ خطرناک ہوگا۔ آج وقت ہے کہ قوم کے ہر طبقہ کو فراخ حوصلگی سے مواقع ترقی دیے جائیں۔ غریبوں، کمزوروں، جاہلوں بلکہ گناہ گاروں کی خبر گیری کی جائے تاکہ وہ آسانی سے خواص انسانی حاصل کر کے مادرِ وطن کے لیے زینت اور فخر کا باعث ہوں۔ لیکن اگر حکومت کی مشینری اس لیے چلائی جاتی ہے کہ غریب محنت کرے اور سرمائے دار عیش اڑاتے، مقروض کماتے اور قارض سب کچھ سود میں اڑائے جاتے عوام الناس بیکاریوں اور جرم و گناہ کی زندگی بسر کریں اور امراء و روسائ انھیں سزا دینا ہی اپنا فرض سمجھیں۔ ان کی مشکلات کو حل کرنے کی دردسری اپنے ذمہ نہ لیں تو طبقاتی جنگ کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہے گا۔

ہم اب بھی آزادیٔ وطن کے لیے تہہِ دل سے کوشش کریں گے۔ لیکن ہماری کوششیں غریبوں، مفلسوں، محنت کشوں، مظلوموں اور ستم رسیدوں کی آزادی، خوش حالی اور فارغ البالی کے لیے ہوں گی۔ ہم نئی بادشاہتیں، نئے راج، نئی نوابیاں اور نئے

ساہوکار دیکھ کر خوش نہیں ہو سکتے۔ ہم خود دولت اور امیری کے دلدادہ نہیں نہ آئندہ امیرانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرنا ہمارا مقصد ہے۔ اس لیے جہاں ہم نے آج تک برطانوی ملوکیت اور سرمایہ داری کا ساتھ دینا ضعف ایمانی سمجھا ہے اسی طرح ہندوستانی سرمایہ داری کے ہاتھ میں کھیلنا بھی ہمارے نزدیک جائز نہیں اگر ہمارے سرمایہ دار بھائی ہمیں اپنے پھندے میں نہ پھنستا دیکھ کر جوش غضب میں آئیں تو ہم مردانہ وار مسکرا کر اپنی راہ چلتے جائیں گے۔"

اسی موقع پر مولانا حبیب الرحمٰن لودھیانوی نے اپنے خطبہ صدارت میں اعلان کیا تھا:

"میرے نزدیک ہندوستان کی تمام مشکلات کا حل صرف ایک ہے کہ ہندوستان کے تمام قوم پرست کسانوں اور مزدوروں کی تنظیم کریں اور ہندوستان میں بجائے ایک سرمایہ دار حکومت کے غربا، کی حکومت قائم کریں میں اگرچہ کانگرسی ہوں اور میں نے ہمیشہ کانگرس کے جھنڈے تلے کام کیا ہے مگر مجھے اس کے کہنے میں پس وپیش نہیں ہے کہ کانگرس کی محنت اور قربانی کا نتیجہ اس سے زیادہ کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان کی حکومت انگریزی سرمایہ داروں کے ہاتھ سے نکل کر ہندوستان کے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں دیدی جائے گی بلکہ ڈومینین سٹیٹس کی شکل میں تو جو حکومت ہندوستان پر قائم ہوگی اس میں ہندوستانی اور انگریز سرمایہ دار مل کر یہاں کے غربا، کو کچلنے کی کوشش کریں گے۔"

(تاریخ احرار صفحہ ۵۵ تا ۵۶)

تو یہ تھی مجلس احرار جس کے اس ورثے نے ہماری نسل کی آبیاری کی تھی تو دوسری طرف ۱۹۳۹ء میں جب دوسری جنگ عظیم کے بادل امڈ رہے تھے تو اس زمانے میں برطانوی سامراج نے مجبور ہو کر مولانا عبیداللہ سندھی کی جلاوطنی ختم کر دی تھی اور وہ بیس بائیس برس کی جلاوطنی کے بعد وطن لوٹے تھے اور انھوں نے اپنی فکری تحریک کا اجراء کیا تو دیکھتے دیکھتے وہ علمائے دیوبند کے ساکن اور غیر متحرک حلقے میں ایک طوفان بن گئے اور ان کی شخصیت آناً فاناً متنازعہ قرار

دی گئی، یہ بڑا ہی ہنگامہ پرور دور تھا لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اس دور میں مولانا عبیداللہ سندھی واحد شخصیت تھے جنھوں نے اسلامی اور برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ اور فکر کو سمجھنے کے لیے نئی راہوں کی نشاندہی کی اور نئی سمتیں کھولیں۔ اور پہلی بار ان کی فکری تحریکوں میں ایک تسلسل سمجھ میں آنے لگا۔ چنانچہ یہی شوق اور جذبہ تھا جس نے اس برصغیر کے مسلمانوں کی فکری تحریکوں پر کام کے لیے مائل کیا۔

آج سے بیس برس پہلے میں نے ان تحریکوں پر کام شروع کیا تھا دو سال تک ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۴ء تک روزنامہ "امروز" میں ان تحریکوں پر کالم سلسلہ وار شائع ہوتا رہا۔ پھر ۱۹۶۶ء میں اس کام کا ایک حصہ بنگالی مسلمانوں کی جہد آزادی ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک شائع ہوا۔ یہ واقعہ ہے کہ بنگالی مسلمانوں کی تاریخ اور ان تحریکوں پر اُردو میں یہ پہلی کتاب تھی اور غالباً اس کے بعد بھی کوئی ایسی جامع کتاب شائع نہیں ہوئی۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ اس کو آگے بڑھاؤں گا اور اگلے سو سال کا دور بھی احاطہ کرلوں گا۔ لیکن پھر دوسرے کاموں میں ایسا الجھا کہ اس طرف توجہ نہ کرسکا۔ تاآنکہ مسلم بنگال کا رشتہ ہی ہم سے منقطع ہوگیا۔

اب جب میں نے مولانا احمد علی رحمتہ اللہ علیہ کی سوانح پر کام شروع کیا تو مواد اکٹھا کرتے ہوئے مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ میں ذکر و فکر کا آدمی نہیں ہیں مولانا لاہوریؒ کی سوانح نہ اس انداز سے لکھنا چاہتا ہوں نہ ہی لکھ سکتا ہوں۔ میں تو مولانا رحمتہ علیہ کو زنجیر کی ایک کڑی میں رکھ کر دیکھ سکتا ہوں اور یہی ان کی عظمت ہے۔ دراصل پورا مسلک دیوبند ایک تسلسل کا نتیجہ ہے آج ان میں کئی ایک مسلک نکل آئے ہیں، اور کئی ایک سیاسی راہیں پھوٹ نکلی ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ شیخ الہند مولانا محمودالحسن تک جو راہیں اپنائی گئیں جو طریق کار اختیار کیا گیا وہ تمام وہی تھے جو ایک وقت میں شاہ ولی اللہ اور پھر شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسمٰعیل اور سید احمد شہید نے اپنائے۔

اس لیے مولانا عبیداللہ سندھی کے شاگرد اور دیوبندی مکتب فکر کے حامل مولانا احمد علی لاہوریؒ رحمتہ اللہ علیہ کو اس وقت تک پوری طرح جانا ہی نہیں جا سکتا جب کہ شاہ ولی اللہ اور ان سے پہلے

کی فکری تحریک کو نہ سمجھا جائے۔ چنانچہ مولانا احمد علی سوانح کی پہلی جلد اصل میں اس برصغیر میں مسلمانوں کی فکری تحریکوں کے سماجی اور اقتصادی پس منظر کی روئیداد ہے اس روئیداد کے پس منظر میں مولانا احمد علی اور ان کے استاذ مولانا عبیداللہ کے بہت سے کارنامے سمجھ میں آسکتے ہیں اور تو اور اس پس منظر کے بغیر نہ تو جمعتہ العلمائے ہند کے قیام کے بارے میں سمجھا جاسکتا ہے، نہ جمعتہ العلمائے ہند کا کانگرس کے ساتھ تعاون کے بارے میں کوئی حکم لگایا جاسکتا ہے۔ یہ بہت ہی الجھے ہوئے مسائل ہیں اور ان کی پشت پر صدیوں کی فکری تحریکیں ہیں اس لیے آج پورا پس منظر جاننا چاہیے۔

پہلی جلد سید احمد شہید کی تحریک جہاد اور اس کی ناکامی پر ختم کر دی گئی ہے دوسری جلد انشاءاللہ ۱۹۸۰ء کے اوائل میں آجائے گی اس طرح سے یہ مولانا لاہوری کے حوالے سے پورے برصغیر کے مسلمانوں کے فکر کی تاریخ مکمل ہو جائے گی۔

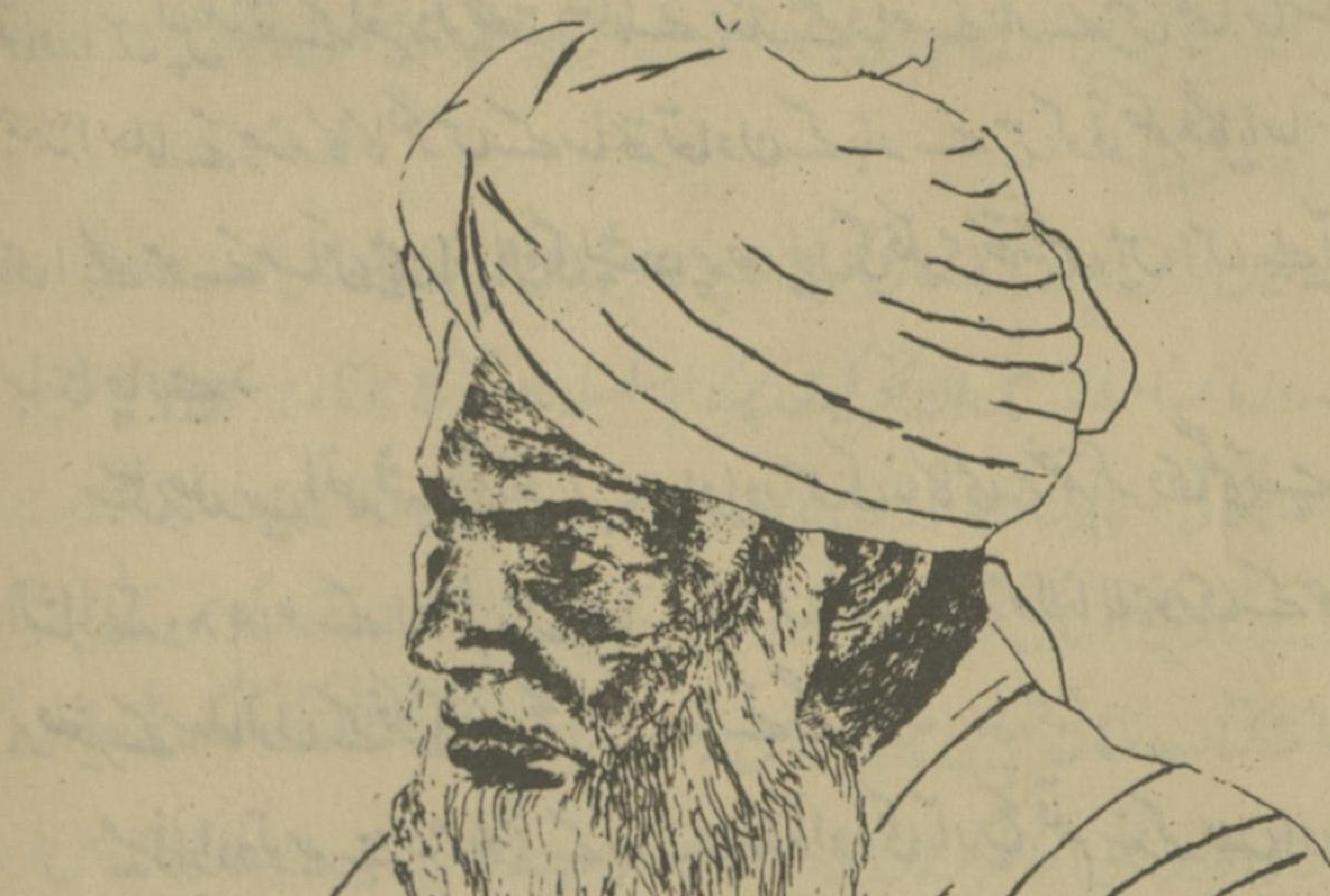
میرا ارادہ تو یہ ہے کہ مولاناؒ کے پورے خانوادہ کی تاریخ قلم بند کر دوں اور اس کو تحریک نظام مصطفٰیؐ تک لے آؤں تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ اس تحریک کی پشت پر کون کون سے عوامل کام کر رہے ہیں اور پتہ چلایا جاسکے کہ کل کے راندہ درگاہ علماءؒ آج بعض حلقوں میں مقبول کیسے ہو گئے اسی لیے تو یہ حلقے کہہ رہے ہیں۔

راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

اور شاید اس کے لیے معاملات تیسری جلد تک پہنچ جائیں۔ بہرحال یہ داستان جو شروع کی ہے اس کو اللہ تعالےٰ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ہمت دے اور میں اپنے پڑھنے والوں سے بھی انہی دعاؤں کا طالب ہُوں۔

شرط ان کی جستجو تھی، نہ پایا نہ سہی
یہ تو نہیں ہوا کہ ارماں نہ کر سکے

دعاؤں کا طالب: عبداللہ ملک
یکم جنوری ۱۹۷۹ء



مفسّرِ قرآن حضرت مولانا احمد علی رح

باب ۱

یہ ۱۹۶۲ء کا سال تھا، اس کے ابتدائی مہینے تھے، فروری کی سردی اپنے جوبن پر تھی۔ اسی موسم سرما کی ایک شام کو ایک موت واقع ہوئی تھی، یہ کسی بادشاہ وقت کی موت نہ تھی، کوئی وزیر اعظم بھی اس شام کو اللہ کو پیارا نہ ہوا تھا، کوئی فوجی جرنیل یا کوئی صدرِ مملکت بھی نہیں مرا تھا، کسی امیر کبیر کی رحلت کی خبر بھی نہ آئی تھی، لیکن اس کے باوجود اس موت نے ایک عالم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا، پاکستان کے طول و عرض میں ہی نہیں بلکہ اس برصغیر کے مسلمانوں کو، بالعموم اس موت نے پریشان کر دیا تھا، ایک عالم کی آنکھیں پُرنم ہو گئی تھیں اور اس شہر لاہور کے لوگ قطار اندر قطار اس موت والے گھر پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔

یہ ۲۳ فروری تھی، ۱۹۶۲ء کا سال تھا، جمعہ کا دن تھا، اور اس موت کی خبر میں نے ہی اپنے کانپتے ہاتھوں اور چشم پرنم کے ساتھ رقم کی تھی جو روزنامہ "امروز" کے صفحۂ اوّل کی زینت بنی۔

اور پھر ۲۴ فروری کو جب یہ جنازہ اٹھا اور جب یہ جسد خاکی قبر میں اتارا گیا تو اس کی منظر کشی بھی اس فقیر نے کی تھی۔



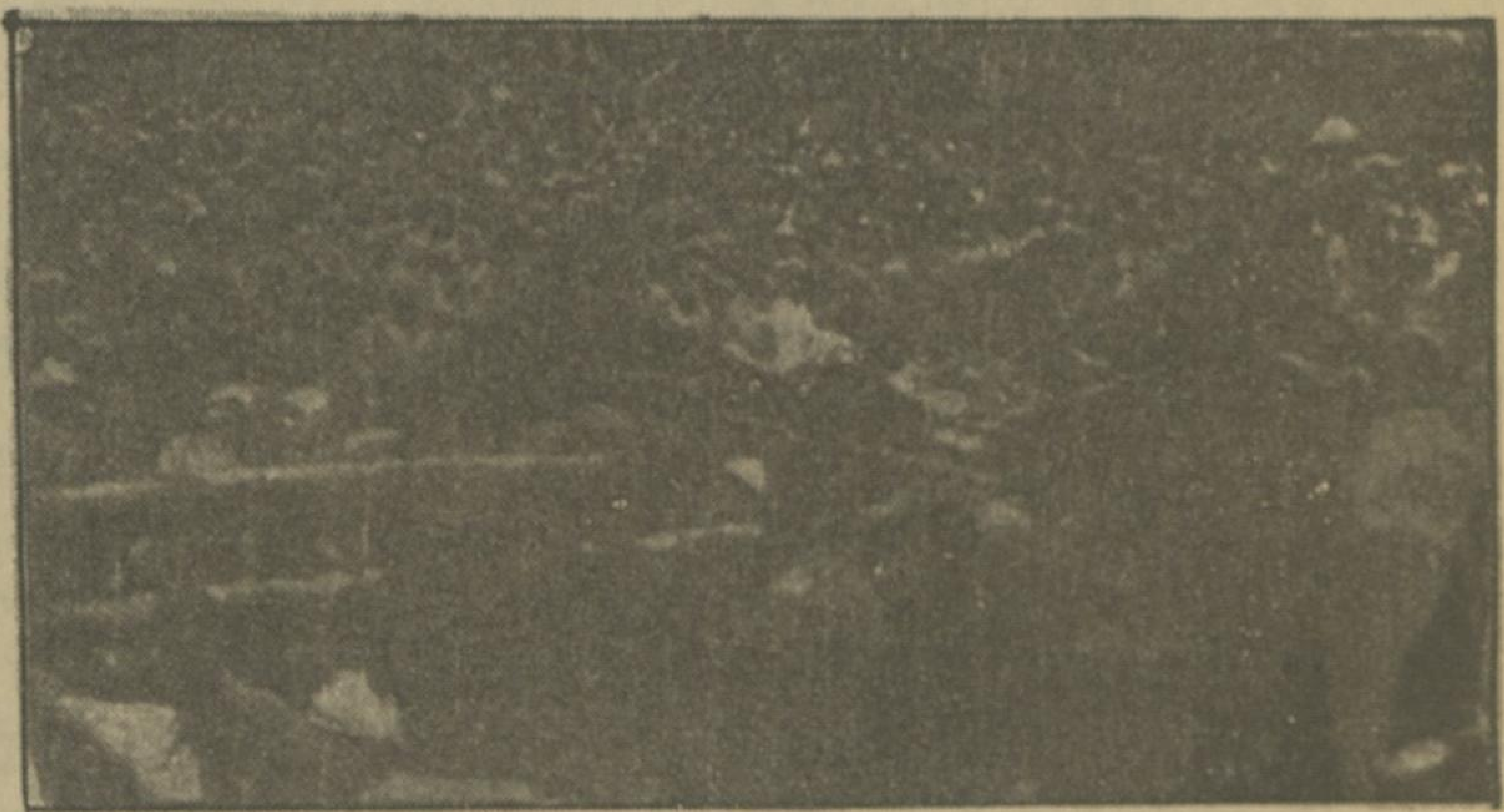
جلد ۱۴ نمبر ۴۴ | بروز ہفتہ ۲۴ فروری ۱۹۶۲ء | ۱۸ رمضان المبارک ۱۳۸۱ | ۱۳ پھاگن سمت ۲۰۱۸ | قیمت ۶ پیسے

مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی صاحب رحلت فرما گئے

شیخ الحدیث - جید عالم دین - پُراثر مقرر اور جنگِ آزادی کے نڈر سپاہی

امیر انجمن خدام الدین کی وفات سے علمی و مذہبی حلقوں میں صفِ ماتم بچھ گئی

مرحوم کا جنازہ آج تین بجے اٹھایا جائے گا۔



یونیورسٹی گراؤنڈ میں مولانا احمد علی مرحوم کے جنازے کا ایک منظر

امروز کے سٹاف رپورٹر سے

لاہور ۲۳ فروری۔ نور کے بینار جید عالم دین بطلِ حریت، مُفسرِ قرآن، دین و مذہب کی برہنہ شمشیر اور زہد و تقویٰ کے پیکر حضرت مولانا احمد علی آج رات ساڑھے نو بجے اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

انجمن خدام الدین کے امیر حضرت مولانا احمد علی غفرلہٗ آج حسبِ معمول جب شیرانوالہ میں جمعہ کی نماز پڑھانے آئے تو ان کی طبیعت یکدم خراب ہو گئی اور وہ نماز کی امامت کے فرائض بھی انجام نہ دے سکے۔ فوری طور پر مولانا کو طبی امداد بہم پہنچائی گئی۔ لیکن ان کی حالت بگڑتی ہی گئی اور مغرب کی نماز کے بعد تو حالت بہت زیادہ دِگرگوں ہو گئی اور رات کے ساڑھے نو بجے وہ راہیٔ ملک عدم ہوتے مولانا کچھ عرصے سے فالج کے مریض تھے۔ لیکن مرض کے باوجود دینی اور علمی کاموں میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔

مولانا مرحوم کا جنازہ کل سہ پہر ۳ بجے شیرانوالہ دروازے سے اٹھایا جائے گا۔ یونیورسٹی گراؤنڈ میں نمازِ جنازہ ادا کی جائے گی اور ان کے جسدِ خاکی کو میانی صاحب کے قبرستان میں سپرد خاک کیا جائے گا

موت العالِم موت العالَم

(امروز کے سٹاف رپورٹر سے)

لاہور ۲۴ فروری۔ صوبائی دار الحکومت لاہور کے لاکھوں مسلمانوں نے آج شام کانپتے ہوئے ہاتھوں، دھڑکتے دلوں اور پُرنم آنکھوں کے ساتھ امیر انجمن خدام الدین، زہد و تقوےٰ کے پیکر جیّد عالم دین اور اس دور کی برگزیدہ ہستی۔ مولانا احمد علی کے جسدِ خاکی کو قبر میں اتار دیا۔ مرحوم کو میانی صاحب کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا ہے۔

جس وقت مولانا مرحوم و مغفور کی میت کو قبر میں اتارا جا رہا تھا تو چاروں طرف سسکیاں اور آہیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس شہر نے مدتوں بعد اتنی عظیم نماز جنازہ دیکھی ہے۔ یونیورسٹی

گراؤنڈ کے وسیع و عریض میدان میں دوپہر سے ہی نماز جنازہ میں شرکت کرنے والے لوگوں کا بے پناہ ہجوم جمع ہونا شروع ہوگیا تھا۔ بالآخر پونے پانچ بجے ایک لاکھ انسانوں نے اس عالم دین شیخ الحدیث، مفسر قرآن اور جنگ آزادی کے مجاہد کی نماز جنازہ ادا کی۔ نماز جنازہ کی امامت کے فرائض خود مولانا احمد علی مرحوم کے منجھلے صاحبزادے مولانا عبید اللہ انور نے ادا کیے۔ اس موقع پر قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے اعلان کیا کہ حضرت امیر انجمن خدام الدین کے معتقدین علماء تمام اطراف و اکناف سے لاہور میں جمع ہو چکے ہیں اور ان کا حکم ہے کہ اس نماز جنازہ کی امامت خود مولانا احمد علی کے صاحبزادے مولانا عبید اللہ انور ادا کریں، وہی مولانا مرحوم و مغفور کے بعد اس ذمہ داری کے اہل ہیں کیونکہ ان کو امیر جماعت نے خود اس ذمہ داری کے لیے تربیت دی تھی اور مولانا عبید اللہ انور کو اپنے والد مرحوم کا پورا فیض حاصل رہا ہے اس کے بعد مولانا عبید اللہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ آج مولانا کی وفات کے باعث کئی ایک تعلیمی اداروں میں چھٹی دیدی گئی۔ آج صبح سے ہی مولانا مرحوم کے مکان واقع خضری محلہ میں لوگوں کا ہجوم جمع ہونا شروع ہوگیا۔ اخبارات سے دور دراز کے لوگوں کو بھی اس جان لیوا سانحہ اور اس وفاتِ حسرت آیات کا علم ہوگیا تھا۔ چنانچہ معتقدین کا ایک جم غفیر مولانا کے مکان اور مسجدِ شیرانوالہ میں جمع ہونا شروع ہوگیا تھا۔ نمازِ ظہر کے بعد مولانا مرحوم کا جنازہ اٹھایا گیا۔ جس چارپائی پر میت رکھی تھی اس کے ساتھ کئی بانس باندھے گئے تھے۔

مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی موت صرف ایک شخص، ایک جید عالم، ایک مینارۂ نور، زہد و تقویٰ کے پیکر اور قرآن و حدیث کے مفسر کی ہی موت نہ تھی یہ ایک دور کی موت تھی۔ ایک سلسلہ کی کی آخری کڑی کا ٹوٹ جانا تھا، یہ ایک داستان کا خاتمہ تھا، وہی داستان جس کو صدیوں سے پاک و ہند کے جید علماء اور ان گنت نام لیوا اپنے خون سے رقم کرتے رہے ہیں کئی بار تاریخ کی بے پناہ یلغار میں اس داستان کے عنوانوں کو حرفِ آخر کی طرح مٹانے کی کوشش کی شہنشاہیت کے عظیم ریلے نے اس داستان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے فضا میں بکھیرنے کی کئی بار سعئ لاحاصل کی۔ سامراج کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے ان داستانوں کو بہالے جانے کی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ لیکن ہر بار ان علماء نے اپنے صبر و عمل سے اپنی

قربانیوں اور جانفشانیوں سے اس داستان کو زندہ رکھا۔ اس کو تابندگی بخشی اور ان کو پھر سے عنوانات جلی سے مزین کیا، یہ اسی داستان کا تسلسل تھا۔ یہ صدیوں کی طویل جدوجہد کا ثمر تھا کہ جب اس عالم دین کو جو دنیا کی تمام "وجاہتوں" سے عاری اور بے نیاز تھا قبر میں اتارا جا رہا تھا تو صرف پاکستان اور ہندوستان کے ہی کروڑوں انسانوں کی آنکھیں پُرنم نہ تھیں، بلکہ دنیائے اسلام نے ایک خلا محسوس کیا تھا

مولانا کا زہد اور تقویٰ مُسلّم تھا، ان کی قرآن فہمی کا سکّہ ہر کہ ومہ کے دل پر ثبت تھا۔ حدیث کی تفسیر میں ان کو جو مہارت حاصل تھی اس سے بھی کوئی مُنکر نہ تھا۔ لیکن اس سے بڑھ کر ایک بات جو تھی وہ ان کا عمل تھا۔ وہ ہمیشہ سچ اور حق کے لیے شمشیر برہنہ رہے، اور اپنا معاشرہ ہو یا اپنی حکومت یا بیرُونی شہنشاہیت کسی کے سامنے انھوں نے سچ سے کبھی گریز نہیں کیا، اور مصلحت کے گرداب میں ان کا پاؤں کبھی نہیں پھنسا۔ اور یہی وہ تربیت اور تعلیم تھی جو ان کو اپنے شیوخ اور اپنے اساتذہ سے ملی تھی۔

اس خطہ زمین پر مولانا احمد علی غالباً آخری عالم تھے جن کو شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور مولانا عبید اللہ سندھی جیسے رہنماؤں کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے کا شرف حاصل ہوا اور مولانا احمد علی کی خوش قسمتی تھی کہ ان کو جو شیوخ بھی نصیب ہوئے وہ بھی ایسے تھے جنھوں نے اپنے حجروں کو صرف ذکر کرنے کے لیے وقف نہیں کر رکھا تھا، بلکہ ان حجروں کو بوقتِ ضرورت شہنشاہیت کے خلاف اسلحہ جمع کرنے اور شہنشاہیت کے خلاف مسلح بغاوت کے مراکز کے طور پر بھی استعمال کیا تھا اس طرح اٹھارہویں صدی کے ابتدا میں خانوادۂ شاہ ولی اللہ نے جو شمع روشن کی تھی وہ تین صدیوں سے ہر حال میں جلتی رہی ہے۔ کبھی تہہِ دامن اور کبھی بر سرِ دامن اور حضرت مولانا احمد علی کی ذات اس خطہ زمین میں اس شمع کی ایک بہت بڑی محافظ تھی۔ انھوں نے اپنے جہد و عمل میں اس شمع کو بے پناہ جھکڑوں سے محفوظ ہی نہیں رکھا تھا بلکہ اس کو روشن سے روشن تر اور تابندہ سے تابندہ تر کیا۔ آج رونا اس بات کا ہے کہ مولانا کے بعد چاروں طرف ایک تاریکی ہے جو اُمڈتی آ رہی ہے۔ اب کوئی نہیں جس کی سادگی کے سامنے لباسوں کی تزئین ماند پڑ جائے

کوئی آواز نہیں جس کے رُوبرُو اقتدار کی گھن گرج بھی نحیف و نزار ٹھہرے۔ علم و عمل کا کوئی پیکر ایسا نہیں جس کے سامنے مخالف کی آنکھیں جھپک جائیں اور زمانہ اس کے نام کی قسم کھائے اور یہ کون کہہ سکتا تھا کہ ایک سِکھ گھرانا ایسا نورِ نظر پیدا کرے گا۔ جو شاہ ولی اللہ کے خانوادہ کے سلسلہ کو جاری رکھے گا۔

پیدائش

مولانا احمد علیؒ ضلع گوجرانوالہ میں انیسویں صدی عیسوی کے چل چلاؤ کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن قصبہ جلال ہے۔ یہ قصبہ ریلوے اسٹیشن گکھڑ سے چار میل مشرق کی جانب واقع ہے۔ آپ کے والد کا نام شیخ حبیب اللہ تھا اور اس سِکھ گھرانے میں آپ ہی نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا اور آپ کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اپنی اولاد کو دین اسلام کے لیے وقف کریں۔ مولانا کی والدہ پیدائشی مسلمان تھیں۔

مولانا احمد علی کا سال پیدائش ۱۸۸۶ء ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا جس دور میں پیدا ہوئے یہ دور اس برصغیر کے عام ادوار سے زیادہ ہی اہمیت کا حامل ہے اور انیسویں صدی کے آخری پچیس برسوں میں جتنی نادر اور نامور شخصیتوں نے جنم لیا ہے وہ اس دور میں چند سال پہلے یا بعد کے سالوں میں لیکن اسی دور میں پیدا ہوئیں۔ قائداعظم محمد علی جناح ہوں یا مہاتما گاندھی ہوں، مولانا ابوالکلام ہوں یا پنڈت جواہر لال نہرو یا ڈاکٹر اقبال اسی آخری ربع صدی کی پیداوار ہیں۔ اس کی سب سے اہم وجہ غالباً یہ ہے کہ انیسویں صدی کے چل چلاؤ اور بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں اس برصغیر میں زبردست ہلچل اور حرکت کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ اور ۱۸۵۷ء کے حادثے اور اس کے تشدد نے جو ایک یاس اور نا امیدی کی فضا پیدا کر دی تھی اور عوام کا تو کیا ذکر اُوپر کے طبقے بھی پھر سہم کر بیٹھ گئے تھے۔ ان میں نئے سرے سے اُمید اور اُمنگ پیدا ہو رہی تھی وہ نئے حالات اور نئی فضا کے مطابق اپنے اپنے طریقوں سے حالات کا مُقابلہ کرنے کے لیے اپنی اپنی راہیں متعین کر رہے تھے یہ نئی راہوں کی تلاش اور تعین صرف اس برصغیر میں

ہی نہیں ہو رہا تھا بلکہ پورے ایشیا ، دنیائے عرب میں بھی یہ دور بڑی دور رس تبدیلیوں کا دور تھا یہ تبدیلیاں جسمانی بھی تھیں اور فکری بھی۔ چنانچہ اس دور کے متعلق مولانا عبدالمجید سالک "مصر میں اسلام اور تحریک تجدد" نامی کتاب کے ترجمے کے سلسلے میں اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

"انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہندوستان اور مصر کے بعض زندہ دل اکابر نے مسلمانوں کی بدحالی کو دیکھ کر ان کے احیاء کی غرض سے جن تحریکوں کا آغاز کیا ان میں سرسید اور ان کے رفقاء کی تحریک اور مفتی محمد عبدہٗ کی تحریک کو بہت بڑا مقام حاصل ہے۔ ان دونوں تحریکوں میں مابہ الامتیاز بات یہ نظر آتی ہے کہ سرسید اور ان کے رفقاء تو زیادہ تر مسلمانوں کے ثقافتی احیاء میں مصروف ہوئے لیکن مصر کی تحریک ایک خالص مذہبی تحریک تھی۔ بلاشبہ سرسید نے اپنی ہمہ گیر مصروفیتوں میں مذہب کو بھی شامل رکھا لیکن وہ اپنی تمام تر دردمندی اور اخلاص کے باوجود مذہبی اصلاح و تجدید کے اہل نہ تھے ان کے مقابلے میں علامہ سید جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہٗ دینیات اسلامی کے جلیل القدر عالم تھے اور مسلمانوں کے دینی مزاج کو بخوبی سمجھتے تھے اور ان کا خیال یہ تھا کہ جب تک مذہب کے بارے میں جمود نہ توڑا جائے گا۔ ان کو دوسرے دوائر میں ترقی و تجدید کی توفیق حاصل نہ ہوگی۔

علامہ جمال الدین افغانی کے پیش نظر صرف مسلمانوں کی سیاسی تنظیم تھی اور اس مقصد کے لیے وہ اسلام کے بنیادی عقائد کی پوری حفاظت کے ساتھ دوسرے دنیاوی امور میں ترقی و تجدید کے داعی تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مسلمانان عالم جب تک سب سے پہلے اوہام پرستی ، ضعیف الاعتقادی ، جہالت اور جمود کے بندھنوں سے آزاد نہ ہوں گے نہ ان کا دین اپنی صبح درخشانی سے جلوہ گر ہوگا اور نہ وہ سیاسی ، معاشرتی اور دوسرے دنیاوی امور میں زندہ قوموں کے قدم بقدم چلنے کے قابل ہوں گے۔"

یہ اقتباس میں نے اس لیے دیا ہے کہ یہ بتا سکوں کہ انیسویں صدی کے چل

چلاؤ کے جس دور میں مولانا احمد علی پیدا ہوئے وہ کس قدر اتھل پتھل، فکری انتشار اور نئی راہوں کی تلاش کے ولولوں کا دور تھا۔ اس دور میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں وہ صرف اس برصغیر ہی کا حصہ نہ تھیں بلکہ سچ یہ ہے کہ پوری دنیائے اسلام ان تبدیلیوں کی زد میں تھی اور یہ تبدیلیاں افکار کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رہی تھیں نئی شخصیتوں کو بھی جنم دے رہی تھیں۔ ایسی شخصیتیں جو ان نئے تقاضوں سے عہدہ برآ ہو سکیں، اس تمام عمل میں ایک بات مشترک تھی کہ دنیائے اسلام کا اکثر و بیشتر حصہ اور یہ برصغیر دونوں ہی برطانوی شہنشاہیت کے بلاواسطہ یا بالواسطہ غلام تھے۔ اس لیے اس دور کو اور اس دور میں پروان چڑھنے والی شخصیتوں کو سمجھنے کے لیے برطانوی شہنشاہیت کے خدوخال اور طریق کار کو سمجھنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ شخصیتیں خواہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، کلیتہً سیاسی ہوں یا کلیتہً غیر سیاسی، ہر حال میں ان سب میں بہت سی قدریں مشترک ہوتی ہیں اور وہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس لیے خواہ محمد علی جناح ہوں یا مولانا احمد علی۔ یہ سب ایک مخصوص دور کی پیداوار ہیں۔ ان پر مختلف اثرات مرتب ہوتے اور اثرات کا یہ امتیاز صرف اسی صورت حال کا پیدا کردہ تھا۔ اس کا تذکرہ میں تفصیلاً آگے چل کر کروں گا۔

ہاں تو یہ ۱۸۸۶ء کا سال تھا اور جمعہ کا دن تھا۔

والد بزرگوار نے آپ کا نام احمد علی رکھا۔ مولانا کے تین اور بھائی تھے۔ تینوں آپ سے چھوٹے تھے۔ آپ سے چھوٹے مولوی محمد علی تھے وہ حافظ قرآن بھی تھے، دوسرے مولوی عبدالعزیز تھے اور تیسرے حکیم رشید احمد تھے۔ یہ انجمن حمایت اسلام کے طبیہ کالج میں استاد بھی رہے ہیں اور مدتوں شیرانوالہ دروازے کے اندر مطب بھی کرتے رہے۔

تعلیم

مولانا احمد علیؒ نے ابتدائی تعلیم جس میں قرآن شریف پڑھنا بھی شامل تھا اپنی والدہ سے ہی حاصل کی اس کے بعد انھیں قصبہ سے ڈیڑھ میل دور کوٹ سعداللہ کے ایک اسکول میں داخل کرا دیا گیا لیکن آپ کو تھوڑی مدت کے بعد ہی اس اسکول کو چھوڑنا پڑا۔ کیونکہ مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ کو

اپنے خاندان کی دشمنی کے ہاتھوں اپنا آبائی گاؤں چھوڑنا پڑا اور موضع باہو چک میں سکونت اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس نقل مکانی کے بعد مولانا کو باہو چک کے قریب کے ایک قصبہ تلونڈی کھجور والی کے اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اس اسکول سے مولانا نے پانچ جماعتیں پاس کیں۔

دینی تعلیم کی ابتداء

مولانا کے والد ماجد شیخ حبیب اللہؒ آپ کو دینی تعلیم دینے کے لیے وقف کیے ہوئے تھے اس لیے جیسے ہی آپ نے پانچ جماعتیں پاس کیں۔ آپ گوجرانوالہ کی جامع مسجد میں بھیج دیے گئے۔ یہاں اس وقت خطابت کے فرائض مولانا عبدالحق سرانجام دیتے تھے یہ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے چنانچہ مولانا احمد علی بھی آپ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ یہاں آپ کی دینی تعلیم کی ابتداء ہوئی اور سب سے پہلے آپ کو فارسی نصاب کی تعلیم دی گئی۔ اس زمانہ میں مولانا کا قیام بھی اپنے استاد مولانا عبدالحق کے پاس ہی تھا۔ مولانا عبدالحق کے دو صاحبزادے محمد ابراہیم اور محمد اسماعیل بھی مولانا کے ہم سبق تھے۔ ابھی اس دینی تعلیم کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ آپ کے والد شیخ حبیب اللہ نے آپ کو مولانا عبیداللہ سندھی کے سپرد کر دیا۔ مولانا عبیداللہ سندھی دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر سندھ جاتے ہوئے اپنی والدہ کو ملنے کے لیے ضلع سیالکوٹ پہنچے تھے وہاں ان کی والدہ نے شیخ حبیب اللہ کے قبول اسلام کا مژدہ سنایا اور ان کو خود لے کر باہو چک میں شیخ حبیب اللہ سے ملانے کے لیے آئیں۔ یہاں شیخ حبیب اللہ نے اپنے لخت جگر مولانا احمد علی کو دین کی خدمت اور تربیت کے لیے مولانا عبیداللہ سندھی کے سپرد کرنے کا اعلان کیا اور فرمایا کہ "یہ بچہ میں نے دین کے لیے وقف کیا ہے اسے قبول کیجئے"۔ چنانچہ اس کے بعد سے مولانا کی تربیت کی ذمہ داری مولانا عبیداللہ سندھی کے کندھوں پر رہی اور سچ تو یہ ہے کہ استاد اور شاگرد دونوں نے اپنی اپنی ذمہ داریاں پوری زندگی میں نبھائیں اور ایک لمحہ بھر کے لیے بھی ان ذمہ داریوں سے کسی نے انحراف نہیں کیا۔ آپ جب مولانا عبیداللہ سندھی کے ساتھ گئے تو اس وقت آپ کی عمر غالباً سات آٹھ برس کی ہو گی آپ سندھ ہی میں تھے کہ جب آپ کو اپنے والد کی وفاتِ حسرت آیات کا علم ہوا اور اسوقت

آپ کی عمر ۹ برس کی تھی اور آپ مولانا عبیداللہ کے ہمراہ شیخ المشائخ حضرت دین پوری کے ہاں مقیم تھے مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا احمد علی کے والد شیخ حبیب اللہ میں ویسے بھی قرابت داری تھی کیونکہ دونوں سکھ خاندان سے متعلق تھے۔ چنانچہ اس بنا پر حضرت دین پوری نے مولانا احمد علی کی والدہ کا نکاح مولانا عبیداللہ سے پڑھا دیا۔ تاکہ مولانا احمد علی کے چھوٹے بھائیوں کی صحیح طور پر نگہداشت ہو سکے اس طرح مولانا عبیداللہ سندھی استاد کے علاوہ مولانا کے سوتیلے والد بھی قرار پائے اور مولانا کے چھوٹے بھائی بھی مولانا سندھی کے زیر تربیت آگئے لیکن مولانا کی والدہ بھی اس نکاح ثانی کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہ رہیں اور مولانا کو کم سنی میں ہی والد والدہ کی شفقت سے محروم ہونا پڑا۔

مولانا سندھی کی تربیت

مولانا احمد علی کی تمام عمر کی سخت کوشی اور مصائب کو خندہ پیشانی اور جرأت سے جھیلنے کے بے پناہ جذبہ کی ابتداء اسی بچپن کی تربیت نے کی تھی اور اس میں مولانا سندھی کی سخت گیر طبیعت کا بہت بڑا دخل ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ مولانا کے لڑکپن کا زمانہ بہت ہی پر مشقت اور تکلیف دہ تھا۔ آپ کے استاد مولانا سندھی آپ کو ہر وقت کام میں مصروف رکھتے۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانا، گھر کا پانی بھرنا، استاد اور اپنے چھوٹے بھائیوں کے کپڑے دھونا۔ یہ سب آپ کے سپرد تھا اور سالہا سال تک مولانا کو یہ فرائض انجام دینا پڑے۔ لیکن کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں آیا۔ اور تو اور مدتوں مولانا ایک روٹی کھا کر گزارہ کرتے رہے اور باقی بھوک جنگلی پھلوں، کیلے کی پھلیوں اور جنگلی بیروں سے پوری کرتے۔ حضرت مولانا سندھی کے گھر سے ان کے لیے دو روٹیاں آتیں۔ ایک مولانا سندھی خود کھا لیتے اور ایک اپنے شاگرد کو دیدیتے۔ اس شاگرد کی بھوک ایک روٹی سے کیسے پوری ہو سکتی تھی۔ لیکن کبھی نہ تو شکوہ کیا اور نہ کبھی شکایت میں لب ہلے یہ تربیت آنیوالی مجاہدانہ اور سرفروشانہ زندگی کی تیاری تھی۔

مولانا احمد علی ہوں یا مولانا عبیداللہ سندھی۔ جب ان کی یا ان کے خاندانوں کی تبدیلی مذہب

کی داستان کو کریدا جائے تو ایک بات بہت دلچسپ معلوم ہوتی ہے کہ ہر دو خاندان اصلاً ہندو تھے لیکن خاندان کے کچھ افراد ہندو مت ترک کر کے سکھ مت قبول کر چکے تھے اور سکھ مت کی قبولیت کی پشت پر بھی توحید کا جذبہ تھا۔ کیونکہ انگریز کی آمد کے بعد جب انگریز حکمرانوں کے جلو میں عیسائی مشنری اور مبلغین آئے تو ہمارے ہاں کے مذاہب اور عقائد میں ان کی مزاحمت میں خاصی توڑ پھوڑ شروع ہوئی تھی

یہی وہ زمانہ تھا جب ہندو مت میں خدا کی وحدانیت کی تحریکیں ابھرنی شروع ہوئیں چنانچہ اسی زمانہ میں آریہ سماج کی تحریک نے ہندوؤں میں جنم لیا۔ جب مسلمانوں میں سرسیّد کی تحریک اُبھری اور اسی دور میں دیوبند کی بنیاد رکھی گئی۔ غرضیکہ یہ دور ایسا تھا جس میں مختلف مذاہب اصلاحی تحریکیں ابھرنے لگی تھیں، اسی اصلاح کے جذبے نے ہندوؤں کو سکھ مت کی طرف مائل کرنا شروع کر دیا تھا کیونکہ سکھ مت میں خدا کی وحدانیت کو تسلیم کیا گیا تھا اور بت پرستی کو ممنوع قرار دیا گیا تھا اور یہی بت پرستی سے ایک گونہ نفرت ان خاندانوں کو ہندو مت سے سکھ مت کی طرف لے گئی۔ چنانچہ مولانا احمد علی کے والد شیخ حبیب اللہ کے والد کے متعلق روایت بیان کی جاتی ہے کہ ان کا خاندان جو پہلے ہندو تھا اسی وجہ سے سکھ ہو گیا تھا۔ اور صرافے کا کام کرتا تھا۔ مولانا احمد علی کے والد اپنی جوانی میں اسی کاروبار کے سلسلے میں کلکتے گئے وہاں وہ بیمار پڑ گئے تو اس دوران ایک مسلمان نے ان کی خدمت کی اور اس نے دوا دارو پلایا تو صراف جو ہندو تھا اس نے بہت لعن طعن کی کہ تم مسلمان کے ہاتھ سے دوائی وغیرہ پی لیتے ہو، اس پر مولانا احمد علی کے والد نے احتجاج کیا اور اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ پھر بعد میں اپنے گاؤں آکر دوبارہ انھوں نے باقاعدہ قبول اسلام کیا۔ اس پر جب گاؤں کے ہندو سکھوں نے ناک منہ چڑھایا تو گاؤں کے ہی ایک مسلمان نے ان کو بیٹا بنا لیا اور اپنی بیٹی ان کے عقد میں دیدی۔

شیخ التفسیرؒ کے نام

مولانا عبید اللہ سندھی کا خط

عزیزم

[illegible] آج میں لکھ نہ ڈاک میں مکہ حامل رقعہ
آپ سے ملنے کے لئے آرہا ہے — وہ اپنی تکلیف قلبیہ
لئے آپ سے استفادہ چاہتا ہے ۔ اس کے حال پر
توجہ کریں —

تمہاری بیماری عرصہ دراز کی ہے ۔ اگر طبیعت صبر
کر سکتی ہے ۔ تو اسی مکفر سیئات و ذریعہ ترقی
درجات سمجھیں ۔ اور اگر طبیعت عاجز آگئی ہے
تو کوئی امر مقرب الی اللہ بطور نذر اپنے نفس پر
لازم بنالیں — جیسے یعقوب علیہ السلام نے لحم ابل
ترک کیا تھا — وہ غذا انہیں مرغوب تھی اس کی بجائے
وہ فقراء کو کھلاتے اور خود نہ کھاتے تھے —
اسی طرح اپنی مناسب حال کوئی نذر مقرر کرلیں
تو اللہ کے فضل سے امید ہے ۔ کہ مرض دور
ہو جائیگا ۔

اللہ رب العزۃ تمہیں اپنی کتاب کے پڑھانے پر
فہم وسیع عطا فرمائی اور استقامت بخشے
واللہ ولی التوفیق ۔ والسلام

۱۰ / دسمبر ۱۹۴۴ء } عبید اللہ
دین پور ۔

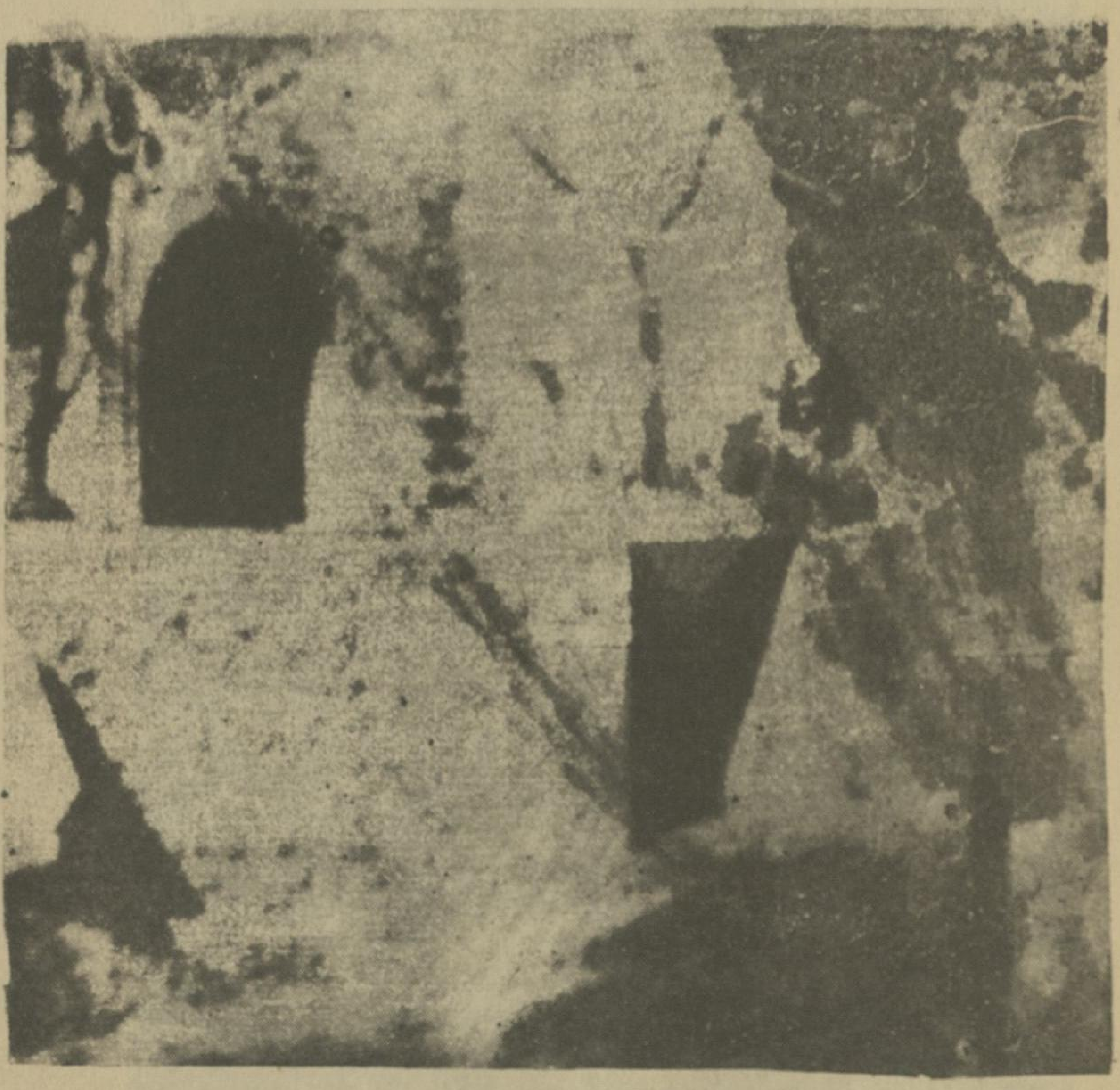
شیخ التفسیر کا عکسِ تحریر

بعزیز القدر [illegible] سلمہ

از احقر الانام احمد علی عفی عنہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ عزیزم! خط ملا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں عالم باعمل
بنائے۔ آمین۔ بیٹا تکلیفیں اٹھا کر ہی انسان کمال حاصل کر سکتا ہے۔ مجھے بھی ماں باپ نے بچپن ہی میں
سندھ بھیج دیا تھا۔ سالہا سال تک ماں باپ اور بھائی بہنوں کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کا نتیجہ
دیکھ لو۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل اور احسان ہے۔ تم تو ابھی عید الفطر کے بعد گئے ہو۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ
شعبان میں آجاؤ گے۔ تمہیں تو باقاعدہ خرچ گھر سے دیا جاتا ہے۔ مجھے تو کچھ بھی نہیں ملتا تھا۔
فقر و فاقہ ہی میں زندگی بسر ہوتی تھی۔ مجھے تو ایک پائی بھی روزانہ خرچ کے لئے نہیں ملتی تھی۔ تمہیں
تو چار پیسے روزانہ ملتے ہیں۔ مجھے تو طالب علمی میں دو وقت دال بھی میسر نہیں تھی۔ تم تو روزانہ
گوشت کھاتے ہو۔ اپنے خدا تعالیٰ کا شکر کرو۔ اور محنت کرکے پڑھو۔ کامیاب ہو جاؤ گے۔ زندگی
سنور جائیگی۔ دیندار ہو جاؤ گے۔ دین کی سمجھ ہوگی۔ دنیا میں عزت سے رہو گے۔ آخرت میں دوزخ
سے بچ جاؤ گے۔ دیکھ لو۔ مولوی حبیب اللہ سلمہ اب عالم ہے۔ لیکن یہ کمال گھر میں بیٹھ کر حاصل نہیں ہوا۔ آٹھ
سال دیوبند میں رہے۔ تم بھی کوئی تکلیف ہے۔ تو گھبرایا نہ کرو۔ بہادر بچے کبھی نہیں گھبراتے ہیں۔ بزدل
گھبراتے ہیں۔ بہادر کامیاب ہوتے۔ بزدل کا کام رہ جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی تکلیف ہے۔ تو حضرت
مولانا ظہور الحق صاحب دام مجدہم کے مشورے سے کسی طبیب سے علاج کراؤ۔ جو خرچ ہو اس سے مجھے اطلاع دو
وہ انشاء اللہ تعالیٰ آگے بھیج دونگا۔ بھائی محمد اسحاق سلمہ کو علاج کی تجویز کرنے کیلئے ساتھ لے جانا۔
تمہاری والدہ اور حمید اللہ اور رقیہ بی بی اور دوسرے سب عزیز و اقارب خیریت سے ہیں۔ سب کو سلام مسنون۔
بخدمت حضرت ناظم صاحب دام مجدہم و حضرت مولانا ظہور الحق صاحب دام مجدہم بعد اسلام مسنونہ معروض باد۔

بعزیز القدر محمد اسحاق سلمہ

از احقر الانام احمد علی عفی عنہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ الحمد للہ کہ آپ عزیز بخیریت مع سامان
کے پہنچ گئے۔ عزیز القدر عبید اللہ سلمہ کی دلجوئی کا خیال رکھیں۔ سیر کیلئے بھی ضرور لے جایا کرو۔ ہو سکے
تو ورزش بھی ضرور کیا کرو۔ تاکید ہے۔ تاکہ صحت بحال رہے۔ جسکی صحت ٹھیک نہ ہو۔ وہ علمی کمالات بھی
حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لئے تینوں بھائی۔ (محمد اسحاق۔ عبد الرزاق۔ عبید اللہ) سیر کیلئے نماز عصر کے
بعد ضرور جایا کرو۔ عزیز القدر عبد الرزاق سلمہ اور محمد اسحاق کیلئے مزید سلام مسنون۔
ماشاء اللہ حمید اللہ سلمہ روزانہ امیر پہلوان کے اکھاڑے میں جاتا ہے۔ اسکی صحت بڑی اچھی ہے۔





باب ۲

مولانا احمد علی

مولانا عبید اللہ سندھی

کی تربیت میں

فطرتِ آدم میں تھی کیا نشو و نما
ایک مُٹھی خاک یوں پھیلی کہ دنیا ہوگئی

— ثاقب لکھنوی

مولانا احمد علی کی شخصیت، ان کا زہد، ان کا تقویٰ اور ان کی شہنشاہیت کے خلاف جدّ وجہد، ان کا جیل جانا، ان کی سادگی، ان کی کھدّر پوشی یہ سب خصوصیات ایک طویل سلسلے کی کڑیاں ہیں ایک فکر کا تسلسل ہیں، ایک ایسے فکر کا جس کو اس برصغیر کے مخصوص مادی حالات نے جنم دیا مولانا احمد علی کو اس سلسلے کی لڑی میں پرونے والی پہلی شخصیت خود مولانا عبید اللہ سندھی کی تھی اور مولانا عبید اللہ سندھی کی شخصیت کی چھاپ مولانا احمد علی پر مرتے دم تک رہی، اس لیے مولانا احمد علی کے کسی بھی سوانح نگار کے لیے یہ لازم ولابد ہو جاتا ہے کہ وہ مولانا کی شخصیت کو، ان کے طور طریقوں، ان کی تعلیمات کو، ان کی نفس کشی کو سمجھنے کیلئے مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا عبید اللہ سندھی کے اندر چھپے ہوئے باغی کو جاننے اور سمجھنے کیلئے اس پورے دور کو قریب سے دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اصل میں مولانا عبید اللہ سندھی ہی وہ ذریعہ ہے جس نے مولانا احمد علی کو دبستان شاہ ولی اللہ اور دبستانِ دیوبند سے منسلک کیا۔ اس طرح سے مولانا احمد علی ایک طویل اور جاندار سلسلہ فکر وعمل کی ایک اہم کڑی ٹھہرے یہ چھاپ کتنی گہری ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج بھی مولانا احمد علی کا خانوادہ اسی فکر وعمل

کو آگے بڑھانے میں ہمہ تن مصروف ہے اور مولانا احمد علی کے صاحبزادے مولانا عبیداللہ انور اپنے دادا اور بزرگ مولانا عبیداللہ سندھی کے صرف ہم نام ہی نہیں بلکہ ان کے فکر کے شارح بھی ہیں اسی لیے وہ بہت سے ہمعصروں اور علمائے دین کی آنکھوں میں کھٹکتے بھی ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی کی پیدائش کا سال ۱۸۷۲ء ہے، یہ مارچ کا مہینہ ہے اور ۱۰ تاریخ تھی پنجاب کے ضلع سیالکوٹ کے ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کا کیا نام رکھا گیا اس کے متعلق تاریخ خاموش ہے لیکن اتنا معلوم ہے کہ اس سکھ لڑکے کی پیدائش سے پہلے ہی اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ چنانچہ لڑکے کی پیدائش پر بیوہ ماں کے غمزدہ چہرے پر مسرت کی لکیریں ابھر آئیں۔ اس نے اپنے مذہب اور روایت کے مطابق پرماتما کا شکر ادا کیا کہ اس کی بیوگی کا سہارا مل گیا۔ کیونکہ ماں بیوہ تھی اس لیے وہ اپنے بھائی کے پاس ضلع ڈیرہ غازیخاں کے شہر جام پور چلی گئی۔ اس کا بھائی پٹواری تھا اور اس کی تعیناتی اسی جامپور میں تھی چنانچہ سکھ لڑکے کی پرورش اپنے ماموں کے ہاں جام پور میں ہی ہوئی۔ اور یہ لڑکا جب ذرا بڑا ہوا تو اسکو وہیں کسی اسکول میں داخل کرا دیا۔

ضلع ڈیرہ غازی کو یوں تو برطانیہ نے اپنے انتظامی امور کے لیے پنجاب کا حصہ قرار دے رکھا تھا۔ لیکن آبادی کے لحاظ سے اس میں بلوچوں کی آبادی زیادہ تھی اور اس کی ویسے بھی سرحدیں ایک طرف سندھ سے تو دوسری طرف بلوچستان سے ملی ہوئی تھیں۔ اور یہاں کی کثیر آبادی کا حصہ مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ یہاں ہندو اور سکھوں کی آبادی خال خال تھی ویسے بھی اس علاقے میں پیروں اور فقیروں کا بڑا چرچا تھا۔ کئی ایک مشہور عالم صوفیاء کے مزار یہاں پر ہیں۔ اور ان کی وجہ سے یہاں پر پیروں فقیروں کا چرچا کچھ زیادہ ہی ہوتا تھا۔ اس ماحول میں اس سکھ لڑکے کے ابتدائی سال گزرے اور ان ابتدائی سالوں میں ہی اس کو زبردست کش مکش کا سامنا کرنا پڑا اس کا گھرانہ سکھ تھا۔ لیکن گھر سے باہر کی فضا پر مسلمانوں کی اور اسلامی روایات کی چھاپ بہت نمایاں تھی۔ چنانچہ اس کو سکھ مت اور اسلام کے اثرات کا عملی زندگی میں تقابل کرنا پڑا۔ اور بالآخر اس ننھے سے لڑکے نے محسوس کیا کہ جن چیزوں کو، جن اصولوں کو، جن تعلیمات کو وہ دل سے ٹھیک سمجھتا ہے وہ سکھ اور ہندوؤں کے ہاں نہیں بلکہ مسلمانوں کے ہاں ملتی ہیں۔ یہ نتائج اس نے خود اپنے مشاہدے، اپنے تجربے اور مسلمان لڑکوں کے ساتھ روزمرہ کے ملاپ سے اخذ کیے تھے۔ اس کو نہ تو کسی عالم دین کے وعظ نے متاثر کیا

اور نہ ہی کسی پیر فقیر کی کہی ہوئی باتوں پر اس نے آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا تھا بلکہ اس کے اپنے تجربے کی شدت نے اس کو متاثر کیا۔ یہ کشمکش تھی جو اس ننھے سے بچے کا مقدر ٹھہری یقینی طور پر اس نے کئی راتیں آنکھوں میں کاٹی ہوں گی، راتوں کو جاگتا رہتا اور سوچتا رہتا ہفتوں اور مہینوں اس نے اسی شش و پنج میں گزار دیے ہوں گے۔ باپ دادا کے مذہب کو تیاگنا کوئی آسان کام نہیں، صدیوں کی روایت سے منہ موڑنا، اپنے بہن بھائیوں عزیز و اقارب سے ناطہ توڑنا کوئی معمولی دل گردے کا کام نہیں اور پھر ایک ننھی سی جان کے لیے جس نے ابھی زمانے کا گرم سرد پوری طرح چکھا ہی نہ ہو۔ کیونکہ وہ اگر اپنے دل و دماغ کی بتائی ہوئی راہ پر چلتا ہے اور اسلام قبول کر لیتا ہے تو ماں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ بہنوں کے پیار کو تیاگنا پڑتا ہے، ماموں سے قطع تعلق کرنا پڑتا ہے اور پورے خاندان سے یکسر رشتے ختم کرنے پڑتے ہیں۔ اس سکھ لڑکے کی زندگی میں یہ پہلا جذباتی بحران تھا۔ جس میں وہ ایک مدت پھنسا رہا اور بالآخر ایک صبح اس نے تمام زنجیریں توڑ ڈالیں۔ تمام رشتے منقطع کر دیے، پورے خاندان سے منہ موڑ لیا اور گھر کو خیرباد کہہ دیا، نہ ماں کو بتایا، نہ ماموں کو اپنے اعتماد میں لیا۔ اور اپنے گھر اور اپنے خاندان کو خیرباد کہہ دیا۔

یہ اس کی پہلی بغاوت تھی، اس نے تمام مروجہ روایات، تمام مسلمہ بندھنوں اور تمام دنیا وی رشتوں سے لاتعلقی کر کے اپنی راہ لی۔ وہ گھر سے بھاگ نکلا۔ اس کو ان تمام رشتوں نے پکارا ہوگا۔ جذبات میں تلاطم بپا ہوا ہوگا۔ خاندان کی محبت اور ماں کی مامتا نے اسے پکارا ہوگا۔ ممکن ہے قدم بھی ڈگمگائے ہوں، لیکن یہ سکھ لڑکا واپس نہیں لوٹا، وہ آگے ہی بڑھتا گیا آخر چلتے چلتے صوبہ سندھ میں وہ داخل ہو گیا۔ یہیں اس نے حافظ محمد صدیق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کیا مولانا عبیداللہ سندھی نے خود ہی اپنی ابتدائی زندگی پر قلم اٹھایا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"میں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں چیانوالی میں پیدا ہوا، ہمارے خاندان کا اصل پیشہ زرگری ہے لیکن عرصہ سے ایک حصہ سرکاری ملازمت میں شامل ہو گیا، اور بعض افراد ساہوکارہ بھی کرتے رہے۔ میں عموماً حضرت سلمان فارسیؓ کے اتباع میں اپنا نام عبیداللہ بن اسلام لکھا کرتا ہوں۔ مگر بعض عرب دوستوں کے اصرار سے والد کی طرف اصرار کر کے لکھنا پڑا

تو عبیداللہ بن ابی عائشہ لکھا۔میری بڑی ہمشیرہ کا نام جیونی" تھا۔میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ اگر کسی نے اس سے زیادہ تشریح کے لیے کہا تو عبیداللہ ابن راما بن رائے لکھوں گا۔ میرے باپ دادا کا پورا نام رام سنگھ ولد جسپت رائے ولد گلاب رائے ہے. کہتے ہیں کہ میرے دادا سکھ حکومت میں اپنے گاؤں کے کاردار تھے۔"

مولانا اپنی اس ابتدائی خود نوشت سوانح میں اپنی پیدائش اور یتیمی کے متعلق ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔" میں بشب جمعہ قبل صبح ۱۲ محرم ۱۲۸۹ ہجری مطابق ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ عیسوی میں پیدا ہوا۔میرا باپ چار ماہ پہلے فوت ہو چکا تھا۔ دو سال بعد دادا بھی مرگیا۔ تو میری والدہ مجھے ننھیال لے آئی۔ یہ ایک خالص سکھ خاندان تھا۔میرے نانا کی ترغیب پر ہی میرا والد سکھ بن گیا تھا۔میرے دو ماموں جام پور ڈیرہ غازی خاں میں پٹواری تھے، جب نانا فوت ہوئے تو ہم ان کے پاس چلے آئے، میری تعلیم ۱۸۷۸ عیسوی سے جام پور کے اردو مڈل سکول میں شروع ہوئی ۱۸۸۷ء میں مڈل کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا کہ اظہارِ اسلام کیلئے گھر چھوڑ دیا۔اس دوران میں دو سال کے لیے میں ضلع سیالکوٹ میں رہا۔ اس لیے ایک سال اپنی جماعت سے پیچھے رہ گیا۔ ورنہ اپنے اسکول میں شروع سے ممتاز طالب علم مانا جاتا تھا۔"

اسلام کی طرف رجوع کا ذکر کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:۔"۱۸۸۴ء میں مجھے اسکول کے ایک آریہ سماجی لڑکے کے توسط سے "تحفۃ الہند" ملی۔ اس کے مسلسل مطالعہ میں مصروف رہا اور بالتدریج اسلام کی صداقت پر یقین بڑھتا گیا۔ ہمارے قریب کے پرائمری اسکول (کوٹلہ مغلاں) سے چند دوست بھی مل گئے جو میری طرح تحفۃ الہند کے گرویدہ تھے۔ انہی کے توسط سے مجھے مولانا اسماعیل شہید کی "تقویۃ الایمان" ملی، اس کے مطالعہ پر اسلامی توحید اور پرانک، شرک اچھی طرح سمجھ میں آگیا۔ اسکے بعد مولوی محمد صاحب لکھو کی کتاب احوال الآخرت پنجابی ایک مولوی سے ملی۔ اب میں نے نماز سیکھ لی۔ اور اپنا نام تحفۃ الہند کے مصنف کے نام پر عبیداللہ خود ہی تجویز کیا۔

احوال الآخرت کا بار بار مطالعہ اور تحفۃ الہند کے مصنف جس میں نومسلموں کے حالات لکھے ہیں۔ یہی دو چیزیں جلدی اظہار اسلام کا باعث بنیں ورنہ اصلی ارادہ یہ تھا کہ جب کسی ہائی سکول میں اگلے سال تعلیم کے لیے جاؤنگا تو اس وقت اظہارِ اسلام کروں گا۔

۱۵ اگست ۱۸۸۷ء کو توکلّ علی اللہ نکل کھڑا ہوا۔ میرے ساتھ کوٹلہ مغلاں کا ایک رفیق عبد القادر تھا۔ ہم دونوں عربی مدرسہ کے ایک طالب علم کے ساتھ کوٹلہ رحم شاہ ضلع مظفر گڑھ میں پہنچے۔ ۹ ذی الحجہ ۱۳۰۴ ہجری کو میری سنت تطہیر ادا ہوئی۔ اس کے چند روز بعد جب میرے اعزہ تعاقب کرنے لگے تو میں سندھ کی طرف روانہ ہو گیا۔ عربی صرف کی کتابیں میں نے راستہ میں اس طالب علم سے پڑھنا شروع کر دی تھیں۔ اللہ کی خاص رحمت سے میں حضرت حافظ محمد صدیق بھرچونڈی والے کی خدمت میں پہنچ گیا جو اپنے وقت کے جنید اور سید العارفین تھے چند ماہ ان کی صحبت میں رہا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرت میرے لیے طبیعت ثانیہ بن گئی۔ جس طرح ایک پیدائشی مسلمان کی ہوتی ہے۔ حضرت نے ایک روز میرے سامنے اپنے لوگوں کو مخاطب فرمایا۔ غالباً مولانا ابوالحسن امروٹی بھی اس مجمع میں موجود تھے کہ عبیداللہ نے اللہ کے لیے اپنے ماں باپ کو چھوڑا۔ اس لیے اب اس کے ماں باپ ہم ہیں اس حکم مبارک کی تاثیر خاص میرے دل میں محفوظ ہے۔ میں انھیں اپنا دینی باپ سمجھتا ہوں اور اسی لیے سندھ کو مستقل وطن بنایا یا بن گیا۔ میں نے قادری راشدی طریقہ میں ان سے بیعت کر لی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے انسان سے بہت کم مرعوب ہوتا ہوں۔ میں چار ماہ بعد طالب علمی کے لیے رخصت ہوا۔ مجھے بتایا گیا کہ حضرت نے میرے لیے خاص دعا فرمائی۔ خدا کرے عبیداللہ کا کسی راسخ عالم سے پالا پڑے۔ میرے خیال میں خدا نے یہ دعا قبول فرمائی اور اللہ رب العزت نے محض اپنے فضل سے مجھے حضرت مولانا شیخ الہند کی خدمت میں پہنچا دیا۔

بھرچونڈی سے رخصت ہو کر میں اس طالب علم کے ساتھ ریاست بہاول پور کی دیہاتی مسجد میں ابتدائی عربی کتابیں پڑھتا رہا۔ اس نقل و حرکت میں دین پور پہنچا جہاں

سید العارفین کے خلیفہ اول مولانا ابو السراج غلام محمد صاحب رہتے تھے۔ ہدایۃ النحو تک کتابیں میں نے یہیں مولانا عبد القادر سے پڑھیں۔ حضرت خلیفہ صاحب نے میری والدہ کو خط لکھوایا۔ وہ آگئیں اور واپس جانے کے لیے بڑا زور لگایا۔ مگر میں ثابت قدم رہا۔ شوال ۱۳۰۵ ہجری میں میں دین پور متصل خان پور سے کوٹلہ رحم شاہ چلا آیا اور مولوی خدا بخش صاحب سے کافیہ پڑھا۔ یہیں ایک نو وارد طالب علم سے ہندوستانی مدارس عربیہ کا حال معلوم ہوا اور میں اسٹیشن مظفر گڑھ سے ریل پر سوار ہو کر سیدھا دیوبند پہنچا۔ یہاں پہلے دو تین مہینے تک مولانا حافظ احمد صاحب سے پڑھتا رہا۔ اس کے بعد مولانا شیخ الہند کے دروس میں شامل ہو گیا۔ ۱۳۰۷ ہجری کو ہدایۃ، تلویح، مطول، شرح عقائد، مسلم الثبوت میں امتحان دیا اور امتیازی نمبروں میں کامیاب ہوا۔ مولانا سید احمد صاحب دہلوی مدرس اوّل نے میرے جوابات کی بہت تعریف کی۔ فرمایا اگر اس کو کتابیں ملیں تو شاہ عبد العزیز ثانی ہو گا۔ چند دوستوں نے مبشرا خواب دیکھے۔ میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کو بھی خواب میں دیکھا۔ رمضان شریف میں اصول فقہ کا ایک رسالہ لکھا جسے حضرت شیخ الہند نے پسند فرمایا۔ اس میں بعض مسائل اس طرح پیش کیے کہ جہاں اہلِ علم محققین کی رائے کو ترجیح دی۔"

مولانا عبید اللہ سندھی کی خود نوشت سوانح کے طویل اقتباسات دینے کا مقصد یہ ہے کہ اس شخصیت کی ابتدائی زندگی اور قبول اسلام کا پس منظر پڑھنے والوں کے سامنے رہے۔ کیونکہ مولانا عبید اللہ کی شخصیت اور مولانا عبید اللہ نے جن شیوخ اور جن اہلِ علم سے تعلق قائم کیا وہی مولانا احمد علی کے شیوخ ٹھہرے اور وہی اہل علم مولانا احمد علی کے تمام عمر راہبر و رہنما رہے اور یہ مولانا عبید اللہ ہی تھے جنھوں نے مولانا احمد علی کو شاہ ولی اللہ کے سلسلہ سے وابستہ کیا اور یہ مولانا عبید اللہ ہی تھے جنھوں نے مولانا احمد علی کو شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے حلقۂ عقیدت میں شامل کیا۔ اور مولانا عبید اللہ ہی تھے جنھوں نے مولانا احمد علی کو سیاست کی وادیٔ پرخار میں لا کھڑا کیا۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی نے جب اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کو بچپن میں ہی تیاگ کر اپنے نابغہ روزگار ہونے کا سکہ منوا لیا تھا اور

جس تیزی اور سرعت کے ساتھ انھوں نے اسلامی تعلیمات حاصل کیں اس سے ان کے اندر چھپے ہوئے ایک عظیم انقلابی اور متحرک انسان کا پتہ چلتا ہے۔ کہنے کو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک سکھ لڑکے نے اپنا مذہب بدل لیا اور وہ سکھ سے مسلمان ہو گیا۔ لیکن صرف اتنی حقیقت نہیں ہے اور نہ ہی صرف یہیں تک محدود ہے۔ بلکہ سچائی یہ ہے کہ اس لڑکے کے اندر "حق" اور "سچ" کو جاننے کے لیے اور اس کو پانے کے لیے ایک بے پناہ جذبہ موجزن تھا اور اسی جذبے نے اسے ورثے میں ملے ہوئے مذہب اور اس کی روایات کی حدود کو تنگ بنا دیا۔ اور اس نے ان حدود کو توڑ ڈالا، سکھ مت کو خیر باد کہہ دیا اور سکھ مذہب کا جو لباس اسکو تنگ کر رہا تھا وہ اس نے اتار پھینکا اور اسلام جو اس کے لیے کشادگی، فراغت اور نئی دنیا کی نشاندہی کر رہا تھا۔ وہ اس نے قبول کر لیا چنانچہ مولانا عبیداللہ سندھی نے تمام عمر سچ اور صدق کی تلاش میں گزار دی۔ اس کو جب بھی کوئی تعلیم، کوئی روایت، کوئی ورثہ تنگ محسوس ہوا اس نے اس کو اتار پھینکا اور اس کے خلاف بغاوت کر دی۔

مولانا عبیداللہ سندھی قریب قریب ۱۸ برس کی عمر میں دیوبند پہنچے، یہ ۱۸۹۰ عیسوی کا زمانہ تھا دیوبند میں مولانا نے تقریباً سال ڈیڑھ سال قیام کیا اور پھر سندھ لوٹ آئے۔ چنانچہ اپنی خود نوشت سوانح میں لکھتے ہیں۔

"شوال ۱۳۰۷ ہجری سے تفسیر بیضاوی اور دورہ حدیث میں شریک ہوا۔ جامع ترمذی حضرت مولانا شیخ الہند سے پڑھی اور سنن ابی داؤد کے لیے حضرت مولانا رشید احمد صاحب کی خدمت میں گنگوہ پہنچا، بیمار ہو کر گنگوہ سے دہلی آیا۔ حکیم محمود خاں کے علاج سے افاقہ ہوا۔ حدیث کی باقی کتابیں مولوی عبدالکریم صاحب پنجابی دیوبندی سے جلد جلد ختم کیں مجھے یاد ہے کہ سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ میں نے چار چار دن میں پڑھی ہیں اور سراجی دو گھنٹہ میں ختم کی۔ مولوی صاحب حضرت مولانا قاسم اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب کے غیر معروف محقق شاگرد تھے۔ اثنائے قیام دہلی میں دو دفعہ حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب کی زیارت کے لیے گیا۔ صحیح بخاری اور جامع ترمذی کے دو سبق سنے۔"

۲۰ جمادی الثانیہ کو دہلی سے سیدھا پھر چونڈی ضلع سکھر پہنچا۔ میرے مرشد میرے آنے سے دس دن پہلے وفات پا چکے تھے۔ رجب ۱۳۰۸ ہجری میں حضرت شیخ الہند نے اجازت نامہ تحریر فرما کر بھیج دیا اور مولوی کمال الدین صاحب نے مجھ سے سنن ابی داؤد پڑھی۔ شوال ۱۳۰۸ ہجری سے سید العارفین کے دوسرے خلیفہ مولانا ابوالحسن تاج محمود صاحب کے پاس امروٹ ضلع سکھر میں چلا گیا۔ انھوں نے اپنے مرشد کا وعدہ پورا کر دکھایا۔ وہ میرے لیے بمنزلہ باپ تھے۔ میرا نکاح سکھر کے اسلامیہ سکول کے ماسٹر مولوی محمد عظیم خاں یوسف زئی کی لڑکی سے کرایا۔ میری والدہ کو بلایا وہ میرے پاس آخر وقت تک اپنے طرز پر رہیں، میرے مطالعہ کے لیے بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا۔ میں ان کے ظل عاطفت میں ۱۳۱۵ ہجری تک با اطمینان مطالعہ کرتا رہا۔"

ایک روایت ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی جب ننھے احمد علی کو اپنے ہمراہ لے کر امروٹ جا رہے تھے تو راستے میں دین پور میں قیام کیا تو حضرت دین پوری نے ننھے احمد علی کو دیکھ کر پہلی نظر میں ہی اپنے نورِ فراست سے بھانپ لیا کہ آئندہ چل کر یہ گوہر یکتا کس درجہ کا انسان بننے والا ہے۔ چنانچہ آپ نے خود ہی از راہِ شفقت ننھے احمد علی کو سلسلہ قادریہ میں بیعت فرما لیا اور اللہ کے نام کی تلقین کی۔ مولانا احمد علی بعد میں کہا کرتے تھے کہ وہ اسوقت بیعت کے مفہوم تک سے ناآشنا تھے، اور یوں حضرت کی تعلیم کتاب اللہ و تزکیۂ باطن دونوں ساتھ ساتھ شروع ہوئے لطف یہ ہے کہ بیعت کے وقت ننھے احمد علی کی عمر فقط نو سال کی تھی اور یہ ۱۸۹۵ء کا واقعہ بتایا جاتا ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے امروٹ کے اپنے قیام کے دوران رشد و ہدایت کے لیے اپنے مخصوص طریقوں کو یہیں بیٹھ کر عملی جامہ پہنایا۔ چنانچہ اس ضمن میں مولانا سندھی لکھتے ہیں۔

"امروٹ واپس آکر میں نے مطبع قائم کیا اور دو سال تک چلایا۔ بعض عربی اور سندھی کتابیں جو نایاب تھیں طبع ہوئیں۔ اس کے بعد مدرسہ بنانے کی کوشش جاری کی مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ہمارا کام مدرسہ کے بغیر چل ہی نہیں سکتا تھا اس

کے لیے دوسری جگہ کی تلاش میں تھا کہ حضرت مولانا راشد اللہ صاحب العلم الرابع نے ۱۳۱۹ ہجری میں میری تجویز کے موافق مدرسہ بنانے کا ارادہ کیا اس کا نام دارالارشاد گوٹھ پیر جھنڈا بھی میری تجویز سے مقرر ہوا۔ میں اس میں شریک ہوا اور سات سال علمی اور انتظامی کامل اختیارات کے ساتھ کام کرتا رہا۔ اکابر علماء میں سے حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا شیخ حسین بن محسن انصاری یمانی امتحان کے لیے تشریف لائے اس مدرسہ میں بھی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت خواب میں کی اور امام مالک کو بھی خواب میں دیکھا۔

اسی زمانے میں مولانا سندھی نے خود ہی احمد علی کو فارسی اور عربی کی ابتدائی صرف و نحو پڑھانی شروع کی اور جب مدرسہ دارالارشاد قائم ہوا تو مولانا احمد علی کو بھی اپنے ساتھ لے گئے جہاں مولانا احمد علی نے چھ سال کے عرصہ میں درس نظامی کی تکمیل کر لی۔ چنانچہ مولانا سندھی کے اس مدرسہ سے فارغ التحصیل ہونے والی جماعت میں پانچ طلباء تھے۔ ان میں مولانا احمد علی کے علاوہ حضرت پیر راشد اللہ کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا ضیاء الدین صاحب جو بعد میں گوٹھ پیر جھنڈا کے گدی نشین بھی ہوتے تھے، چنانچہ اس جماعت کی دستار بندی کے لیے سجادہ نشین گوٹھ پیر جھنڈا نے جلسہ منعقد کیا۔ اس کی صدارت کے لیے شیخ حسین بن محسن انصاری یمنی کو ریاست بھوپال سے بلایا گیا یمن کے مشہور عالم شیخ حسین بن محسن انصاری اہلِ علم کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کو نواب بھوپال نے درس و تدریس کے لیے اپنی ریاست میں مدعو کیا اور یہ معہ اہل و عیال کے بھوپال منتقل ہو گئے تھے۔ جب شیخ حسین بن محسن اس دستار بندی کے جلسے کی صدارت کے لیے گوٹھ پیر جھنڈا آئے تو وہ بہت ضعیف ہو چکے تھے اور عمر رسیدہ تھے اور وہ بغیر کسی سواری کے چل پھر نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ ان کو پالکی میں بٹھا کر اسٹیشن سے گوٹھ پیر جھنڈا لایا گیا۔ مولانا احمد علی کی یادداشت کے مطابق دستار بندی کی یہ تقریب ۱۳۲۶ ہجری کے آخر یا ۱۳۲۷ ہجری کے ابتداء میں منعقد ہوئی تھی۔

دستار بندی کی تقریبات کے خاتمہ پر مولانا سندھی نے مولانا احمد علی کو اپنے اسی مدرسہ

دارالارشاد میں مدرس مقرر کر دیا۔ یہاں آپ نے تین سال درسِ نظامی کی تعلیم دی۔ مولانا سندھی کو یہ نوجوان احمد علی کتنا عزیز تھا۔ اور اس سے کتنی جذباتی وابستگی تھی اسکا اظہار اسی زمانے میں ہوا۔ چنانچہ مولانا سندھی نے اپنی صاحبزادی مریم بی بی کا عقد آپ سے کر دیا۔ لیکن شادی کے تقریباً ایک سال بعد ان کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام حسن رکھا گیا۔ مگر یہ بچہ ابتدائی دنوں میں ہی مر گیا اور اس کے ساتھ ہی مولانا کی پہلی بیوی کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان دونوں کے مزار گوٹھ پیر جھنڈا میں ہیں۔ اور یہیں پر مولانا احمد علی کی والدہ بھی دفن ہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھی ۱۹۰۹ء میں دارالارشاد گوٹھ پیر جھنڈا کو چھوڑ چھاڑ دیوبند چلے گئے کیونکہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے مولانا عبید اللہ کو وہاں طلب کر لیا تھا اور اس کے بعد یہ مدرسہ دارالارشاد مولانا احمد علی کی رہنمائی میں ہی جاری رہا۔ مگر کچھ عرصہ بعد مولانا احمد علی نے بعض مصالح کے تحت اس مدرسہ دارالارشاد سے علیحدگی اختیار کر لی اور گوٹھ پیر جھنڈا شریف کو بھی خیرباد کہہ دیا۔ اس امر کی اطلاع مولانا عبید اللہ سندھی کو بھی دے دی اور ان کی ہدایت پر ہی مولانا احمد علی نے نواب شاہ میں ایک اور دینی مدرسہ کی بنیاد رکھی، اس مدرسہ میں مولانا عبید اللہ سندھی نے مولانا احمد علی کی امداد کے لیے اپنے دو عزیز شاگردوں مولانا عبد اللہ لغاری اور مولانا محمد صالح کو مامور فرمایا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ کیونکہ مولانا عبید اللہ سندھی نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے ایماء پر مولانا احمد علی کو بھی نواب شاہ سے دیوبند طلب کر لیا۔

نواب شاہ سے قطع تعلق اور دیوبند کو منتقلی مولانا احمد علی کی زندگی کے ایک دور کا خاتمہ تھا۔ اسوقت تک یہ دور کلیتہً درس و تدریس کا دور تھا۔ یہ علم و ریاضت کا زمانہ تھا۔ اس میں ذکرِ الٰہی ضرور تھا لیکن مسجد و مدرسہ کی حدود کے اندر۔ لیکن اب جو طلبی ہو رہی تھی وہ ایک نئے دور کی طرح ڈالنے کے لیے تھی۔ ایک نئے در کو وا کرنے کے لیے یہ بلاوا تھا۔ یہ اعلان تھا کہ بیسویں صدی میں برطانوی شہنشاہیت کو للکارنے کے لیے اپنی صفوں کو ترتیب دیا جائے۔ نئی راہیں ڈھونڈی جائیں۔ نئے طور طریقے اپنائے جائیں۔ جب مولانا

احمد علیؒ نے سرزمینِ سندھ کو خیرباد کہا اور عازم دیو بند ہوئے تو ان کو کچھ علم نہ تھا کہ مستقبل انھیں کس طرف لے جا رہا ہے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ان کے استاد مکرم اور بزرگِ محترم مولانا عبید اللہ سندھی کا حکم آیا ہے، اس زمانے میں اُستاد کا ایک اشارہ ہی کافی تھا چنانچہ مولانا احمد علی سب کچھ چھوڑ چھاڑ اور دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی موقع کے لیے مولانا حسرت موہانی نے کہا تھا۔

حکم پر ان کے جان دیتا ہوں
میں نہیں جانتا قضا کیا ہے

باب ۳

مولانا احمد علیؒ

دبستانِ دیوبند

سے وابستگی

مولانا احمد علی جس زمانے میں سندھ سے درس و تدریس کا سلسلہ منقطع کر کے اپنے استادِ محترم اور بزرگ مکرّم کی طلبی پر عازمِ دیوبند ہوئے تھے تو یہ زمانہ زبردست تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ یہ تبدیلیاں ایسی تیزی سے رونما ہو رہی تھیں کہ زندگی کے ہر گوشے میں ایک تلاطم بپا تھا، ایک ہیجان تھا، ایک کرب تھا۔ اس کرب کا اظہار صرف اس برصغیر کے اندر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ باہر کی دنیا بھی طوفانوں کی زد میں تھی۔ چنانچہ یہ وہ زمانہ تھا جب تقسیم بنگال کے بعد بنگال اور مہاراشٹر میں تشدد پسند انقلابیوں کی سرگرمیاں شروع ہو چکی تھیں، بم اور پستول سیاست میں داخل ہو چکے تھے۔ چنانچہ اسی سیاست ہی کا اثر تھا کہ انڈین نیشنل کانگرس کے اندر ملک کی قیادت میں ایک انتہا پسند گروہ منظم ہو رہا تھا، اور برطانوی اشیاء کے بائیکاٹ کا نعرہ پہلی بار سننے میں آ رہا تھا، اور یہی وہ زمانہ تھا جس کے متعلق سید ہاشمی فریدآبادی لکھتے ہیں۔

"خونین انقلاب کی تحریک لارڈ کرزن کی حکومت ۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۵ء کے خاتمے پر ہندوستان میں شروع ہوئی اس کا محرک اسی وائسرائے کی خودسری کو گردانتے ہیں فی الحقیقت رپن کے بعد جتنے وائسرائے آئے ملوکیت کے نشے میں سرشار تھے۔ کرزن

کے پیش رو (ایجن ۱۸۹۴ء تا ۱۸۹۸ء) کی نااہلی پر ناتجربہ کاری کا پردہ ڈالا گیا ہے لیکن سرحدی مہمات کا اسراف جان و مال، پھر اعلانیہ ڈینگیں کہ "ہندوستان کو ہم نے تلوار سے فتح کیا ہے تلوار ہی کے زور سے قبضہ رکھیں گے"۔ اس کی پرغرور ذہنیت کو بے نقاب کرتی ہیں۔ اسی کے عہد میں وبائے طاعون ۱۸۹۶ء اور قحط ۱۸۹۷ء کی آسمانی بلائیں برطانوی ہند میں نازل ہوئیں۔ وہم پرست عوام انہیں بھی سرکار کی بدنیتی، بلکہ انگریزوں کی لائی ہوئی مصیبت قرار دیتے تھے، تعلیم یافتہ لوگوں کو کرزن کے نئے یونیورسٹیز ایکٹ ۱۹۰۴ء نے مشتعل کیا۔ بنگالہ کی تقسیم ۱۹۰۵ء نے ہندوؤں کے تن بدن میں آگ لگا دی مشرقی بنگال کے علیحدہ صوبہ بن جانے سے توقع تھی کہ مسلم اکثریت قابوچی بابو کے پنجے سے اور حریص مہاجن کے پھندے سے نکلنے کا موقع پا جائیگی انگریز اب تھپک تھپک کر مسلمانوں کو مقابلے میں لانا چاہتے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں اکابرِ قوم کا بہت بڑا اجتماع ڈھاکے ہی میں ہوا۔ کل ہند کانگرس کے جواب میں کل ہند مسلم لیگ کی ترکیب یہیں دی گئی، لیکن جس مسلمان کو سو برس تک بنگالی دلہا بنائے رکھا اور ہندو سے ٹھوکریں لگوائی تھیں، وہ چند روز چوگا کھلانے سے پالی لڑنے کے قابل نہ ہو سکتا تھا۔ ادھر بڑے بڑے سرمایہ دار انقلابی خونیوں کی پرورش میں شریک تھے۔ یورپ خصوصاً پیرس میں انھیں بم بنانے کی تعلیم دی جاتی تھی، بندوق طمنچے کی مشق سرحدی پہاڑوں میں کرائی جاتی تھی۔ خفیہ اور اعلانیہ بہت سے داعی مقرر تھے کہ ہر حصۂ ملک میں نوجوانوں کو بھڑکاتے اور مذہب و وطن کے لیے جان دینے پر آمادہ کرتے تھے۔ رسائل و اخبار بیسویں صدی کے پہلے دہائے میں نکلے۔ گزشتہ پوری صدی میں بھی شائع نہ ہوئے ہوں گے۔ ان کا موضوع و مقصود عام طور پر انگریزوں سے نفرت سکھانا تھا۔ یہ زیادہ تر انگریزی زبان میں چھاپے جاتے تھے۔ اس کے بعد اردو بنگلہ، مرہٹی، اور دوسری دیسی زبانوں کی مطبوعات تحریک انقلاب کی حصہ دار تھیں، مگر ابھی تک مسلمان خال خال ہی میدان میں آتے اور بنگال میں ظاہر ہے کہ کوئی وہاں کی شورش و

سازش میں شریک نہیں ہوا۔"

یہ بہت حد تک درست ہے کہ مسلمان خال خال اس بم اور پستول کی سیاست میں ملوث ہوتے، لیکن وہ متاثر ضرور ہوئے۔ بالخصوص بین الاقوامی صورت حال نے ان کو بہت متاثر کیا۔ ایک طرف روس اور جاپان کی جنگ نے ان کے حوصلے بڑھائے۔ کیونکہ روس کو جاپان کے ہاتھوں شکست نے ان کو بہت مسرور و شادمان کیا۔ اس لیے کہ روس کی ترکوں اور خلافت عثمانیہ سے دشمنی مسلّمہ تھی اس لیے ترکوں کے دشمن کو جب ہزیمت اٹھانی پڑتی ہے تو یہ مسلمانان ہند کے لیے وجہ شادمانی بن جاتی ہے کیونکہ اب ان کے نزدیک مسلمانان عالم کی امیدوں کا مرکز صرف عثمانی حکومت ہی رہ گئی تھی اور پھر جب نوجوان ترکوں نے ۱۹۰۸ء میں سلطنتِ عثمانیہ میں شخصی حکومت کو الٹنے کی کوشش کی تو اس سے بھی ہندوستان کے لوگ متاثر ہوئے۔ یہ درست ہے کہ یہاں دو قسم کے اثرات مرتب ہوئے، ایک تو وہ گروہ تھا جس نے اس تبدیلی کی کوشش کو سراہا اور دوسری طرف وہ تھے جو خلیفہ کے تمام مظالم اور استبداد کے باوجود اس کے خلاف ہر کوشش اور ہر اقدام کو ملّت اسلامیہ کے لیے مہلک تصور کرتے تھے۔

یہ تھے حالات جن میں مولانا محمود الحسن شیخ الہند نے اپنے شاگرد مولانا عبید اللہ کو دیوبند طلب کیا اور پہلی بار مسلمانوں کی ایک ایسی تنظیم کرنے کا فیصلہ کیا جو مسلح ہو کر ملک کے اندر کی طاقتوں اور بیرونی طاقتوں کی مدد سے انگریزوں کی حکومت کا تختہ الٹ دے چنانچہ اس جماعت کا مقصد ملک اور بیرونِ ملک میں موجود فضلائے دیوبند کو منظم کرنا تھا۔ اس جمعیت کا نام جمعیۃ الانصار رکھا گیا۔ اس جمعیۃ کا قیام ۱۹۰۹ء میں عمل میں آیا۔ اور اس کے تحت پہلا عام اجتماع مراد آباد میں انعقاد پذیر ہوا۔ اس سے پہلے اس شہر میں اتنا بڑا اجتماع دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ اس کے ساتھ شیخ الہند کے ایما پر قرآن حکیم کی درس و تدریس کے لیے ایک اور مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اس مدرسے کا قیام دہلی کی مسجد فتح پوری میں عمل میں آیا اور اس مدرسہ کی داغ بیل میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے علاوہ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری بھی شامل تھے مولانا عبید اللہ کی سندھ میں غیر حاضری کے دوران میں دارالارشاد کی پوری ذمہ داری

حضرت مولانا احمد علی کے ہی سپرد رہی لیکن ۱۹۱۲ء کے لگ بھگ مولانا عبید اللہ سندھی دارالارشاد سے لاتعلق ہو گئے اور مولانا احمد علی کو بھی دہلی میں نظارۃ المعارف میں بلا لیا۔ یہ نظارۃ المعارف دراصل مجاہدین آزادی کی بھرتی کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ تاکہ مسلح انقلاب کے لیے راہ ہموار کی جائے، انگریز دشمنی اور عملی سیاست کی دستار دراصل مولانا کو یہیں اسی نظارۃ المعارف سے حاصل ہوئی اور پہلی گرفتاری بھی یہیں عمل میں آئی اور سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ گرفتاری اور نظربندی عمل میں نہ آتی تو لاہور شاید مولانا کی ذات برکات سے محروم ہی رہتا۔

پہلی گرفتاری

مولانا احمد علی جس زمانے میں سندھ کے دارالارشاد کو چھوڑ کر دہلی پہنچے تو وہ زبردست تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ یہ تبدیلیاں ایسی تیزی سے رونما ہو رہی تھیں کہ زندگی کے ہر شعبہ میں تلاطم بپا تھا صرف یورپ اور مشرق وسطیٰ ہی ان تبدیلیوں کی لپیٹ میں نہیں آ رہا تھا بلکہ خود اس غلام آباد میں بھی ایک انقلاب جنم لے رہا تھا۔ مسلمانان ہند میں بھی زبردست بے چینی کے آثار نمودار ہو رہے تھے، اس وقت تک مسلمانان ہند کی تمام تر توجہ خلافت عثمانیہ کی طرف لگی ہوئی تھی۔ اور یہاں کا مسلمان ذہنی طور پر خلافت عثمانیہ کا دم بھرتا تھا۔ چنانچہ اس وفاداری کو سب سے پہلا چیلنج ۱۹۱۲ء میں ملا جب بلقان کی ریاستوں کو برطانوی شہنشاہیت نے ترکی کے خلاف صف آرا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس جنگ نے مسلمان ہند کو شدید طور پر متاثر کیا۔ یہاں سے ترکوں کی مدد کے لیے وفد گئے، چندہ اکٹھا ہوا اور انگریزی حکومت کے خلاف غم و غصہ کا اظہار ہو رہا تھا کہ کانپور میں سڑک سیدھی کرنے کے لیے مسجد گرا دی گئی۔ اس مسجد کی حفاظت کے لیے مسلمانوں نے اپنے سینے پیش کر دیے اور فوج ان پر گولیاں برسانے لگ گئی۔ ان تحریکوں نے مسلمانوں میں بغاوت کی چنگاری کو شعلے میں تبدیل کر دیا اس فضا میں نظارت المعارف قائم ہوا۔ اس کے متعلق خود مولانا عبید اللہ سندھی لکھتے ہیں۔

"۱۹۰۹ء میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے مجھے دیوبند طلب کیا اور

مفصل حالات سن کر دیوبند رہ کر کام کرنے کا حکم دیا ۔ چار سال تک جمعیتہ الانصار میں کام کرتا رہا ۔ اس تحریک کی تاسیس میں مولانا محمد صادق صاحب سندھی، مولانا محمد صاحب لاہور اور عزیزی مولوی احمد علی میرے ساتھ شریک تھے ۔"

اس زمانے میں جب مولانا احمد علی دیوبند میں مقیم تھے تو مولانا عبید اللہ سندھی نے آپ کی دوسری شادی اپنے ایک عزیز دوست کی لڑکی کے ساتھ کرنے کی اجازت دے دی ۔ پہلی اہلیہ کی وفات کے بعد مولانا کے لیے بے شمار رشتے آئے لیکن مولانا عبید اللہ سندھی کو کوئی رشتہ پسند نہ آیا اسی دوران میں ضلع جہلم کے مشہور قصبہ چکوال کے مولانا ابو محمد احمد صاحب نے مولانا سندھی کو خط لکھا کہ وہ اپنی لڑکی کا رشتہ مولانا احمد علی سے کرنا چاہتے ہیں ۔

مولانا ابو محمد احمد دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور مولانا رشید احمد گنگوہی اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے شاگردوں میں سے تھے اور مولانا عبید اللہ سندھی کے ہم سبق رہ چکے تھے اور ان کے آپس میں بہت گہرے بھائی چارے کے تعلقات تھے ۔ اور اس وقت وہ لاہور میں کشمیری بازار کی ایک مسجد "موتی مسجد" میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دے رہے تھے اور ساتھ ہی کشمیری بازار کے تاجران کتب جو احادیث اور دیگر مذہبی کتب شائع کرتے تھے ان کی تصحیح کا کام بھی کرتے تھے ۔ چنانچہ مولانا عبید اللہ سندھی نے مولانا احمد علی کی طرف سے یہ رشتہ منظور کر لیا ۔ چنانچہ مولانا ابو محمد احمد اپنی دختر کو لے کر دیوبند آئے اور یہیں دار العلوم دیوبند کی مسجد میں ۱۳۳۰ ہجری کے سال میں محرم الحرام کے مہینے میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے خود یہ نکاح پڑھوایا ۔

صرف یہی نہیں کہ مولانا احمد علی کی عائلی زندگی کی ابتداء دیوبند میں ہی ہوئی بلکہ مولانا احمد علی جو ابھی تک مولانا عبید اللہ سندھی کے ناطے سے دبستان دیوبند اور اس کے مسلک سے وابستہ ہوتے تھے ۔ اب جسمانی طور پر بھی وہ دیوبند میں رہ رہے تھے اور یہیں انھوں نے اس دبستان کی مخصوص تعلیمات، ان کے مسلک، ان کے طور طریقوں، ان کے اٹھنے بیٹھنے ان کے علم و فضیلت، ان کے زہد و تقویٰ کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ۔ اور دراصل

جس وقت مولانا احمد علی دیوبند میں پہنچے تو اس وقت دیوبند کو وہی مقام حاصل ہو چکا تھا جو انگریزی تعلیم میں علی گڑھ کو حاصل تھا۔ اور اس وقت مسلمانانِ ہند کے فکر و عمل کے دو دھڑوں کی نمائندگی یہ دو دبستان کر رہے تھے۔

دیوبند کی پشت پر دو صدی پرانی شاہ ولی اللہ کی تحریک تھی اور لطف یہ کہ جس فکر نے دیوبند کو جنم دیا تھا۔ اسی فکر نے علی گڑھ کے سرسید کی بھی آبیاری کی تھی۔ لیکن اس کے باوجود دونوں کی راہیں مختلف ٹھہریں اور ایک لحاظ سے آج بھی یہ راہیں، یہ فکر، یہ طور طریقے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ کبھی شعوری طور پر، کبھی غیر شعوری طور پر، لیکن اس برصغیر میں مسلمانوں کی فکری تاریخ میں یہ دونوں مسلک اور دونوں دبستان ایک لحاظ سے خود بھی مختلف طبقوں کی نمائندگی بھی کرتے رہے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں۔



پُر اثر مفسّر، جید عالمِ دین مولانا احمد علیؒ

باب ۴

برِّصغیر میں اسلامی فکر

اور

اُس کا تاریخی پس منظر

مولانا احمد علی کی سوانح ہو یا دیوبند کی تحریک ہو یا پھر تحریک شاہ ولی اللہ، ان پر جب بھی قلم اٹھایا جاتا ہے تو عام طور پر ان کو بڑی کٹر قسم کی جامد اور محدود مذہبی تحریکوں، اور شخصیتوں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ تمام تحریکیں اپنے اندر سماجی تبدیلیوں اور انقلاب کے جراثیم لیے ہوئے تھیں۔ میں جب ان تحریکوں کو سماجی تبدیلیوں اور انقلاب کے جراثیم کا حاصل بتاتا ہوں تو ممکن ہے کہ میری کچھ بائیں بازو کے دوست ناک بھوں چڑھائیں۔ کیونکہ ہمارے ہاں کے بڑے بڑے جیّد انقلابی بھی انقلاب کو ایک خالص سیاسی چیز سمجھتے ہیں اور وہ انقلاب اور سماجی تبدیلیوں کو ایک وسیع پس منظر میں دیکھنے سے گریز کرتے ہیں۔ بالکل ان کٹر ملاؤں کی طرح جو اُن علمائے دین کو صرف مسجد، محراب و منبر تک محدود کرنے پر تلے ہوئے ہیں یا پھر ان کی تعلیمات کو اپنے زمانے، اس کی ضرورتوں، اس کے تقاضوں سے بالکل لاتعلق کر کے دیکھنے پرکھنے اور جانچنے پر مصر ہوتے ہیں۔ آخر ہم کیوں اس سے گریز کرتے ہیں کہ بدھ مت بظاہر ایک مذہبی تحریک ضرور تھی لیکن یہ ایسی تحریک تھی جس نے ہندو سماج میں انقلاب بپا کر دیا۔ لیکن مصیبت ہے کہ ہم جیسے ہی انقلاب کا نام لیتے ہیں تو ہماری ذہنوں میں فوراً ہنگامے، قتل و غارت، خوں ریزی اور

خانہ جنگی کا تصور ابھر آتا ہے اور ہم انقلاب کو ایک سماجی واقعہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ یا پھر ہم جب کسی مذہبی شخصیت کو انقلابی کہتے ہیں تو رجعت پسند اور آج کے نئے نئے عالم فوراً بدک اُٹھتے ہیں کہ جیسے ہم اس عالم دین کو کمیونسٹ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حالانکہ ہمارا مقصد صرف اتنا ہوتا ہے کہ ہم ان کی تعلیمات کو، ان کی شخصیت کو ایک بڑے کینوس میں، ایک بڑے اور وسیع پس منظر میں رکھ کے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ دیکھیں کہ انھوں نے اپنے زمانے کو کس طرح اور کس حد تک متاثر کیا۔ کیا کیا تبدیلیاں پیدا کیں یا پیدا کرنے کا موجب بنے یا پھر زمانے نے ان کو کس حد تک متاثر کیا۔ اور اپنے اردگرد کے حالات نے ان کو کس سانچے میں ڈھلنے پر مجبور کیا۔ کیونکہ تاریخ کا جبر وہ جادو ہے جو بالآخر سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔

نہ دو قدم بھی زمانہ چلا ہمارے ساتھ
ہمیں کو ساتھ میں چلنا پڑا زمانے کے

ہوتا کیا ہے کہ بائیں بازو کے تنگ نظر ہوں یا اسلام کے کٹر ملا ہوں، دونوں کی آنکھوں پر سماجی اقدار سے متعلق غلط اور تنگ نظریوں کی پٹی بندھی ہوتی ہے۔ وہ ان سماجی اقدار تاریخی نکتۂ نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ اس غلطی کی بنا پر یہ اس بات کے سمجھنے سے ناکام رہتے ہیں کہ بعض تاریخی مرحلوں پر مذہب انقلاب کا ذریعہ بنتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مذہب دوسرے کی نسبت زیادہ انقلابی بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ تاریخ میں ایک دور ایسا بھی آیا تھا۔ جب انسان مذہب کی حدود میں ہی غور و فکر کر سکتا تھا۔ اس دور میں بڑی سماجی اور سیاسی قوتوں نے مذہبی تحریکوں کا ہی رُوپ اختیار کیا۔ لیکن یہ تحریکیں خواہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی۔ ان کا کردار ہر حال میں طبقاتی ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ تحریکیں اکثر و بیشتر عوام کی بڑی بھاری اکثریت کے فائدے اور بہتری کے لیے اٹھتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ تحریکیں طبقاتی ہوتی ہیں۔ کیونکہ عوام کا ایک طبقہ ہوتا ہے اور خواص کا ایک طبقہ ہوتا ہے یہی وجہ ہوتی ہے کہ جب بھی کوئی تحریک، کوئی عالم، کوئی صوفی، کوئی اولیاء اللہ عوام کے طبقے کے مفاد اور بہتری کی بات کرے گا تو وہ لامحالہ خواص کے مفاد پر چوٹ کا باعث بنے گا تو یہ

خواص اسی وقت بدک اٹھیں گے اور کفر کا فتویٰ لگ جائے گا۔ ازمنہ وسطیٰ میں اور ماضی قریب و بعید میں اس کو دائرہ اسلام سے خارج تصور کیا جاتا تھا اور آج اسے کمیونسٹ اور سوشلسٹ قرار دے کر پتھر اٹھائے جاتے ہیں۔

یہ میری آہِ سوزاں کا اثر ہے
نظامِ دو جہاں زیر و زبر ہے
(حفیظ ہوشیار پوری)

اس لیے یہ لازمی و لابدی ہے کہ ہم ان تحریکوں کے اور اس دور کی طبقاتی یا عوام و خواص کی کش مکش کو سامنے رکھیں اور اس چوکھٹے میں اس کشاکش عالم کو دیکھنے اور تجزیہ کرنے کی کوشش کریں کیونکہ ایک بات ہمیں کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اب تک ہر معاشرے ہر سماج کی تاریخ، طبقاتی جدوجہد اور کش مکش کی تاریخ رہی۔ ایک زمانہ تھا کہ اس جہانِ رنگ و بُو کے مختلف خطوں میں غلامی کا رواج تھا تو اس زمانے میں غلاموں اور آقا کے درمیان کش مکش تھی، غلاموں کی جگہ جگہ بغاوتیں ہوئیں خون خرابہ ہوا اور غلاموں کا مقدر بظاہر بدل گیا۔ لیکن اب زمینداری اور جاگیرداری کا حامل طبقہ ابھرا اور اس کے ساتھ مزارع یا زرعی غلام وجود میں آیا اور پھر ان کی کش مکش شروع ہوئی جو اکثر خطوں میں آج بھی جاری و ساری ہے غرضیکہ ظالم اور مظلوم برابر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رہے ہیں۔ وہ کبھی کھلے بندوں اور کبھی پس پردہ ایک دوسرے سے لڑتے رہے ہیں اور ہر بار اس کش مکش، اس تصادم، اس لڑائی کا انجام یہ ہوا کہ یا تو نئے سرے سے سماج کی انقلابی تعمیر ہوئی یا لڑنے والے طبقے ایک ساتھ تباہ ہو گئے۔ چنانچہ آج جس گھڑی میں ہم سانس لے رہے ہیں آج بھی یہی صورت حال ہمارے سامنے ہے۔ یورپ اور صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک کا یہ جدید سرمایہ دار سماج، زمینداری جاگیرداری سماج کے کھنڈروں سے اُٹھا مگر اس نے طبقاتی اختلافات کو دُور نہیں کیا۔ اس نے تو محض پرانے کی جگہ نئے اور قدیم کی جگہ جدید طبقوں کو جنم دیا ہے، ہر ظلم کے نئے طور طریقے ایجاد کیے ہیں اور ان کو نئی صورت بخشی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جدوجہد، تصادم اور کش مکش کی بھی نئی شکلیں نئے طریقے اور نئے اسلوب منصۂ شہود پر آئے ہیں، یہ مظاہرے،

یہ جلوس، یہ ہڑتالیں، یہ گھیراؤ سب اسی دور کی پیداوار ہیں۔ لیکن ان مزاحمتی ہتھیاروں اور ظلم کے طور طریقوں کے ساتھ دونوں متصادم طبقے اپنا اپنا فکر بھی تخلیق کرتے ہیں اور ہر دور میں یہ متصادم فلسفے اور فکر بھی ان طبقوں کی نمائندگی کبھی کھلم کھلا کبھی چوری چھپے، کبھی شعوری طور پر، کبھی غیر شعوری طور پر کرتے رہے ہیں۔ ہر دور میں ان متصادم فکروں نے اس زمانے کے مروجہ علوم کی حدود میں رہتے ہوئے اپنی فکروں کو جنم دیا۔ کبھی یہ فکر رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فکروں کے دائروں میں محدود تھا تو ہمارے ہاں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی فلسفیانہ موشگافیوں میں مقید تھا تو آج جب حالات بدل گئے ہیں۔ جب نئے طبقات نے جنم لیا ہے۔ جب مشین اور سرمایہ دارانہ نظام ٹیکنولوجی اور سائنس نے اپنا تسلط جما لیا ہے اور اس نے اپنے بطن سے نئے مزدور طبقہ کو جسے اب سائنسی زبان میں پرولتاریہ کہتے ہیں کو جنم دیا ہے تو اب وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے فلسفے متصادم نہیں ہیں بلکہ ان کی جگہ سیکولر اور مذہبی حکومتوں کے فلسفے دست و گریبان ہو رہے ہیں۔ غرضیکہ ہر دور میں مخصوص حالات نے خاص فلسفوں کو، خاص افکار کو جنم دیا ہے۔ آخر کوئی وجہ تو ہوگی کہ مجدد الف ثانی بھی مسلمان اور زہد تقویٰ کے علمبردار اور ان کو پکڑ کر جیل میں ڈالنے والا بھی مسلمان بادشاہ، وہ بادشاہ جس کے انصاف اور عدل کی داستانیں بیان کرتے کرتے ہم تھکتے نہیں، آخر کیوں؟ یہ داراشکوہ اور اورنگ زیب کے فلسفوں اور فکر کا تصادم کیا تھا، یہ درست کہ تخت بھی وجہ نزاع ہوگی۔ لیکن سرمد شہید تو تخت کا دعویدار نہ تھا۔ پھر آخر اس کو تختہ دار پر کیوں چڑھنا پڑا۔ اس کو جام شہادت کیوں نوش کرنا پڑا اور آج دو صدیاں گزرنے کے بعد بھی وہ سرمد شہید کہلاتا ہے اور ہم اس پر اللہ کی رحمتوں کے طالب ہوتے اور ان رحمتوں کے لیے دست بدعا ہوتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس برصغیر میں اسلامی فکر کا تجزیہ کرتے ہوئے اس فکر کی داستان بیان کرتے ہوئے ان تمام سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کریں۔ اسی صورت میں ہم اس فکر کو سمجھ سکیں گے اور سمجھا سکیں گے۔ کیونکہ کوئی حالت اور کوئی شے مطلق نہیں ہوتی۔ ان میں ہر لحظہ تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور جب حالات بدلتے ہیں تو وہ حالات افکار پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور ہم پسند کریں یا نہ کریں۔ مذہب اور اس کی تعلیمات بھی ان تبدیلیوں کی زد سے ماوراء نہیں

ہیں. وگرنہ یہ مصلح، یہ مجدد، یہ اولیاء.. یہ فقہا اور ان کے افکار و تعلیمات بے معنی ہو کر رہ جاتے اور یہ جو آج ہم مولانا احمد علی اور ان کے خانوادے کے ڈانڈے، دیوبند اور شاہ ولی اللہ سے ملاتے ہیں تو انکو کسی اور ولی اللہ سے یا عالم سے ان کو وابستہ کیوں نہیں کرتے۔اس کی وجہ یہی ہے کہ خاص مصلح یا فقیہہ یا عالم مخصوص حالات کے زیادہ قریب ہوتے ہیں اور اس کے افکار ان حالات پر زیادہ آسانی سے منطبق ہو سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ آج صرف دبستان دیوبند ہی شاہ ولی اللہ کا نام لیوا نہیں ہے بلکہ اس پورے برصغیر میں اسلامی فکر کی نشاۃ ثانیہ یا ایسا کوئی تذکرہ ایسا نہیں ہے جو شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور افکار سے شروع نہ ہو۔

آخر کیوں؟

اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہؒ نے اس دور میں آنکھ کھولی جب اس برصغیر کے پورے سماج میں اتھل پتھل ہو رہی تھی۔مغل شاہی کا سورج غروب ہو رہا تھا۔نئی طاقتیں ابھر رہی تھیں لوٹ مار، قتل و غارت، بے سکونی اور بے چینی کا دور دورہ تھا۔اس کرب اور افراتفری کے دور میں۔شاہ ولی اللہ نے اسلامی تعلیمات کو کھنگالا اور اپنے مخصوص حالات میں اس بے سکونی کا علاج دریافت کرنے کی کوشش کی۔چنانچہ یہ تعلیمات یہ افکار اس لیے ایک گروہ کے لیے آج بھی اہم ہیں کیونکہ اڑھائی صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی یہ حالات اسی قسم کے ہیں اور پچھلی نصف صدی سے ہم اسی قسم کی بے یقینی اور عدم تحفظ میں زندگی بتا رہے ہیں۔اس لیے شاہ ولی اللہ کا فکر اگر ایک طرف دبستان دیوبند کے علماء کے لیے شمع ہدایت و رہنمائی بنا تو دوسری طرف سرسید احمد خاں بھی اسی فکر سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔اس لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ مولانا احمد علی ہوں یا اس برصغیر کے دوسرے عالم اس کی جدوجہد، ان کی تحریکوں کا اسلوب، ان کا فکر تو صحیح معنوں میں سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔جب تک کہ شاہ ولی اللہ کے اپنے فکر اور ان کے خانوادہ کی تحریک اور اسلوب کو نہ سمجھا جائے۔کیونکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ شاہ ولی اللہ کی فکری تحریک ایک بنیادی حقیقت پر استوار تھی کہ مخصوص حالات میں تمام افکار کو جب انچا جائے۔چنانچہ شاہ ولی اللہ خود اپنی کتاب "ہمعات" میں لکھتے ہیں۔

ارباب تصوّف سے بحث کرتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان بزرگوں کے اقوال و احوال کو ان کے زمانے کے رزق کے مطابق جانچا جائے اس سلسلہ میں یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم ایک عہد کے ارباب تصوّف کے اقوال اور احوال کو دوسرے عہد کے معیاروں سے ناپتے پھریں۔"

اس لیے ضروری ہے کہ جب ہم اس برصغیر میں اسلامی فکر کی تاریخ لکھنے بیٹھیں تو اس زمانے کے حالات کو پیش نظر رکھیں اور ان حالات کو بھی صحیح پس منظر میں جاننے کی کوشش کریں۔ کیونکہ یہی جدلیت ہے اور جدلیت کے نزدیک فطرت ساکن، غیر متحرک اور جامد نہیں ہوتی بلکہ اس میں برابر تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور یہ اشیاء یہ مظاہر سب ارتقاء کی حالت میں ہوتے ہیں، اور بعض چیزیں، بعض ادارے، بعض نظام بڑھتے اور ترقی کرتے رہتے ہیں اور اس کے مقابلے میں بعض چیزیں، ادارے اور نظام ہائے حکومت منتشر ہو رہے ہوتے ہیں اور روبہ زوال ہوتے ہیں۔ اکثر یہ عمل نہ دامن رونما ہو رہا ہوتا ہے۔ اس لیے ان حادثات و واقعات کو سمجھنے اور تجزیہ کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ان حادثات و واقعات کی پشت پر کام کرنے والے عوامل، ان عوامل کے باہمی رشتوں اور آپس کے تعلقات کو بھی جانا جائے۔ اور ساتھ ہی ان کی حرکت، ان کی تبدیلی، ان کے وجود میں آنے اور مٹ جانے کے عمل کو بھی سمجھا جائے۔ کیونکہ یہ ممکن ہے کہ کوئی چیز اور کوئی حکومت یا کوئی نظام ایک خاص دور اور زمانے میں بہت مستحکم اور اٹل دکھائی دے۔ لیکن فی الواقع اس کا زوال شروع ہو چکا ہو۔ چنانچہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات مغل شاہی کے خاتمے کا باعث بنی تو یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے حقیقت کا صرف ایک پہلو ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے آثار خود عالم گیر کے دور حکومت میں پڑ چکے تھے لیکن یہ واضح اس وقت ہوئے جب عالمگیر کی آنکھیں بند ہوئیں۔ اور اس کی موت نے اس زوال کے عمل کو نہ صرف تیز کر دیا بلکہ اس کو آشکارا اور برملا بھی کر دیا۔ کیونکہ سماجی ردِ عمل ایک دن میں نہ تو ترتیب پاتا ہے اور نہ رُونما ہوتا ہے۔ یہ تو ایک ایسی دیگچی ہے جس کے نیچے مختلف اسبابِ مادی محرکات اور ذہنی عوامل مدتوں اور نہ معلوم عرصہ تک جلتے رہتے ہیں۔ پھر جا کر کہیں اس دیگچی

میں اُبال آتا ہے اور جب اُبال آتا ہے تو پھر سماجی علوم کے ماہرین کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ اُبال تو اس چنگاری کا نتیجہ ہے جو فلاں صدی میں دہکنی شروع ہوئی تھی، اور یہ تو اس جذبے کا نتیجہ ہے جو فلاں ظلم کی وجہ سے رونما ہوا۔ اور پیداوار کے طریقوں میں فلاں فلاں تبدیلیاں ہوئیں۔ جن کی وجہ سے یہ اُبال آیا اور ابال ہی انقلاب کہلاتا ہے۔ اس انقلاب کا عمل بعض دفعہ صدیوں جاری رہتا ہے اور پھر جا کر کہیں اس کی ایک منزل کی تکمیل ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی تبدیلیاں پچھلی ایک صدی سے اس برصغیر میں رونما ہو رہی تھیں اور انھی تبدیلیوں نے پورے برصغیر میں ایک شدید قسم کی بےچینی کو جنم دیا اور اسی مضطرب فضا نے ہی ہندوستان میں مختلف مذہبی رہنما اور صاحبِ فکر پیدا کیے۔

اس اضطراب اور بے یقینی کا اظہار اورنگ زیب کے زمانے میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ اور جب مغلیہ خاندان کا یہ حکمران جو اپنی خوبیوں میں یکتا تھا۔ جس نے اس برصغیر کے چپے چپے کو سرنگوں کیا۔ اس کے لیے وہ سالہا سال میدانِ جنگ میں خود مصروفِ پیکار رہا۔ لیکن اس کے باوجود وہ استحکام اور مرکزیت کمزور ہوتی دکھائی دے رہی تھی جو پچھلی دو صدیوں سے مغلیہ دورِ حکومت کا خاصہ بن گئی تھی۔ اورنگ زیب کی وفات اٹھارہویں صدی کی ابتدائی دہائی میں ہوئی اور اٹھارہویں صدی کے نصف میں ایک طرف ایسٹ انڈیا کمپنی جنوبی ہند اور بنگال میں اپنے جھنڈے گاڑ چکی تھی تو دوسری طرف سکھ، جاٹ، مرہٹے، روہیلے، احمد شاہ ابدالی، یہ طاقتیں پوری زندگی کے سکون کو درہم برہم کر رہی تھیں۔ یہ بے سکونی، یہ تبدیلیاں۔ یہ نئی طاقتیں اس بات کی نشاندہی کر رہی تھیں کہ اب ہندوستان کا یہ معاشرہ پرانی ڈگر پر نہیں چل سکتا اور اس میں تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ چنانچہ انھی انقلاب خیزیوں نے اسلامی فکر کی نئی راہیں کھول دیں۔

جب سماج میں اس قسم کی تبدیلیاں ہو رہی ہوں اور جب چاروں طرف بے چینی کے آثار ہوں تو ان بے چینیوں کے ازالہ اور تشفی کے لیے جو صاحبِ فکر میدان میں آتے ہیں وہ اپنے فکر کی بنیاد مذہب ہی پر رکھتے ہیں یا اس فلسفے پر رکھتے ہیں جو اس وقت عام لوگوں میں رائج ہو۔ بنیاد وہی ہوتی ہے، اور اسی بنیاد پر وہ نئی عمارت اور نیا فلسفہ تعمیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا مقصد شعوری ہو یا غیر شعوری، ہوتا یونہی ہے کہ اگر

نئی بنیاد تلاش کی گئی تو لوگ اس پیغام سے بدک جائیں گے اور اس طرف توجہ نہیں کریں گے چنانچہ ہر دور میں مفکروں اور صاحبِ علم نے انہی بنیادوں پر اپنے عوام کو متحرک کیا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے اس ہنگامہ خیز دور نے شاہ ولی اللہ کو جنم دیا تھا جن کے خانوادے نے ہندوستان میں مسلم فکر کو نیا اسلوب دیا۔ اس کے اضطراب کی وجوہات کی نشاندہی کی۔ اور اس اضطراب اور بے چینی کو دور کرنے کے لیے ایک حسین اور واضح راہ کی طرف اشارہ کیا۔ اس زمانے کی فکر کے مطابق یہ علاج اور یہ راہ یقینی طور پر انقلاب کی راہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فکر نے باقاعدہ ایک جماعت، ایک خیال اور ایک تنظیم کو جنم دیا۔ یہ خیال، یہ جماعت یہ تنظیم تقریباً دو صدی تک مصروفِ کار رہی۔ یہی فکر تھی جس نے ہندوستان کے مختلف کونوں، میں عمل و حرکت کے لیے ایک فضا تیار کر دی تھی۔

ایک لحاظ سے شاہ ولی اللہ پہلے مفکّر تھے جنھوں نے انسان کی مادی ضرورتوں پر زور رہی نہیں بلکہ ان کا مذہب پر بھی اثر تسلیم کیا۔ چنانچہ انھوں نے ہی اعلان کیا تھا کہ جس سوسائٹی میں اقتصادی توازن نہ ہو اس میں طرح طرح کے روگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ نہ وہاں عدل و انصاف قائم ہو سکتا ہے اور نہ مذہب اپنا اچھا اثر ڈال سکتا ہے

شاہ صاحب نے اپنے دور میں معاشرہ کے ہر طبقہ کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور ہر ایک طبقہ کے مسائل اور ان کی کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس نشاندہی سے ہی نیا فکر تخلیق ہوا۔ جس نے مختلف گوشوں میں حرکت پیدا کی۔ اس لیے ان افکار کا جاننا تاریخ کے لیے ضروری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے مختلف گروہوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

امیروں سے خطاب

"اے امیرو! دیکھو! کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ دنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جا رہے ہو اور جن لوگوں کی نگرانی تمھارے سپرد ہوئی ہے۔ ان کو تم نے چھوڑ

دیا ہے۔ تاکہ ان میں بعض، بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں، تمھاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو اور نرم و گداز جسموں والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو، اچھے کپڑے اور اونچے مکانات کے سوا تمھاری توجہ کسی طرف منعطف نہیں ہوتی۔"

سپاہیوں کو نصیحت

"تم اعتدال کی راہ اپنے خرچ میں اختیار کرو اور محض اتنی روزی پر قناعت کرنے کے لیے آمادہ ہو جاؤ جو باسانی تمھیں آخروی زندگی کے نتائج تک پہنچا دے دیکھو اپنے خرچ کو اپنی آمدنی سے کم رکھا کرو۔ پھر جو بچ جایا کرے اس سے مسافروں کی مسکینوں کی مدد کیا کرو اور کچھ اتفاقی مصائب اور ضرورتوں کے لیے پس ماندہ بھی کیا کرو۔"

پیروں اور مشائخ سے خطاب

"ہم ایسے لوگوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے جو لوگوں کو محض اس لیے مرید کرتے ہیں تاکہ ٹکے وصول کریں۔"

عوام سے وعظ

اپنے مصارف وضع قطع میں تکلف سے کام نہ لیا کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تمھارے نفوس بالآخر فسق کے حدود تک پہنچ جائیں گے۔ اللہ تعالےٰ اس کو پسند فرماتا ہے کہ اس کے بندے اس کی آسانیوں سے فائدہ اٹھائیں۔ اتنا کمانے کی کوشش کرو کہ جس سے تمھاری ضرورتیں پوری ہوں۔ دوسروں کے سینے کے بوجھ بننے کی کوشش نہ کرو کہ ان سے مانگ مانگ کر کھایا کرو یا تم ان سے مانگو اور وہ

تمھیں نہ دیں۔ اس طرح بے چارے بادشاہوں اور حکام پر بوجھ نہ بن جاؤ تمھارے لیے یہی پسندیدہ ہے کہ تم خود کما کر کھایا کرو۔ اگر تم ایسا کروگے تو خدا تمھیں معاش کی بھی راہ سوجھائے گا جو تمھارے لیے کافی ہو۔

اے آدم کے بچو! جسے خدا نے ایک جائے سکونت دے رکھی ہو جس میں وہ آرام کرے، اتنا پانی جس سے سیراب ہو، اتنا کھانا جس سے سیر ہو جائے، اتنا کپڑا جس سے ڈھک جائے، ایسی بیوی جو اس کے رہن سہن کی جدوجہد میں مدد دے سکتی ہو تو یاد رکھو کہ دنیا کامل طور سے اس شخص کو مل گئی ہے، چاہیے کہ اس پر خدا کا شکر ادا کرے، بہرحال کوئی نہ کوئی راہ کمائی کی ضرور اختیار کرنی چاہیے۔"

فکر کا یہ اسلوب صرف وہی شخص اختیار کر سکتا ہے، جسے اپنے ارد گرد کی دنیا کا صرف احساس ہی نہیں بلکہ تجربہ بھی ہے، اور اپنے احساس کو وہ اس تجربہ کی گہرائی سے ہی جِلا دیتا ہے۔ شاہ ولی اللہ کے اس نکتہ کی مقبولیت کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ یہ عام انسانوں کی بے چینی اور اضطراب کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کے بعد اس کی وجوہات کو تلاش کرتا ہے۔ اور یہ وجوہات بھی عام لوگوں کے ذہنوں سے ماوراء نہیں ہیں بلکہ یہ ایسی وجوہات ہیں جن کو عام انسان اپنے روزمرہ تجربہ کی کسوٹی پر پرکھ سکتے ہیں۔ اور پھر ان کو درست پاتے ہیں۔

ایک عظیم مفکر کی سب سے بڑی نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ عام انسانوں کی زبان میں بات کرتا ہے۔ اس کا درس عام انسانوں کے ذہن کی سطح کے مطابق ہوتا ہے اسی طریقے سے وہ عوام کو قائل کر سکتا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے صرف انسانوں کے مختلف گروہوں کو ہی خطاب کر کے ان کے نقائص اور علاج کو نہیں بتایا بلکہ انھوں نے سلطنتوں کے زوال کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

"اس زمانہ میں ملک کی خرابی اور ویرانی کے زیادہ تر دو سبب ہیں ایک بیت المال یعنی ملک کے خزانہ پر تنگی، وہ اس طرح کہ لوگوں کو یہ عادت پڑ گئی ہے کہ کسی محنت کے بغیر خزانہ سے روپیہ اس دعویٰ سے حاصل کریں کہ وہ سپاہی ہیں یا عالم ہیں

جن کا حق اس خزانہ کی آمدنی سے ہے یا ان لوگوں میں سے ہیں جن کو بادشاہ خود انعام واکرام دیا کرتے ہیں۔ جیسے زہد پیشہ صوفی اور شاعر اور دوسرے گروہوں میں سے جو ملک وسلطنت کے کسی کام کے بغیر کسی نہ کسی طریقہ سے روزی حاصل کرتے ہیں جو محنت کے بغیر ان کو ملتی ہے یہ لوگ ان کے اور دوسروں کے ذرائع آمدنی کو کم کر دیتے ہیں اور ملک پر بوجھ ہیں۔

دوسرا سبب کاشت کاروں، بیوپاریوں اور پیشہ وروں پر بھاری محصول لگانا اور ان پر اس بارے میں سختی کرنا ہے یہاں تک کہ جو بے چارے حکومت کے مطیع اور اس کے حکم کو مانتے ہیں وہ تباہ ہو رہے ہیں اور جو سرکش اور نادہند ہیں اور سرکش ہو رہے ہیں اور حکومت کے محصول ادا نہیں کرتے۔ حالانکہ ملک اور سلطنت کی آبادی سستے محصول اور فوج اور عہدیداروں کے بقدر ضرورت تقرر پر ہے، چاہیے کہ اس زمانہ کے لوگ ہوشیار ہو کر سیاست کے اس راز کو سمجھیں

شاہ صاحب کے فکر کی اہمیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے جب یہ پتہ چلتا ہے کہ شاہ صاحب نے اپنی ۵۹ برس کی عمر میں گیارہ بادشاہوں کا عروج وزوال دیکھا تھا۔ انھوں نے جنگیں ہوتی بھی دیکھی تھیں، اور کئی ایک جنگوں کے لیے تو انھوں نے خود بادشاہوں کو اکسایا اور آمادہ کیا صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے قتل وغارت، شہروں کا اجڑنا، بستیوں قصبوں اور علاقوں کا تاخت وتاراج ہونا بھی ملاحظہ کیا غرضیکہ انسانی ہلاکت اور بربادی کے جو مناظر انھوں نے مشاہدہ کیے وہ کم عالموں اور صاحب فکر بزرگوں کے حصے میں آئے ہوں گے۔ اس لیے ان کی فکر میں قوموں کی ترقی وتنزلی کے اصولوں کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ شاہ ولی اللہ ۱۷۰۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ابھی تین سال کے ہی تھے کہ انھوں نے ماتم کی صدائیں سن لی تھیں اور یہ ماتم اورنگ زیب کا تھا۔ اس کے بعد شادیانوں کی گونج میں اورنگ زیب کا بیٹا اپنے بھائیوں سے معرکوں کے بعد بہادر شاہ اول کے نام سے سریر آرائے سلطنت ہوا۔ شاہ صاحب کی عمر صرف آٹھ برس تھی جب بہادر شاہ اول کی جگہ معزالدین جہاندار شاہ تخت نشین ہوئے۔ اور ابھی ایک سال بھی بادشاہت نہ کی تھی کہ دہلی کا تخت فرخ سیر کو منتقل ہو گیا۔ فرخ سیر نے چھ برس حکومت کی تو اس کے بعد تخت وتاج میں تبدیلی ہوا کے جھونکوں کی طرح ہونے لگی اور ایک سال

میں تین بادشاہتیں بدلیں - ان تبدیلیوں کے وقت شاہ صاحب کی عمر بمشکل سولہ برس تھی - اس کے بعد سب سے زیادہ وقت محمد شاہ نے ہی دہلی کے تخت پر گذارا، لیکن اس زمانہ میں نادر شاہ کا حملہ ہوا - اس نے دہلی میں قتل عام کیا، خزانے اور شہر لوٹے، پھر احمد شاہ اور عالمگیر ثانی تخت نشین ہوا، بالآخر شاہ عالم تخت پر بیٹھا - اور اس کو تخت نشین ہوئے ابھی تین برس ہوئے تھے کہ شاہ صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے

یہ تمام اتھل پتھل دہلی میں بیٹھ کر شاہ صاحب دیکھ رہے تھے اور یہیں بیٹھ کر وہ بنگال اور بہار اور مدراس میں نئی ابھرتی ہوئی طاقت کو بھی دیکھ رہے ہوں گے اور لطف یہ ہے کہ پلاسی کی جنگ تو خود شاہ صاحب کی زندگی میں لڑی جا چکی تھی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط کا زمانہ ان کے سامنے ہی شروع ہو چکا تھا - چنانچہ اس تباہی اور بربادی سے نئی دنیا کی تعمیر کا ولولہ شاہ صاحب کے فکر و عمل کی اصل بنیاد ہے اور ان کے فکر کو سمجھے بغیر آزادی کی تحریکوں کو سمجھنا محال ہے کیونکہ ایک صدی تک ہندوستان میں جو تحریکیں ابھریں وہ کسی نہ کسی انداز سے اسی فکر سے متاثر ہیں - بلکہ بہت کافی حد تک اسی فکر نے ان تحریکوں کو منظم ہونے میں مدد دی - یہی وجہ ہے کہ شیخ اکرام ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں "شاہ صاحب نہ صرف ہندوستانی علماء کے صدر نشین ہیں بلکہ اسلامی دنیا کی ممتاز ترین ہستیوں مثلاً امام غزالی یا امام ابن تیمیہ کے پہلو بہ پہلو بیٹھنے کے مستحق ہیں اور کئی باتوں میں ان سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں - شاہ صاحب کا خطاب زیادہ تر اسلامی ہندوستان سے تھا - انھوں نے ان مسائل پر زیادہ توجہ دی جو ان کے ہم وطنوں کے لیے زیادہ اہمیت رکھتے تھے - انھوں نے اپنی تصانیف کی انشائی خوبیوں پر پوری توجہ نہیں دی - اور یہ امر کہ ان کی کچھ تصانیف عربی میں ہیں اور کچھ فارسی میں، ان کی علمی شہرت کو بہت سازگار نہیں ہوا - اس کے علاوہ وہ فقط عالم تھے انھوں نے ایک اصلاحی تحریک کا نظام مرتب کیا - اسے چلانے والی جماعت پیدا کر دی "



مسجد شیرانوالہ دروازہ جہاں شیخ التفسیر ہر جمعہ مبارک کو خطبہ پڑھا کرتے تھے۔

باب۵

شاہ ولی اللہؒ کے فکر کی بنیادیں

اورنگ زیب کی وفات نے انتشار، بدامنی اور اقتصادی زبوں حالی کے جو دروازے چوپٹ کر دیے تھے ان کو بند کرنے کے لیے جس طاقت اور سیاست کی ضرورت تھی وہ اس کے کسی جانشین کے پاس نہ تھی لیکن اس دور کی بے بسی اور بے کسی کی تصویر جب تک پوری طرح ذہن نشین نہ کرلی جائے اس وقت تک اس دور میں جنم لینے والے فلسفے اور فکری تحریکوں کو پوری طرح سمجھا ہی نہیں جا سکتا، کیونکہ یہ وہ دور تھا جب ایک طرف جاٹ، مرہٹے، سکھ، روہیلے اور آخر میں ایسٹ انڈیا کمپنی سلطنت کے اچھے خاصے حصے پر قابض ہو گئے تھے۔ دکن، اودھ، بنگال اور سندھ عملاً خودمختار ہو گئے تھے۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ خالصے کی زمین محدود ہوتی چلی گئی اور اس کی آمدنی کا بھی بڑا حصہ وزیروں، امیروں، منصبداروں اور دوسرے عہدیداروں کے تصرف تک ہی محدود ہوتا چلا گیا۔ اس پر مزید ظلم یہ ہوا کہ بیرونی حملہ آوروں نے قلعے کے خزانوں اور رؤسا و امراء کی حویلیوں کو بالکل اجاڑ کر رکھ دیا۔ بادشاہ اور شہزادے مفلسی کا شکار ہو گئے۔ اور اس کے اثرات پوری آبادی پر پڑے۔ چنانچہ سر جادو ناتھ سرکار جو مغلیہ سلطنت کے زوال کی داستان اور تاریخ کے سب سے بڑے اور اہم مورخ ہیں۔ ایک

مخطوطے کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ۔ ۸ مئی ۱۷۵۸ء کو بادشاہ سواری نہ ہونے کی وجہ سے محل سے مسجد تک چل کر گئے۔" نیز وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ شہزادوں اور شہزادیوں کی حالت غریبوں سے بھی بدتر تھی"۔ شاکر خاں جو شاہزادہ عالی گہر کا دیوان تھا کہتا ہے کہ ایک دن میں خیرات خانے کا شوربہ شاہی معائنے کے لیے شہزادہ کے پاس لے گیا تو اس نے کہا کہ "یہ محل کی بیگمات کو دے دو کیونکہ حرم کے باورچی خانے میں تین دن سے چولہا نہیں جلا۔" صرف یہی نہیں بلکہ شاہی خزانے کے خالی ہونے کی وجہ سے مہینوں اور بعض اوقات برسوں فوجیوں کو تنخواہ نہ ملتی تھی اکبر شاہ کے زمانے میں محلات شاہی کے ساز و سامان کی فہرست بنا کر دکانداروں کو دی گئی تھی کہ اس کو فروخت کر کے سپاہیوں کی تنخواہیں ادا کر دی جائیں۔ یہ تمام داستان اور اس کی پوری تلخیاں خود شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات میں بکھری پڑی ہیں۔

سماج کا پورا ڈھانچہ جب ٹوٹ رہا ہو، جب چاروں طرف انتشار کا دور دورہ ہو تو ایسے حالات میں عامتہ الناس ہوں یا خواص ان پر ردعمل بھی عجیب و غریب صورتوں میں ہوتا ہے چنانچہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد کے دور میں بھی صورت رونما ہوئی۔ مختلف لوگوں نے اس انتشار سے مختلف اثرات قبول کئے۔ ایک طرف تصوف کو مقبولیت حاصل ہوتی۔ اس برصغیر میں تصوف کے شروع ہی سے دو مسلک رہے ہیں، ایک جو سعی و عمل، اخلاق کی درستی اور راست بازی و حق گوئی پر اصرار کرتا رہا، لیکن دوسرا مسلک دنیا کو تیاگنے اور فرار کی راہ اختیار کرنے پر مصر رہا۔ چنانچہ اس افراتفری کے دور میں بھی تصوف کی یہ راہ عام ہونے لگی اور یہ مسلک زیادہ دلوں کو پسند آنے لگا جس میں دنیا کو قحبہ خانے یا مردار قرار دے کر اس سے دامن بچانے کی تاکید کی جاتی، دنیا کی بے ثباتی اور دولت و اقتدار کی ناپائیداری پر زور دیا جاتا تھا تقدیر کے اٹل ہونے کا یقین دلایا جاتا تھا۔ زندگی کو محض سراب بنایا جاتا تھا، صبر و قناعت توکل و استغنا زندگی کی بہترین قدریں تصور کی جانے لگیں، "ہمہ اوست یا ہمہ از دست" کی تلقین کی جاتی تھی، فنا فی اللہ اور بقا باللہ کی منزلوں کو اعلیٰ ترین منزلیں سمجھا جاتا تھا اور نفی، ذات کو اس کے حصول کی لازمی شرط قرار دیا جاتا تھا۔ تصوف کو ان فراری تعلیمات کی وجہ سے اس دور

میں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ کیونکہ زندگی کی تلخیوں اور ان ناخوش گوار حقائق سے فرار حاصل کرنے والی طبیعتوں اور ذہنیتوں کو ایسی تعلیمات میں بڑا سکون ملتا تھا۔

تصوف کے ذریعے جب ایک گروہ فرار کی راہیں ڈھونڈھ رہا تھا اور حجروں اور خانقاہوں میں آنکھیں بند کیے پڑا تھا تو اسی لمحے ایک دوسرا گروہ لہو و لعب کے ذریعے اپنے اردگرد کی تلخیوں کو فراموش کرنے کی کوشش کر رہا تھا، چنانچہ تاریخ ادبیات میں ڈاکٹر شمس صدیقی اس گروہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں "سلاطین، امراء اور دیگر صاحب استطاعت لوگوں نے اپنے آپ کو شاہد و شراب، رامش و رنگ، رقص و نغمہ میں گم کر کے زندگی کی تلخیوں کو بھلا دینا چاہا۔ تعیش کی روایت تو پہلے ہی سے تھی اب غم غلط کرنے کا عذر اس روایت کا جواز بن گیا۔ محمد شاہ اور اس کے وزیر قمر الدین کے بارے میں تاریخ چغتائیہ کا مصنف محمد شفیع طرانی لکھتا ہے "ادھر چند برسوں سے دربارِ شاہی کا یہ دستور سا ہو گیا ہے کہ جب کبھی دکن یا گجرات یا مالوہ کے افسر مرہٹوں کی دست درازی کی اطلاع دیتے ہیں تو اس خبر بد سے بادشاہ کے دل کو زخم لگتا ہے۔ چنانچہ اس کو مندمل کرنے کیلئے بادشاہ باغات میں چلا جاتا ہے۔ یا شکار کے لیے جنگل میں چلا جاتا ہے۔ اس طرح سے اس کا وزیر اعظم قمر الدین خاں باغات میں جا کر تالاب میں کھلے ہوتے کنول کے پھولوں کو دیکھ کر اپنا دل بہلاتا ہے۔ یا ندی سے مچھلیاں پکڑتا اور جنگل میں ہرن کا شکار کرتا ہے" اور بقول ہاشمی فرید آبادی کے "جب نادر شاہ نے دہلی میں قتل عام کے بعد اپنے منجھلے بیٹے کی شادی محمد شاہ رنگیلے کی بیٹی سے رچائی تو گھر گھر طبلے کھڑکنے لگے، ناچ رنگ، جلسے، دعوتیں، جہاں دیکھو محفل رقص و سرود برپا ہے۔ بھانڈ خود اپنے سپاہیوں، سرداروں کی نقلیں دکھا رہے ہیں۔ تماشائی شرمانے کی بجائے قہقہے لگا رہے ہیں" اور زوال مغلیہ کا مصنف جادو ناتھ سرکار لکھتا ہے کہ "محمد شاہ کا جانشین احمد شاہ ہفتوں بلکہ مہینوں حرم سرا سے باہر نہ نکلتا تھا اور مے نوشی و شاہد پرستی میں غرق رہتا تھا" تاریخ احمد شاہی میں لکھا ہے کہ "محل سے لے کر ایک ایک کوس تک چاروں طرف خوب صورت عورتیں نظر آتی تھیں اور احمد شاہ اپنا سارا وقت ان عورتوں کے ساتھ باغوں اور مرغزاروں کی تفریح میں صرف کرتا تھا۔"

غرضیکہ یہ دلچسپ صورت حال تھی کہ ایک طرف تصوّف اور مذہب کے ذریعے فرار کی راہ ڈھونڈی جا رہی تھی تو دوسری طرف منشیات اور مہ وشوں کے ذریعے اس جہانِ رنگ و بُو کی تلخیوں کو بھلانے کی کوشش کی جا رہی تھی لیکن اکثر یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ فرار کے لیے یہ دو آتشہ استعمال کیا جانے لگا۔ یعنی ایک طرف نشہ، شراب، گانجہ، عورت کی محبت کے ذریعے فرار کی راہ اختیار کی جاتی تو دوسری طرف "صُوفیاء" کی محبت سے باہر چلنے والی آندھیوں سے اپنے کو محفوظ کرنے کی کوشش کی جاتی یعنی جس وقت نشے اور عورت سے تھک کر چور ہو جاتے تو خانقاہوں میں ہاتھ باندھے پہنچ جاتے۔ چنانچہ سیر المتاخرین کے مصنف لکھتے ہیں "کہ آخر عمر محمد شاہ رنگیلا فقیروں کی صحبت میں خوش رہتا اور انھی کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا۔ چونکہ اس زمانے میں تصوف اور صوفیاء کو مقبولیت عامہ حاصل ہو رہی تھی اس لیے بہت سے عیار اور مکار لوگ تصوّف کو ذریعۂ معاش بنا کر عوام کی خواص کی عقیدت سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگے۔

یہ تھی صورت حال جس میں تصوف پرستی اور عیش پرستی کے دو دھارے ساتھ ساتھ بہنے لگے۔ لیکن کچھ اور دھارے بھی اس دور میں بہتے نظر آتے تھے۔ ایک دھارا تو ان حساس اہل علم کا تھا جو اس پوری صورت حال سے بیزار تھے۔ وہ اس کے خلاف اپنے طور پر احتجاج بھی کر رہے تھے۔ چنانچہ اس دور کی نثر اور شعر میں اس احتجاج اور بیزاری کی جھلکیاں نظر آتی ہیں چنانچہ اس دور کی تصویر ایک طرف شاہ ولی اللہ کے بڑے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز نے اپنے ایک مکتوب میں ایک عربی نظم کی صورت میں کھینچی ہے۔

اللہ سکھ اور مرہٹوں کی قوم کو ہماری طرف سے بدلہ چکھاتے۔

بہت بُرا بدلہ جلد چکھائے۔

ان دونوں نے بہت سی اللہ کی مخلوق کو قتل کیا۔

اور بے چارے گڈریوں اور جاہلوں کو بھی انھوں نے دُکھ پہنچایا۔

ہماری بستیوں اور آبادیوں پر ہر سال لوٹ مار مچاتے ہیں۔

اور ہمارے علاقوں میں یہ دن دہاڑے اور شام کو پہنچتے ہیں۔

پھر کیا پناہ لینے والوں کیلئے یہاں کوئی جائے پناہ ہے۔
اور ہے کوئی ایسا فریاد رس جو اللہ سے ڈرتا ہو اور انصاف کر سکتا ہو۔

سردیوں کا موسم آگیا اور دل پریشان ہے۔
سکھ قوم سے اور دل کا یہ اندیشہ معقول ہے۔
خدا اس ملک سے ان کو ناپید فرمائے۔
یہ بدترین دشمن ہیں اور خود یہ غول بیابانی ہیں۔
میں اپنے اور لوگوں کے معاملہ کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔
اور اللہ سے امید کرتا ہوں کہ وہ حفاظت فرمائے گا۔

پھر معلوم ہو کہ ملک تباہ و برباد ہے
ظالموں اور بدمعاشوں کے ہاتھ سے۔
آپ پر غالباً مخفی نہ ہوگا جو کچھ کیا
سکھ قوم نے "توشام" قلعہ حصار کے علاقے میں
ہر بستی کو انھوں نے پست کر دیا اور گزر گئے
قلعے اور گڑھیاں فتح کرتے پھرتے ہیں۔
ایک گروہ کی جان انھوں نے ضائع کی
اور ایک طبقہ کے اجسام کو انھوں نے قتل کیا
مال اندوزی کے بھوکے ہیں۔
اور ہمارے کتنے یتیموں کو انھوں نے قید و بند کیا
اسی کو پلا دیتے ہیں موت کا پیالہ
جو انسانوں کے گروہ میں ان کی راہ میں آڑے آئے۔

آج ہر دُودھ پلانے والی اس بچہ کو بھول چکی ہے۔
جسے وہ دودھ پلاتی تھی جو دُودھ چھوڑ چکے ہیں

حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز کا ہی یہ ردِ عمل نہیں تھا بلکہ اس دور کے خاصے اہلِ قلم نے نثر و نظم میں اسی قسم کے ردِ عمل کا اظہار کیا اور لوگوں کو معاشرہ میں در آنے والی خرابیوں کی طرف توجہ دلائی۔ مثال کے طور پر غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنے تذکرے 'خزانۂ عامرہ' میں اس زمانے کے حالات پر بالواسطہ تنقید کی۔ میر جعفر زٹلی نے ہزل کے ذریعے، اور ناجی، حاتم، سودا، میر اور قائم وغیرہ نے شہر آشوبوں کے ذریعے اپنے دور کی تلخیوں کا اظہار کیا مثال کے طور پر زٹلی نے اپنی ایک نظم میں کہا تھا۔

گیا اخلاص عالم سے عجب کچھ دَور آیا ہے
ڈرے سب خلق ظالم سے عجب کچھ دَور آیا ہے
نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائیوں میں وفاداری
محبّت اُٹھ گئی ساری عجب کچھ دور آیا ہے
خوشامد سب کریں زر کی چہ بیگانہ چہ زن گھر کی
بھلادی بات سب ہر کی عجب کچھ دور آیا ہے
نہ بولے راستی کوئی عمر سب جھوٹ میں کھوئی
اُتاری شرم کی لوئی عجب کچھ دور آیا ہے

شاہ حاتم اپنی ایک نظم میں یوں تصویر کشی کرتے ہیں۔

جہاں میں صاحب خس خانہ گھاس والے ہیں
جنھوں کے محل تھے ان کو کھنڈر کے لالے ہیں
کئی جو ہم نے کہ ٹکڑے کھلا کے پالے ہیں
سو اب دماغ میں وہ رانی خاں کے سالے ہیں

اور میر تقی میر یوں فریاد کناں ہیں۔

مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
آن کے دیکھی یاں کی طرفہ معاش ہے اب نان یہ سو جگہ پرخاش
نے دم آب ہے نہ چمچہ آش

زندگی ہوئی ہے سب پہ وبال کنجڑے جھینکیں ہیں روتے ہیں بقال
پوچھو مت کچھ سپاہیوں کا حال ایک تلوار بیچے ہے ایک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش

یہ تھی صورت حال جس میں شاہ ولی اللہ نے آنکھ کھولی اور اسی صورت حال نے ان کے فکر کو متاثر کیا اور ان کو خالی صوفی اور عالم ہی نہیں رہنے دیا۔ بلکہ انھوں نے عملی زندگی کے بارے میں غور کیا اور اس کے مسائل کو سمجھا اور ان کے حل کے بارے میں اپنی رائے ہی قائم نہیں کی بلکہ اس کے لیے ایک باقاعدہ فکر ترتیب دیا۔ یہ دین کے ساتھ دنیا کے مسائل کے بارے میں جاننے کی لگن ان کو اپنے والد سے ورثہ میں ملی تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں عام طور پر صوفی و عالم اپنا پورا وقت اور پوری ذہانت قیاس آرائیوں اور استدلالوں بحثوں میں ضائع کر رہے تھے اور وہ عملی زندگی اور اس کی ضرورتوں اور تقاضوں سے بالکل بے خبر رہتے تھے۔ لیکن شاہ ولی اللہ کے والد ان سے مختلف تھے۔ چنانچہ خود شاہ ولی اللہ اپنے والد شاہ عبدالرحیم کے ان اوصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"حضرت شجاعت، فراست، کفایت، غیرت وغیرہ اخلاقِ سلیمہ میں درجہ کمال پر تھے، نیز دینی اور مابعد الطبیعاتی علوم میں درک کامل رکھنے کے ساتھ ساتھ آپ "عقل معاشی" سے بھی جس کے ذریعے انسانی زندگی کی معاشی اور اجتماعی ضرورتوں کو سمجھنا ہے پورے طور پر بہرہ ور تھے۔ آپ اپنی مجلس میں اکثر حکمت عملی، اور کاروبار زندگی کے معاملات کے آداب کی تعلیم دیا کرتے تھے۔"

چنانچہ یہ فکری بنیاد تھی جو شاہ ولی اللہ کو اپنے والد سے ورثہ میں ملی اور آپ نے اس پر ایک

عظیم الشان عمارت کھڑی کر دی۔

خاندانی طور پر شاہ ولی اللہ کا ہندوستان کے اسلامی فکری زندگی سے تعلق خاصا پرانا ہے۔ ان کے خاندان نے صدیوں پہلے عرب کو خیرباد کہا تھا۔ بہ حال ان کے جس بزرگ کا ہندوستان میں ذکر کیا جاتا ہے وہ شاہ وجیہ الدین ہیں جن کو شہید کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ شاہ ولی اللہ کے دادا تھے۔ لیکن اصل میں شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم ہی علم کی دنیا میں آفتاب بن کر چمکے اور شاہ ولی اللہ کی تربیت بنیادی طور پر اپنے والد ہی کی مرہون منت کہی جا سکتی ہے۔ گویا پورا خاندان ہی اہل علم پر مشتمل تھا۔ لیکن اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں شاہ عبدالرحیم کا شمار مستند علماء میں ہوتا تھا اور وہ کچھ دنوں فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب کے سلسلے میں دربار عالمگیری سے بھی متعلق رہے۔

شاہ ولی اللہ کے فکر کو بحیثیت تحریک کے منظم کرنے کا کام تو ان کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ اس کے بعد دو صدیوں تک یہ تحریک ہندوستانی مسلمانوں کے ایک کثیر حصہ کو متاثر کرتی رہی لیکن بیسویں صدی میں یہ تحریک خاصی دھندلا گئی تھی اور جو تحریک تھی بھی اس کے متعلق کم لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ اس تحریک کو فکر دینے والا کون اور اس کے افکار کیا تھے۔ گو شاہ ولی اللہ کے نام لیواؤں نے مختلف مدارس اور مراکز بھی قائم کیے۔ ان میں علمائے صادقپور کا مرکز بھی تھا اور پھر دیوبند میں بھی مرکز قائم ہوا۔ لیکن شاہ ولی اللہ کے افکار کو ایک تحریک کے اساس کے طور پر ان میں سے کسی مرکز نے کامیابی کے ساتھ پیش نہیں کیا اور یہ حقیقت ہے کہ بیسویں صدی کے تیس چالیس سال گزرنے کے بعد بھی کوئی مورخ وضاحت کے ساتھ یہ کہنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد مسلمانوں کو نئے فکر سے روشناس کرانے والا کون تھا، بلکہ یہاں تک بھی کوئی تذکرہ نہ کرتا تھا کہ شاہ ولی اللہؒ نے کوئی فکر دیا بھی تھا علماء کی ایک محدود جماعت میں یہ علم اور نام محدود ہو تو ہو۔ لیکن عام پڑھے لکھے مسلمان اس نام سے ناواقف تھے۔ تاریخ کی عام کتابیں ہوں یا مسلمانوں کے فکر سے متعلق مختلف کتابیں سبھی اس فکر اور اس کے مفکر کی اہمیت کو نظر انداز کیے ہوئے تھیں لیکن بالآخر اس عظیم کام کا سہرا مولانا عبید اللہ

سندھی کے سربندھا۔ انھوں نے ۲۶ برس کی جلاوطنی کے بعد اپنے ملک واپس آکر یہ اہم فریضہ انجام دیا اور یہ انھیں کا کارنامہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ آزادی کا کوئی طالب علم ایسا نہیں ہے۔ جو شاہ ولی اللہ سے اپنا کام شروع نہ کرے۔ شاہ ولی اللہ ہماری تحریک اور تاریخ دونوں کے ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور دراصل جس دور میں مولانا عبیداللہ سندھی اپنے وطن واپس آئے وہ دور بھی بڑی بے چینی اور اضطراب کا دور تھا۔ اس وقت مسلمانوں اور ہندوؤں کے تعلقات کی نئی بنیادیں تلاش کی جارہی تھیں۔ ادھر بین الاقوامی فضا زبردست آویزش سے مرتعش ہورہی تھی۔ فسطائیت اور جمہوریت میں زندگی اور موت کی لڑائی تھی۔ اس فکری انتشار کے زمانے میں مولانا عبیداللہ سندھی واپس آئے تھے۔ یہ زمانہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد کے انتشار اور ہیجان کے زمانے سے ایک گونہ ملتا جلتا تھا۔ اس دور میں بھی نئی دنیا کی تعمیر کے لیے ایک فکر کی ضرورت تھی۔ اور جس طرح وہ صدیوں پہلے شاہ ولی اللہ نے اپنے فکر سے نئی راہوں کی نشاندہی کی تھی۔ اسی طرح سے مولانا عبیداللہ سندھی نے شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور افکار کو اپنے زمانے کے حالات پر منطبق کرکے ایک نئی سوچ اور نیا ولولہ پیدا کیا۔ چنانچہ آج اس فکر کو مختلف مکاتیب خیال اپنا رہے ہیں۔ لیکن جس موثر انداز سے مولانا عبیداللہ سندھی نے اسے حالات پر منطبق کیا ہے اور اس میں اگر ان کو پروفیسر سرور جیسا شارح نہ مل جاتا تو شاید خود مولانا عبیداللہ سندھی اپنی بات اور شاہ ولی اللہ کے افکار کی ترویج میں سرے سے کامیاب ہی نہ ہوتے بہرحال ان تمام کوششوں نے اس برصغیر میں اسلامی فکر کے مختلف مدارج کو متعین کردیا ہے اور اس تاریخ اور تحریک آزادی کے مختلف ابواب کو سمجھنے میں زبردست امداد بہم پہنچائی ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے شاہ ولی اللہ کے افکار کی ترویج کی جو مہم چلائی تھی وہ آج بھی بہت حد تک زندہ ہے اور آج اسلامی فکر پر کام کرنے والوں کو لامحالہ ان افکار اور ان کے محرکات کو سمجھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ کے عمرانی نظریات کے متعلق پروفیسر سرور لکھتے ہیں "اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ شاہ صاحب سب سے پہلے ایک عالم دین تھے ان کا منصب ایک مرشد و معلم کا تھا اور ان کی ساری زندگی بھی ارشاد و تعلیم ہی میں گزری

بے شک انھوں نے اور علوم پر بھی کتابیں لکھیں اور ممکن ہے کہ وہ طلباء کو ان فنون کی بھی تعلیم دیتے رہے ہوں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ سب چیزیں ان کے ہاں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ شاہ صاحب کا اصل مقصد لوگوں کو دین سکھانا اور انھیں اسلام کی تعلیم دینا تھا۔ انھوں نے جو کچھ لکھا اس غرض سے لکھا کہ دینی حقائق کے ثبوت میں مزید شواہد فراہم کریں اور دین و حکمت میں جو تناقض پایا جاتا تھا۔ حکمت ہی کی مدد سے اسے دور کریں۔ شاہ صاحب کو سمجھنے کے لیے یہ فیصلہ ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے وہ دین کو زندگی کی اصل غائت قرار دیتے ہیں اور اسی نظریے سے وہ زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ اگر ہم شاہ صاحب کے یہاں جو دین کا تصور ہے اس کی حقیقت جان لیں تو گویا شاہ صاحب کے جملہ افکار کا اساسی نقطہ ہمارے ہاتھ آگیا۔ اب صورت یہ ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک دین کا تصور کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ کا دین کا تصوّر

شاہ ولی اللہ کے نزدیک دین کا تصور بڑا وسیع اور جامع ہے وہ زندگی کی طرح اسے بھی ایک ہمہ گیر حقیقت مانتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ دین زندگی کو ایک مقصد دیتا ہے اور یہ مقصد اتنا ہی عام اور عالمگیر ہے کہ جتنی کہ خود زندگی۔ جس طرح زندگی اجزاء اور افراد میں منقسم ہونے کے باوجود اپنا کلی وجود قائم رکھتی ہے اسی طرح شاہ صاحب کے نزدیک دین بھی ہزار ہا مذاہب اور مسالک میں بٹ کر بھی اپنی وحدت قائم رکھتا ہے شاہ ولی اللہ دین اور دین کے مظاہر میں فرق کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک دین اصل ہے اور وہ شروع سے اخیر تک یعنی حضرت آدم سے لے کر اس وقت تک اپنے عمومی مقاصد کے لحاظ سے اپنی حالت پر قائم ہے۔ البتہ زمانے کے ساتھ دین کی ظاہری شکلیں ضرور بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن دین کی اصل میں جو غیر مبدل ہے اور اس کی مختلف شکلوں میں جو برابر بدلا کرتی ہیں کوئی تضاد نہیں۔ شاہ ولی اللہ نے اپنی تصانیف میں بار بار اس مسئلہ کو اٹھایا ہے اور اس پر بحث کرتے ہیں ان کے نزدیک انسان اگر اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ جائے تو دنیا میں جتنے اختلافات نظر آتے ہیں ان سب کی حقیقت ان پر

کھل جائے اور وہ اس کثرت میں بھی ایک ہی وحدت کو کارفرما دیکھنے لگے۔

خود شاہ ولی اللہ اپنی ایک تصنیف تفہیمات الٰہیہ میں لکھتے ہیں۔

"ہر زمانہ میں نیا ظہور ہوتا ہے۔ اور ہر ظہور کے اپنے احکام ہوتے ہیں چنانچہ جیسے جیسے زمانہ بدلتا ہے۔ اس کے ساتھ احکام بھی بدلتے ہیں۔ اور نئے نئے ترجمان حق آتے ہیں۔ منشاء الٰہی کا پہلا ظہور معدنیات کی صورت میں ہوا۔ اور معدنیات کے بعد عالمِ نباتاتی قدرتِ حق کا محور بنی، نباتات سے حیوانات نے یہ منصب لیا اور پھر انسان کی شکل ارادہ حق کا ظہور ہوا۔"

یہی دراصل وحدۃ الوجود ہے۔ یہ وحدۃ الوجود کا عقیدہ ہمیں بتاتا ہے کہ نظام عالم ترقی پذیر ہے۔ وہ ابتدائے آفرینش سے اب تک سینکڑوں قالب بدل چکا ہے۔ جمادات ارتقائی قوتوں کے ذریعے نباتات کی شکل اختیار کرتی ہے اور نباتات کے بعد حیوانی مظاہر کی منزل شروع ہوتی ہے حیوانات کی ارتقائی منزل کی سرحد سے انسانیت کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ شاہ ولی اللہ دراصل مخلوقات کے ان ارتقائی مدارج سے ہی اور انہی کی مثالوں سے اجتماعی اداروں اور انسانی معاشروں کے مختلف درجات اور منازل کا باہمی ربط و تعلق سمجھاتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ معاشرۂ انسانی میں ارتقاء کے اصول اسی طرح مسلّم اور کارفرما تسلیم کرتے ہیں۔ جس طرح کائنات کے دوسرے مظاہر میں چنانچہ شاہ ولی اللہ اپنی ایک اور تصنیف میں فرماتے ہیں۔

"انسانی معاشرہ کے ابتدائی درجہ میں اجتماعی اداروں کی تشکیل جانوروں کے اجتماع سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتی۔ فرق اتنا ہے کہ حیوانات میں یہ اتفاق بطور اجمال پایا جاتا ہے۔ انسانوں میں آکر یہ پوری طرح نشوونما پاتا ہے جس کی وجہ سے انسانی معاشرہ اپنی ابتدائی شکل میں بھی حیوانات کے اجتماع کی بہ نسبت زیادہ بہتر اور بلند درجہ کا ہوتا ہے۔ حیوانی معاشرہ کے بعد معاشرہ انسانی کا یہ ابتدائی درجہ بالکل اسی طرح وجود میں آتا ہے جیسے عناصر کائنات سے جمادات پیدا ہوتے ہیں۔ انسانوں میں معاشرہ کا دوسرا درجہ پہلے درجہ کے بعد آتا ہے۔ اس سے پہلے نہیں آتا۔ اس کی

مثال بالکل ایسی ہی سمجھنا چاہیے ۔ جیسے جمادات کے بعد نباتات کا آنا ۔ انسانی معاشرہ کے اس درجہ میں پہلے درجہ کی تمام باتیں پائی جاتی ہیں ۔ لیکن اب ان میں لطافت، عمدگی اور بہتر تنظیم پیدا ہو جاتی ہے ۔ دُوسرے درجہ کے بعد معاشرہ انسانی کے تیسرے درجہ کا آنا نباتات کے بعد حیوانات کی تخلیق کی مانند ہے ۔ جس طرح حیوانات میں نباتات کی خصوصیت پائی جاتی ہے اس طرح اس تیسرے درجے میں دُوسرے درجے کی صفات بھی ہوتی ہیں لیکن ذرا مختلف شکل میں ۔ حیوانات کے بعد انسانیت کی منزل آتی ہے ۔ اتفاقات اجتماعی اداروں میں تیسرے اور چوتھے درجہ کو سمجھنا چاہیے ۔



مدرسہ تجوید القرآن جہاں ہر روز صبح بعد نماز فجر علم و عرفان کی بارش ہوتی تھی

باب ۶

شاہ ولی اللہ

بنام

احمد شاہ ابدالی

حکومتوں کے بارے میں ایک جگہ شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

اگر کسی قوم میں تمدن کی مسلسل ترقی جاری ہے تو اس کی صنعت وحرفت اعلیٰ کمال تک پہنچ جاتی ہے۔اس کے بعد اگر حکمران جماعت آرام و آسائش اور زینت و تفاخر کی زندگی کو اپنا شعار بنائے تو اس کا بوجھ قوم کے کاریگر طبقات پر اتنا بڑھ جائے گا کہ سوسائٹی کا اکثر حصہ حیوانوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت برباد ہو جاتے ہیں۔جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے۔اس وقت وہ گدھوں اور بیلوں کی طرح صرف روٹی کمانے کے لیے کام کریں گے۔جب انسانیت پر ایسی مصیبت نازل ہوتی ہے تو خدا تعالےٰ انسانیت کو ان سے نجات دلانے کے لیے کوئی راستہ ضرور الہام کرتا ہے۔ یعنی ضروری ہے کہ قدرتِ الٰہیہ انقلاب کے سامان پیدا کر کے قوم کے سر سے ناجائز حکومت کا بوجھ اتار دے۔"

انقلاب اور تبدیلی کا یہ نعرہ شاہ ولی اللہ نے دو اڑھائی صدی پہلے لگایا تھا۔اور جب ناجائز حکومت کا بوجھ اتارنے کی تلقین کی تھی تو انھوں نے غیر مسلم اور غیر اسلامی حکومت کی

تخصیص نہیں کی تھی بلکہ انھوں نے اس وقت کی ان حکومتوں کو سامنے رکھا تھا جو مسلمان بادشاہوں کی تھیں لیکن اصل میں یہ ظالمانہ حکومتیں تھیں جن کے ہاتھوں مسلمان ہوں یا ہندو سبھی تنگ و نالاں تھے اس لیے شاہ ولی اللہ ایسی حکومتوں کو ناجائز تصور کرتے ہیں اور ان کا بوجھ اتارنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن یہ بوجھ اتارنے کا یارا کس میں تھا۔ کون سی وہ طاقت تھی جو آگے بڑھ کر اس افراتفری کو ختم کر دے، اس انتشار سے چھٹکارا دلا دے یہ درست ہے کہ شاہ صاحب کو اب مغل شاہی کے بقاء کی یا اس کی اصلاح کی کوئی امید نہیں رہ گئی تھی اور بقول پروفیسر سرور کے شاہ ولی اللہ نے خوب سمجھ لیا تھا کہ شہنشاہیت کا دور ختم ہو چکا اب کوئی اور حکومت بنے گی اور اس کی اساس کوئی اور ہوگی۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے جس تحریک کی داغ بیل ڈالی وہ ہمہ گیر تحریک تھی۔ اس کے پیش نظر پورا ہندوستان تھا۔ چونکہ مرکزی ہندوستان کی قیادت اس وقت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس لیے لامحالہ شاہ صاحب نے عام مسلمانوں کو خطاب کیا۔ لیکن شاہ ولی اللہ کی دعوت کے اصول عام انسانیت کے اصول تھے۔ ان کا زور مذہب کی رسوم پر نہیں بلکہ مذہب کی رُوح پر تھا۔ قانون کی ظاہری شکل پر ہی نہیں بلکہ قانون کی جان یعنی عدل و انصاف پر تھا۔ چنانچہ وہ تمام مذاہب کی اصل یہ چار اصول بتاتے ہیں۔

اوّل ـــــ خدا پرستی، دوم ـــــ عدل و انصاف، سوم ـــــ صحت و صفائی، چہارم ـــــ تربیت نفس

ان کے نزدیک ہر مذہب کا فرض یہ ہے کہ ان چار مقاصد تک انسانوں کی رہنمائی کرے لیکن عملاً شاہ ولی اللہ نے اپنے اردگرد کے حالات کو سنبھالا دینے کے لیے جب نگاہ دوڑائی تو ان کو پھر کسی صاحبِ شمشیر اور کسی بادشاہ ہی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ کیونکہ اس دور میں کوئی دوسرا متبادل ادارہ ابھی وجود میں نہیں آیا تھا۔ اور نہ ہی وہ طبقہ وجود میں آیا تھا جو شہنشاہیت اور بادشاہت کی مطلق العنانیت کی لگام روک سکتا اور یہی ہماری پس ماندگی کی سب سے بڑی وجہ رہی ہے کیونکہ جب کہ برطانیہ میں فیوڈل نظام میں توڑ پھوڑ تیرہویں صدی ہی میں شروع

ہوگئی اور تاجر پیشہ طبقہ اور صنعت کار طبقہ ابھرنا شروع ہوگیا۔ چنانچہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں یہ طبقے اتنے طاقت ور ہو گئے تھے کہ انھوں نے بادشاہوں کو سرنگوں کرنے کی سکت پیدا کرلی تھی۔ پارلیمنٹ موثر ہوگئی تھی۔ لیکن ہمارے ہاں یہ ادارے وجود میں نہیں آسکے آخر اس کی وجہ کیا تھی؟ یہ بھی ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ آخر مغرب کی طرح مشرقی ملکوں میں زمینداری اور جاگیرداری نظام کیوں نہ ابھرا۔ کیونکہ اگر یہ نظام ابھرتا تو اس کی کوکھ سے تجارت پیشہ طبقہ جنم لیتا جو سرمایہ داری نظام کے لیے راہ ہموار کرتا۔ چنانچہ اس سوال کا جواب مارکس کے دستِ راست اور عزیز دوست اینگلز نے اپنے ایک خط میں جو اس نے ۱۸۵۳ء میں مارکس کو لکھا تھا، دیا تھا۔ اینگلز لکھتا ہے:

"آخر کیا وجہ ہے کہ اہلِ مشرق زمینداری اور جاگیرداری نظام کی منزل تک نہیں پہنچے میں سمجھتا ہوں کہ اس کی اصل وجہ آب وہوا اور زمین کی خاصیتیں ہیں خصوصاً وہ وسیع ریگستانی علاقے جو صحرائے اعظم سے عرب ایران، ہندوستان اور تاتار ہوتے ہوئے ایشیا کی کوہستانی سطح مرتفع تک پھیلے ہوئے ہیں۔ وہاں زراعت کی اولین شرط نہروں سے آب پاشی ہے اور وہ برادری کا کام ہے یا پھر صوبائی اور مرکزی حکومت اس کو انجام دے سکتی ہے۔"

جس ملک میں کاشت کاری اور زراعت کے یہ حالات ہوں وہاں زمین پر ذاتی ملکیت کے قائم ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ اس لیے ہمارے اس برصغیر میں ہی نہیں بلکہ پورے ایشیا میں ایک خاص قسم کی ایشیائی معیشت نے جنم لیا، اس کی بنیاد وہ دیہی نظام تھا جس کی تہہ میں ابتدائی کمیونزم کی دھندلی علامتیں موجود تھیں اور سر پر مطلق العنان مرکزی حکومت تھی جو جنگ اور لوٹ کھسوٹ تو کرتی ہی تھی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ آب پاشی اور رفاہِ عام کے انتظام کی بھی ذمہ دار تھی۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ ہمارے ہاں کے سماجی ڈھانچوں میں کبھی بھی ردوبدل نہیں ہوا۔ اور ہزارہا سال سے ایک ہی قسم کا ڈھانچہ جوں کا توں رہا۔ بادشاہ بدلتے رہے لیکن اراضی کے نظام میں چونکہ فرق نہیں پڑا۔ اس لیے اوپر کے ڈھانچے میں بھی

کوئی رد و بدل نہیں ہوا۔ چنانچہ اس صورت حال کی وضاحت بھی خود مارکس نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف "سرمایہ" میں کی ہے وہ لکھتا ہے۔"ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی قدیم بستیاں جن میں سے بعض ابھی تک چلی آتی ہیں۔ زمین کی مشترکہ ملکیت، زراعت و دستکاری کے اتحاد اور تقسیم محنت کے ایک ایسے اصول پر قائم ہیں جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی اور جب کبھی کسی نئی بستی کی داغ بیل پڑتی ہے تو وہ اصول ایک بنے بنائے خاکے اور اسکیم کا کام دیتا ہے۔ ایک بستی سو سے لیکر کئی کئی ہزار ایکڑ تک کے خطۂ زمین پر آباد ہوتی ہے۔ وہ ایک مستحکم اور پوری وحدت ہے جو اپنی ضرورت کی تمام چیزیں خود پیدا کرتی ہے۔ پیداوار کا کثیر حصّہ براہ راست خود بستی کے صرف میں آتا ہے اور بازار میں فروخت ہونے والی جنس کی شکل نہیں اختیار کرنے پاتا۔ اس لیے یہاں پیداوار تقسیم کار کے اس اصول پر کاربند ہیں جو اہل اس کے تبادلے کے ذریعے سے بحیثیت مجموعی ہندوستانی سماج میں رواج پا چکا ہے۔ صرف فاضل پیداوار جنس بنتی ہے اور اس کا بھی اس قدر حصہ جنس بنتا ہے۔ جو ریاست کے قبضہ میں چلا جاتا ہے۔ جس کے پاس پیداوار کا ایک حصہ مدت دراز سے لگان بطور جنس کے طور پر آیا کرتا ہے۔

ان قدیم بستیوں کی بناوٹ ہندوستان کے مختلف حصوں میں مختلف ہے۔ سب سے سادہ صورت وہ ہے جس میں کھیتی مل جل کر ہوتی ہے اور پیداوار آپس میں تقسیم کر لی جاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ ہر کنبے میں ضمنی صنعت کے طور پر سوت کاتنے اور کپڑا بننے کا بھی رواج ہے ان عام لوگوں کے علاوہ جو سدا اسی کام میں لگے رہتے ہیں ایک مکھیا ہے جو منصف، کوتوال، تحصیلدار سبھی کچھ ہوتا ہے، ایک پٹواری ہے جو کھیتوں کا حساب رکھتا ہے اور اس سے متعلق تمام باتیں اپنی بیاض میں درج کرتا جاتا ہے۔ ایک اور افسر مجرموں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرتا ہے، نووارد مسافروں کی دیکھ بھال کرتا ہے اور ان کو دوسرے گاؤں پہنچا آتا ہے دوسری بستیوں کے مقابلے میں اپنی سرحدوں کی دیکھ بھال کے لیے ایک سپاہی تعینات ہے پانی کے مشترکہ ذخیرے سے پانی تقسیم کرنا آب پاشی کے داروغہ کا کام ہے۔ برہمن پوجا پاٹ کرتا ہے اور گرو زمین پر بیٹھ کر بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھاتا ہے۔ نجومی یا جوتشی تخم ریزی اور فصل

کاٹنے کے علاوہ کھیتی باڑی کے دوسرے کاموں کے لیے بھی نیک اور منحوس دنوں کا پتہ لگاتا ہے اور بڑھئی کھیتی باڑی کے تمام اوزاروں کی مرمت کرتے ہیں کمہار گاؤں والوں کے لیے برتن بناتا ہے، ایک حجام بھی ہے، دھوبی کپڑے دھوتا ہے۔ ان کے علاوہ سنار اور کہیں کہیں شاعر بھی ہوتا ہے جو کسی برادری میں استاد اور کسی میں گرو کا قائم مقام ہوتا ہے اور ان ایک درجن آدمیوں کا خرچہ ساری بستی کے ذمے ہوتا ہے۔ آبادی بڑھ جائے تو پرانی بستی کے نمونے پر کسی غیر آباد خطے میں ایک نئی بستی آباد ہو جاتی ہے۔

یہ خود کفیل بستی برابر نسلاً بعد نسلاً بعینہٖ اسی صورت میں قائم رہتی ہے۔ اگر اتفاق سے برباد ہو جائے تو پھر اسی جگہ اسی نام کی دوسری بستی آباد ہو جاتی ہے۔ اس نظام کی سادگی میں ایشیائی سماج کے عدمِ تغیر کا راز پوشیدہ ہے اس کے برعکس ایشیائی ریاستوں کے برابر بنتے اور بگڑتے رہنے اور خاندان شاہی میں رد و بدل ہوتے رہنے سے یہ عدم تغیر اور زیادہ نمایاں ہو گیا ہے۔ سیاست کی فضائے آسمانی میں جو ابر و باد کے طوفان اٹھا کرتے ہیں ان کا اثر سماج کے معاشی ڈھانچے پر نہیں پڑتا۔"

یہ ہے وہ راز اور یہ ہے وہ بنیاد جس کی وجہ سے شاہ ولی اللہ اپنے فلسفے کے تمام انقلابی اور ترقی پسند پہلوؤں کے باوجود جب عملی تبدیلی کیلئے راہیں تلاش کرنے کا مسئلہ پیدا ہوا تو ان کو چار و ناچار پھر کسی بادشاہ، کسی صاحب شمشیر کے دروازے پر ہی دستک دینی پڑی حالانکہ یہ وہ دور تھا جب برطانیہ اور فرانس کا درمیانہ طبقہ ابھر کر بادشاہوں کے سر اتار رہا تھا اور تخت اُچھال رہا تھا۔ پارلیمنٹوں کے اختیارات کے تقاضے ہو رہے تھے۔ اور فرانس ایک زبردست انقلاب کے دہانے پر کھڑا تھا۔ لیکن ہم یہاں پر احمد شاہ ابدالی کو طلب کر رہے تھے کہ وہ آئے اور دوبارہ اس خطے میں مسلمانوں اور اسلام کے اقتدار کو بحال کرے چنانچہ شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی کو ایک طویل مکتوب رقم کیا۔ اس میں انھوں نے اس دور کی صُورتِ حال کو اور حکومت کی اصلاح کے بارے میں اپنے فلسفے اور حکمت عملی کو کھول کر بیان کیا تھا۔ شاہ صاحب اپنے اس تاریخی مکتوب میں لکھتے ہیں۔

بادشاہ کے نام خط

بعد حمد و صلوٰۃ کے یہ چند کلمات ہیں جن کے لکھے جانے کا باعث اسلامی حمیت ہے اللہ تعالےٰ ان کلمات کو گوش مبارک تک پہنچا دے۔

بادشاہانِ اسلام کا وجود اللہ تعالےٰ کی ایک زبردست نعمت ہے۔ جاننا چاہیے کہ ملکِ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے۔ قدیم اسلامی بادشاہوں نے بڑی مدت میں بڑی جدوجہد کے بعد کئی دفعہ میں جا کر اس ولایت کو فتح کیا ہے۔ علاوہ دہلی کے جو صاحبِ اقتدار بادشاہوں کا مستقر رہی ہے۔ ہر علاقہ میں علیحدہ علیحدہ فرمانروا مثلاً گجرات، احمد آباد کا علاقہ ایک علیحدہ حکمران سے تعلق رکھتا تھا ٹھٹھہ کا دوسرا بادشاہ تھا۔ بنگلہ ایک اور حاکم کے زیرِ حکومت تھا۔ اودھ جُدا ایک شخص کے زیرِ اقتدار تھا۔ جس کو سلطان الشرق یعنی یورپ کا بادشاہ کہتے تھے۔ ملک دکھن پانچ حسب ذیل سلطنتوں کا مجموعہ تھا۔

۱۔ برہان پور، ۲۔ برار، ۳۔ اورنگ آباد، ۴۔ حیدرآباد، ۵۔ بیجاپور۔

ان پانچوں سلطنتوں میں سے ہر سلطنت کا ایک جداگانہ مستقل بادشاہ تھا مالوہ کا حکمران بھی علیحدہ تھا اور ان تمام مذکورہ علاقہ جات میں سے ہر ایک علاقہ کا بادشاہ مستقل طور پر صاحبِ فوج اور صاحب خزانہ ہوتا تھا۔

ہر ایک بادشاہ نے اپنی اپنی مملکت میں مسجدیں تعمیر کرائیں، مدرسے قائم کیے عرب و عجم کے مسلمان اپنے اپنے وطنوں سے منتقل ہو کر ان علاقوں میں آ گئے۔ اور یہاں اسلام کی ترویج و اشاعت کا باعث بنے اس وقت تک ان لوگوں کی اولاد اسلام کے طور طریقوں پر قائم ہے۔ ایک اور ملک بھی ہے جو کبھی کسی بادشاہ اسلام کے قبضہ میں نہیں آیا اور وہ اپنے خالص غیر مسلمانہ طریقہ پر باقی رہا۔ اتنا ضرور ہوا کہ بادشاہ ان راجاؤں سے جو ان کے حدود میں تھے خراج لیا کرتے تھے

یہ ملک جس کا تذکرہ ہو رہا ہے راجپوتانہ کا ملک ہے اس ملک کا طول حدود ٹھٹہ سے لے کر حدودِ بنگالہ و بہار تک چالیس منزل ہے اور عرض دہلی و آگرہ سے لے کر گجرات و اجین کی حدود تک بیس منزل ہے۔ یہی وہ باوسعت ملک ہے جو کبھی ملوک اسلامیہ کی نشست گاہ نہیں بنا۔ قصہ مختصر بادشاہان مغلیہ نے راجپوتوں سے معاہدہ کر لیا اور اس گروہ کو اپنا ماتحت قرار دے کر ان کی مخالفت سے مامون و محفوظ ہو گئے اور جنگ سے دست کشی اختیار کر لی۔ واقفانِ فنِ تاریخ تفصیلی طور پر ان واقعات کو بیان کریں گے۔

غیر مسلموں میں ایک قوم مرہٹہ نامی ہے کہ ان میں ایک سردار ہے۔ اس قوم نے ایک عرصہ سے اطرافِ دکن میں سر اٹھایا ہے اور تمام ہندوستان پر اثر انداز ہے شاہان مغلیہ میں سے بعد کے بادشاہوں نے عدمِ دور اندیشی، غفلت اور اختلافِ فکر کی بنا پر ملک گجرات مرہٹوں کو دے دیا۔ پھر اسی سست اندیشی اور غفلت کی وجہ سے ملک مالوہ بھی ان کے سپرد کر دیا۔ اور ان کو وہاں کا صوبے دار بنا دیا۔ رفتہ رفتہ قوم مرہٹہ قوی تر ہو گئی اور اکثر بلادِ اسلام ان کے قبضہ میں آ گئے مرہٹوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں سے باج لینا شروع کر دیا اور اس کا نام چوتھ (یعنی آمدنی کا چوتھا حصہ) رکھا۔

دہلی اور نواحِ دہلی میں مرہٹوں کا تسلط اس وجہ سے نہ ہو سکا کہ دہلی کے لوگ سوائے بادشاہان قدیم کی اور یہاں کے وزراء اور امراء امرائے قدیم کی اولاد ہیں۔ ناچار مرہٹوں نے ان لوگوں سے یک گونہ مروّت کا معاملہ رکھتے ہوتے عہد و پیمان کر لیا اور رواداری کا سلسلہ جاری کر کے طرح طرح کی چاپلوسی سے دہلی والوں کو اپنی طرف سے امن و امان دے کر چھوڑ دیا دکن پر بھی مرہٹوں کا قبضہ اس بنا پر نہ ہو سکا کہ نظام الملک مرحوم کی اولاد نے بڑی بڑی تدبیریں کیں کبھی مرہٹوں کے درمیان میں پھوٹ ڈلوا دی، کبھی انگریزوں کو اپنا رفیق بنا لیا اور برہان پور، اورنگ آباد، بیجاپور جیسے بڑے بڑے

شہروں پر اولادِ نظام الملک قابض رہی البتہ اطراف و نواح کو مرہٹوں کے لیے چھوڑ دیا۔ المختصر سوائے دہلی دکن کے خالص طور پر مرہٹوں کا تسلط ہے۔ قوم مرہٹہ کو شکست دینا آسان کام ہے۔ بشرطیکہ غازیانِ اسلام کمرِہمت باندھ لیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قوم مرہٹہ خود قلیل ہیں لیکن ایک گروہ کثیر ان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اس گروہ میں سے اگر ایک صف کو بھی درہم برہم کر دیا جائے تو یہ قوم منتشر ہو جائے گی اور اصل قوم اسی شکست سے ضعیف ہو جائے گی۔ چونکہ یہ قوم قوی نہیں ہے اس لیے اس کا تمام سلیقہ ایسی کثیر فوج جمع کرنا ہے جو چیونٹیوں اور ٹڈیوں سے بھی زیادہ ہو۔ دلاوری اور سامان حرب کی بہتات ان کے یہاں نہیں ہے۔ الغرض قوم مرہٹہ کا فتنہ ہندوستان کے اندر بہت بڑا فتنہ ہے۔ حق تعالےٰ بھلا کرے اس شخص کا جو اس فتنے کو دبائے۔

غیر مسلموں کی ایک قوم جاٹ جس کی بود و باش دہلی و آگرہ کے درمیان ہے یہ دونوں شہر بادشاہوں کے لیے دو حویلیوں کی مانند رہے ہیں۔ مغل بادشاہ کبھی آگرہ میں رہتے تھے تاکہ ان کا دبدبہ اور رعب راجپوتانہ تک پڑے اور کبھی دہلی میں فروکش ہوتے تھے تاکہ ان کی شہرت و ہیبت سرہند اور نواحی سرہند تک اثر ڈالے۔

دہلی و آگرہ کے درمیان کے مواضعات میں قوم جاٹ کاشت کاری کرتے تھے زمانہ شاہجہاں میں اس قوم کو حکم تھا کہ گھوڑوں پر سوار نہ ہوں۔ بندوق اپنے پاس نہ رکھیں اور اپنے لیے گڑھی نہ بنائیں۔ بعد کے بادشاہوں نے رفتہ رفتہ ان کے حالات سے غفلت اختیار کر لی اور اس قوم نے فرصت کو غنیمت جان کے بہت سے قلعے تعمیر کر لیے اور اپنے پاس بندوق رکھ کر بٹ ماری کا طریقہ شروع کر دیا۔ اورنگ زیب اس وقت دکن میں قلعہ بیجاپور اور حیدرآباد کے فتح کرنے میں مشغول تھا۔ دکن ہی سے ایک فوج جاٹوں کی تادیب کے لیے اس نے روانہ

کی اور اپنے پوتے کو فوج کا سردار مقرر کیا۔ رئیسان راجپوتانہ نے اس شہزادے سے مخالفت کر لی۔ لشکر میں اختلاف واقع ہوا۔ جاٹوں کی تھوڑی سی عاجزی پر اکتفا کر کے فوج بادشاہی واپس ہو گئی۔

محمد فرخ سیر کے زمانہ میں اس جماعت کی شورش پھر جوش میں آئی۔ اور قطب الملک وزیر نے زبردست فوجیں ان کی طرف بھیجیں۔ چورامن جو اس قوم کا سردار تھا۔ بعد جنگ صلح پر راضی ہو گیا۔ اس کو بادشاہ کے سامنے لائے اور تقصیرات کی معافی دلوائی۔ یہ کام بھی خلافِ مصلحت عمل میں آیا۔

پھر عہد محمد شاہ میں اس قوم کی سرکشی حد سے تجاوز کر گئی اور چورامن کا چچا زاد بھائی سورج مل اس جماعت کا سردار ہو گیا اور فساد کا راستہ اختیار کیا چنانچہ شہر بیانہ جو کہ اسلام کا قدیم شہر تھا اور جہاں پر علماء و مشائخ سات سو سال سے اقامت پذیر تھے۔ اس شہر پر قہراً و جبراً قبضہ کر لیا اور مسلمانوں کو ذلت و خواری کے ساتھ وہاں سے نکال دیا۔ اس کے بعد سے سرکشی برابر بڑھتی گئی۔ بادشاہوں اور امیروں کے اختلافات اور غفلت کی بنا پر کوئی بھی اس جانب متوجہ نہ ہوا۔ اگر بالفرض ایک امیر اس کی تنبیہ کی طرف توجہ کرے تو سورج مل کے کارکن دوسرے امراء کی جانب رجوع کرتے ہیں اور اس طرح بادشاہ کے مشورے کو پلٹ دیتے ہیں پسر محمد شاہ کے عہد میں صفدر جنگ ایرانی نے خروج کیا اور سورج مل سے سازش کر کے پرانی دہلی پر حملہ کر دیا۔ اور تمام باشندگانِ شہر کہنہ کو لوٹ لیا۔

پسر محمد شاہ نے شہر کے دروازوں کو بند کر کے جنگ توپ خانہ شروع کی محض خدا کے فضل سے صفدر جنگ اور سورج مل دو تین ماہ کے بعد ناکامیاب واپس ہوئے اور صلح و موافقت کی داغ بیل ڈالی۔ چونکہ بادشاہ کے آدمی جنگ سے تھک چکے تھے اس لیے انھوں نے صلح کو غنیمت شمار کیا۔ اس کے بعد سے سورج مل کی شوکت ترقی پا گئی۔ دہلی سے دو کوس کے فاصلے سے لے کر آگرہ کے آخر تک طول میں اور

میوات کے حدود سے فیروز آباد اور شکوہ آباد تک عرض میں سورج مل قابض ہو گیا کسی کو طاقت نہیں کہ وہاں اذان و نماز جاری کر سکے۔

ایک سال ہوا قلعہ الور جو تمام میوات کی خبر گیری کے لیے ایک جائے بلند تھی سورج مل اس کو بھی اپنے قبضہ میں لے آیا۔ ارکان سلطنت میں سے کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ اس کام سے روک دیتا۔

ہندوستان کے محصولات سات آٹھ کروڑ سے کم نہیں ہیں۔ بشرطیکہ غلبۂ شوکت موجود ہو ورنہ ایک کوڑی بھی ملنی مشکل ہے جیسا کہ اس وقت دیکھا جا رہا ہے جس علاقہ پر جاٹ قابض ہیں وہ ایک کروڑ روپیہ محصول کی جگہ ہے۔ راجپوتانہ کا علاقہ اپنی وسعت کے باعث دو کروڑ سے کم آمدنی کا نہیں ہے۔ بشرطیکہ ہر راجہ پر خراج مقرر کیا جائے۔ عہد محمد شاہ میں بنگالہ سے ہر سال ایک کروڑ روپے کی آمدنی تھی اور وہاں کا صوبہ دار ہمیشہ بلا توقف بھیجتا رہتا تھا۔ اس رقم کی ادائیگی کے باوجود صوبہ دار بنگالہ ہندوستان کے امرا میں انتہائی مالدار امیر تھا چنانچہ اس وقت بھی کہ بنگالہ میں بے انتظامی ہے اور وہاں ایک بے وقوف ناواقف کار نوجوان یعنی ناظمِ قدیم کا پوتا مسلط ہے۔ پھر بھی وہ نوجوان خزائن بے شمار کا مالک ہے اور سعادت خاں ایرانی اور اس کے بعد اس کا داماد صفدر جنگ صوبہ اودھ پر قابض تھے دو کروڑ اس صوبہ سے وصول کرتے تھے ایک کروڑ خرچ کرتے تھے اور ایک کروڑ جمع کرتے تھے اسی مالداری نے صفدر جنگ کے اندر بادشاہ سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ جاٹ کی شوکت کو درہم برہم کرنا بھی تدبیر کے نزدیک آسان کام ہے۔ انھوں نے جو علاقے اپنے قبضے میں کر لیے ہیں وہ ان کے نہیں ہیں بلکہ وہ غصب کیے ہوئے ہیں۔ ان کے مواضع کے مالک ابھی تک زندہ موجود ہیں اگر کوئی صاحبِ شوکت و عدالت بادشاہ مہربانی کا ہاتھ ان مالکوں کے سر پر رکھے تو وہ لوگ سورج مل کے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے ہندوستان

کے غیر مسلموں کا حال تھا۔ رہا مسلمانوں کا حال! وہ یہ ہے کہ نوکران بادشاہ جو ایک لاکھ سے زائد تھے۔ ان میں پیادہ وسوار بھی تھے۔ اہلِ نقدی وجاگیردار بھی تھے بادشاہوں کی غفلت سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ جاگیردار اپنی جاگیروں پر عمل ودخل نہیں پاتے کوئی غور نہیں کرتا کہ اس کا باعث بے عملی ہے۔ جب خزانۂ بادشاہ نہیں رہا نقدی بھی موقوف ہوگئی آخر سب ملازمین تتر بتر ہو گئے اور کاسۂ گدائی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سلطنت کا بجز نام کے اور کچھ باقی نہ رہا۔ جب ملازمین بادشاہ کا یہ بُرا حال ہے تو تمام دیگر اشخاص کے حال کو جو کہ وظیفہ خوار یا سوداگر یا اہل صنعت ہیں انھیں پر قیاس کر لینا چاہیے کہ کس حد تک خراب ہو گیا ہوگا۔ طرح طرح کے ظلم اور بیروزگاری میں یہ لوگ گرفتار ہیں۔ علاوہ اس تنگی اور مفلسی کے جب سورج مل کی قوم نے اور صفدر جنگ نے مل کر دہلی کے پرانے شہر پر دھاوا بولا۔ یہ غریب سب کے سب بے خانماں پریشان اور بے مایہ ہو گئے۔ پھر متواتر آسمان سے قحط نازل ہوا۔ غرضیکہ جماعتِ مسلمین قابل رحم ہے۔ اس وقت جو عمل ودخل سرکار پادشاہی میں باقی ہے وہ ہنود کے ہاتھ ہے۔ کیونکہ متصدی اور کارکن سوائے ان کے اور کوئی نہیں ہے۔ ہمہ قسم کی دولت وثروت ان کے گھروں میں جمع ہے۔ افلاس ومصیبت کا بادل مسلمانوں پر چھا رہا ہے۔ بات طویل ہوگئی اور اختصار کے حدود سے باہر نکل گئی حاصلِ کلام یہ ہے کہ ملک ہندوستان میں غیر مسلموں کے غلبہ کی نوعیت یہ ہے جو معرض بیان میں آئی ہے اور مسلمانوں کا ضعف اس حد تک پہنچ گیا ہے جو لکھا گیا۔ اس زمانے میں ایسا بادشاہ جو صاحبِ اقتدار وشوکت ہو اور لشکر مخالفین کو شکست دے سکتا ہو۔ دور اندیش اور جنگ آزما ہو۔ سوائے آنجناب کے اور کوئی موجود نہیں ہے۔ یقینی طور پر جناب عالی پر فرض عین ہے۔ ہندوستان کا قصد کرنا اور مرہٹوں کا تسلط توڑنا اور ضعفائے مسلمین کو غیر مسلموں کے پنجے سے آزاد کرانا۔ اگر غلبہ کفر معاذ اللہ اسی انداز پر رہا تو مسلمان اسلام کو فراموش کر دیں گے اور تھوڑا زمانہ نہ گزرے گا کہ یہ مسلم قوم ایسی قوم بن

جائے گی کہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز نہ ہو سکے گی۔ یہ بھی ایک بلائے عظیم ہے اس بلائے عظیم کے دفع کرنے کی قدرت بہ فضل خداوندی جناب کے علاوہ کسی اور کو میسر نہیں ہے۔

ہم بندگان الٰہی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شفیع گردانتے ہیں اور خدائے عزوجل کے نام پر التماس کرتے ہیں کہ ہمتِ مبارک کو اس جانب متوجہ فرما کر مخالفین سے مقابلہ کریں تاکہ خدائے تعالیٰ کے یہاں بڑا ثواب جناب کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے۔ اور مجاہدین فی سبیل اللہ کی فہرست میں نام درج ہو جائے دنیا میں بے حساب غنیمتیں ملیں اور مسلمان دستِ کفار سے خلاصی پا جائیں خدا سے پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ نادر شاہ کی طرح عمل ہو کہ وہ مسلمانوں کو زیر زبر کر گیا۔ اور مرہٹہ و جاٹ کو سالم و غانم چھوڑ کر چلتا بنا۔ نادر شاہ کے بعد سے مخالفین قوت پکڑ گئے اور لشکر اسلام کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور سلطنت دہلی بچوں کا کھیل بن گئی۔ پناہ بخدا اگر قوم کفار اسی حال پر رہے اور مسلمان ضعیف ہو جائیں تو اسلام کا نام بھی کہیں باقی نہ رہے گا۔

خدائے تعالیٰ مجاہدین کی صفت میں فرماتا ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ الآیتہ

"یعنی وہ غیروں پر سخت دل ہیں اور اپنوں پر مہربان ہیں۔"

اس جماعت کے وصف میں جو مرتدوں سے مقابلہ کرتی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ۔ الآیتہ

"یعنی خدائے تعالیٰ دوست رکھتا ہے ان کو اور وہ دوست رکھتے ہیں خدائے تعالےٰ کو وہ مسلمانوں کے سامنے تواضع سے پیش آتے ہیں اور غیروں پر

سخت ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ فتح اسلام اس جماعت کو نصیب ہوتی ہے جس کی یہ شان ہو کہ اگر کسی جگہ مسلمان ہوں ان کو وہ اپنے بیٹوں اور سگے بھائیوں کی طرح رکھے۔ اور مخالف کے مقابلہ میں وہ شیر نر کی مانند ہو۔"

پس واجب ہے کہ ان مجاہدات میں تقویت اسلام کی نیت کر لی جائے اور جب افواج قاہرہ ایسے مقام پر پہنچیں جہاں پر مسلمان اور غیر مسلمان دونوں رہتے ہوں چاہیے کہ منتظمین خاص طور پر ایسے مقام پر متعین ہوں اور ان کو تاکید کی جائے کہ جو ضعیف مسلمان قریوں میں ساکن ہوں۔ ان کو قصبوں اور شہروں میں لے آئیں پھر کچھ منتظمین قصبوں اور شہروں پر مقرر کیے جائیں۔ جو اس بات کی کڑی نگرانی کریں کہ کسی مسلمان کا مال نہ لوٹا جائے اور کسی مسلمان کی عزت میں فرق نہ آنے پائے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ کے نزدیک تمام دنیا کا زوال قتل مسلم کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ حضرت سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم بقصد عمرہ جب حدیبیہ تشریف لے گئے۔ اور کفار قریش مکہ کے داخلہ سے مانع آئے۔ آخر الامر کفار مکہ سے صلح ہوئی اگرچہ بعض بڑے صحابہؓ میں سے ایسے تھے جن کی حمیت دینی جوش میں آئی اور ان اشخاص کے ساتھ مکہ کے قریب پہنچے اور اہل مکہ بہر طور داخل اسلام ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔

اس واقعہ صلح حدیبیہ و فتح مکہ میں بادشاہان دور اندیش کو حکمت کی عجیب و غریب تعلیم دی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلم و غیر مسلم کے اختلاط کے مقام پر علم کا معاملہ کرنا چاہیئے۔ پہلے مخالفین اسلام کو جو مسلمانوں پر تسلط جماتے ہوتے ہوں متفرق کریں۔ بعد ازاں مسلمان خود بخود پادشاہان عادل و دور اندیش کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیں گے۔ (ترجمہ شعر عربی)

اللہ کی کتنی پوشیدہ پوشیدہ مہربانیاں ہیں جن کی پوشیدگی سے ایک ذکی فہم بھی

بے خبر ہے۔"

جیسا کہ دوائے تلخ ہر چند فائدہ مند ہو۔ لیکن مریض کی طبیعت اسکی طرف رغبت نہیں کرتی۔ طبیب حاذق اس کڑوی دوا کو شہد کے ساتھ ملاتا ہے۔ اسی طرح بادشاہان عادل کرتے ہیں کہ اللہ تعالے کے دشمنوں کی طرف جس جگہ متوجہ ہوتے ہیں اور وہاں پر جو مسلمان متفرق طور پر ہوتے ہیں اور اپنی جان و آبرو کا خوف کرتے ہیں اور اپنی طبیعت سے اس گیر و دار کو نہیں چاہتے وہاں پر پیروں فقیروں اور سادات و علماء کو اپنے الطاف خسروانہ اور انعام بادشاہانہ سے اور طرح طرح کے دلاسوں اور تسلیوں سے محفوظ رکھتے ہیں تاکہ ان کی مہربانی کا شہرہ دور و نزدیک شہروں تک پہنچ جائے اور سب کے سب ہاتھ اٹھا کر بادشاہ عادل کی فتح و نصرت کی دعائیں کریں اور خدائے عزوجل سے شب و روز یہی درخواست کریں کہ اے اللہ یہ رحمت کی نشانی بادشاہ عادل ہمارے شہر میں فروکش ہو۔ صلح پر راضی نہیں ہوتے تھے۔ لیکن حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قول پر التفات نہیں فرمایا اور صلح کر لی۔ جب اس سفر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہوئے سورۃ انا فتحنا نازل ہوئی۔ اللہ تعالے نے اس سورۃ میں صلح کی حکمت اور تاخیر فتح کی وجہ ظاہر فرمائی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَوْلَا رِجَالٌ مومنون ونسآءٌ مومناتٌ لم تعلموهم تا عذاباً الیما ط

اگر نہ ہوتے (مکہ میں) کئی مرد ایمان والے اور کئی عورتیں ایمان والیاں جن کو تم نہیں جانتے اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ تم ان کو پیس ڈالو گے۔ پس اس کے نتیجے میں تم کو گناہ ہوتا۔ بغیر دانست کے (تو تصدیق خواب بالفعل ہو جاتی اور جلد فتح میسّر ہوتی) (خدا نے فتح کو موخر کیا) تاکہ داخل کر دے جس کو چاہے اپنی رحمت کے سایہ میں۔ اگر دو فریق ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے تو ہم منکروں پر (فی الفور) آفت ڈال دیتے۔

یعنی چونکہ مسلمانوں کو مضرت پہنچ جانے کا اندیشہ تھا۔ حکمت الٰہی نے تقاضا کیا کہ اس مقصد کو مہلت کے ساتھ انجام دیا جائے تاکہ منکرین کسی نہ کسی طرح قبول اسلام کر لیں اور مسلمان مجاہدین کے غلبہ سے محفوظ رہیں۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے دو سال بعد مکہ فتح ہوا۔

سب سے پہلے اہم اس کے بعد بالترتیب اس کے نیچے کے درجہ کے اہم امور انجام دیے جائیں جس جگہ کسی مسلمان کی شکست کا احتمال ہو وہاں توقف کرنا چاہیے جماعت منکرین کے گرداگرد جہاد مقدم رکھنا چاہیے تاکہ بغیر احتمال قتل مسلم مدعا حاصل ہو جائے۔ آخر کلام میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت پادشاہانِ اسلام کے حق میں اور خلفائے راشدین کی نصیحتیں حفظ آداب بادشاہی کے باب میں لکھی جاتی ہیں۔

ترجمہ وصایا ونصائح

ارشاداتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بخاریؒ نے حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت لکھی ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ ہر وہ جو خلیفہ بنایا جاتا ہے اس کے دو دلی دوست (باطنی قوت) ہوتے ہیں۔ ایک ان میں سے اس کو خیر و نیکی کی تلقین کرتا اور اس پر آمادہ کرتا ہے۔ دوسرا اس کو شر کا حکم کرتا ہے اور اس کی رغبت دلاتا ہے اور محفوظ وہ ہے جس کو اللہ تعالےٰ محفوظ رکھے۔

وصیت صدیق اکبرؓ

امام ابو یوسفؒ نے ابن سابط سے روایت کی ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کا وقت قریب آیا۔ انھوں نے حضرت عمر فاروق کو بلایا پھر ان سے فرمایا

کہ میں تم کو ایک وصیت کرتا ہوں۔ اگر تم اس کو یاد رکھو گے تو موت سے زیادہ کوئی شے تم کو محبوب نہیں ہوگی۔ اور اگر اس وصیت کو تم نے بھلا دیا تو موت سے زیادہ کوئی شے تمہارے نزدیک مبغوض و مکروہ نہیں ہوگی اور تم موت کے پنجے سے نکل نہیں سکتے۔ وہ وصیت یہ تھی

اللہ تعالے کا تم پر رات میں ایک حق ہے کہ وہ دن میں اس کو قبول نہیں کریگا اور ایک دن میں حق ہے جس کو رات کو قبول نہیں کرے گا (یعنی ہر حق کو ادا کرنے کے لیے ایک وقت مقرر ہے) اللہ تعالےٰ نفل اس وقت تک قبول نہیں فرمائے گا جب تک فرض کی ادائیگی نہ ہوگی۔ جن لوگوں نے دنیا میں باطل کی پیروی کی اور باطل کی پیروی کو معمولی چیز تصور کیا اس کی پاداش میں ان کی میزان ہلکی ہو جائے گی۔ اور میزان قیامت کا معاملہ یوں ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی صورت میں ہلکی پڑتی ہے۔ جب کہ اس میں باطل دھرا ہو۔ اور جن لوگوں نے دنیا حق کا اتباع کیا ہوگا اور اس کو اہم تصور کیا ہوگا۔ ان کی میزان قیامت میں بھاری ہوگی۔ اور میزان میں جب حق ہوگا اس کا پلہ بھاری ہی ہوگا۔

پس اگر تم نے میری اس وصیت کو یاد کر لیا تو کوئی غائب شے موت کے مقابلہ میں محبوب نہیں ہونے کی۔ اور موت کا آنا یقینی ہے۔ اور اگر اس وصیت کو ضائع کر دیا (بھول گئے) تو کوئی غائب شے موت سے زیادہ مبغوض نہیں ہوگی اور تم موت کو ہرگز عاجز نہیں کر سکتے۔ وہ تم پر غالب آ کر رہے گی۔

وصیت فاروق اعظمؓ

امام ابو یوسف نے زبیدہؒ سے روایت کی ہے کہ جب کہ حضرت عمرؓ نے وصیت کی تو فرمایا کہ میں اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں کہ خدا سے ڈرنے کی اور وصیت کرتا ہوں مہاجرین اولین کے بارے میں کہ ان کا حق

پہچانا جائے اور ان کی کرامت وعظمت ملحوظ رکھی جائے اور وصیت کرتا ہوں انصار کے بارے میں وہ انصار جنھوں نے دار الایمان میں ٹھکانا پکڑا ان کی خوبیوں کو قبول کرتے ہوئے ان کی لغزشوں سے درگزر کی جاتے اور اولاد انصار کے بارے میں بھی وصیت کرتا ہوں اس لیے کہ وہ اسلام کی جڑ اور عدو کے غصہ کا سبب ہیں کہ ان سے ان کی رضامندی کے بغیر ان کا زائد مال وصول نہ کیا جاتے اور اعراب کے بارے میں وصیت کرتا ہوں۔ اعراب جو اصل عرب اور اسلام کے لیے مرکزی طاقت ہیں خلیفہ ان کے اموال کو لے کر ان کے فقراء پر تقسیم کر دے اور میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے عہد کی پاسداری کی بھی وصیت کرتا ہوں کہ ذمیوں کے عہد کو پورا کیا جائے اور ان کی حفاظت کے لیے مقابلہ کیا جائے اور ان کو ان کی طاقت سے زیادہ حکم نہ دیا جائے۔

نصیحت حضرت عثمانؓ

امام ابو یوسفؒ نے حضرت عثمانؓ بن عفان کے آزاد شدہ غلام حضرت ہانیؓ کی روایت نقل کی ہے کہ ہانیؓ نے کہا کہ جب کبھی حضرت عثمانؓ کسی قبر کے پاس کھڑے ہوتے تھے تو زار زار روتے تھے۔ یہاں تک کہ آپؓ کی داڑھی تر ہو جاتی تھی۔ ان سے کہا گیا کہ جنت و دوزخ کا تذکرہ کرتے ہیں اس پر تو روتے نہیں، قبر پر کیوں رویا کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ قبر آخرت کی پہلی منزل ہے پس جو اس منزل سے نجات پا گیا سمجھ لو کہ اس کے بعد معاملہ آسان ہے اور اگر یہاں سے نجات نہیں ملی تو اس کے بعد کی منزل اس سے زائد سخت ہے۔

وصیّت حضرت علیؓ

امام ابو یوسفؒ نے عطاء ابن ابی رباح سے روایت نقل کی ہے کہ عطاء نے کہا

حضرت علی جب کبھی کوئی لشکر روانہ کرتے تو اس لشکر کے ایک شخص کو امیر بناتے پھر اس سے یہ وصیت کرتے کہ مَیں تجھے اس خدا سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں جس کی ملاقات یقینی ہے اور اس کے علاوہ تیرا اور کوئی ٹھکانا نہیں ہے وہ دنیا اور آخرت کا مالک ہے۔ میں تجھ کو جس کام کے لیے روانہ کر رہا ہوں۔ تیرے اُوپر اس کی انجام دہی ضروری ہے اور تیرے اوپر ایسے امور کی پابندی لازم ہے۔ جو باعثِ قربِ خداوندی ہوں۔ اس لیے خدا کے یہاں دنیا کے ہر کام کا بدلہ ہے۔

جو کچھ چیزیں بطریق استعجال تحریر ہوئی ہیں۔ اگر ان کلمات کی جانب آنجناب کی توجہ محسوس ہوئی تو بعض مطالب تفصیلاً پہنچیں گے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلاً وَّآخِراً وَظَاہِراً وَّبَاطِناً



خضری محلے کا وہ مکان جہاں شیخ التفسیر مولانا احمد علیؒ رحلت کے وقت مقیم تھے۔

باب ۷

فکر و عمل کا تضاد

شاہ ولی اللہ کا احمد شاہ ابدالی کے نام مکتوب جہاں ایک طرف اٹھارہویں صدی کے کرب اور مسلمانوں کی ابتلا کا مظہر ہے تو دوسری طرف یہ مکتوب خود شاہ ولی اللہ کے فکر و عمل کے زبردست تضاد کا بھی اظہار کرتا ہے۔ کیونکہ شاہ ولی اللہ نے جگہ جگہ بادشاہت کے خلاف اور معاشرے پر اس کے مہلک اثرات کا تذکرہ کیا ہے اس ظالمانہ نظام کا تجزیہ کیا ہے۔ چنانچہ حجۃ البالغہ میں لکھتے ہیں۔

"ایران اور روما کی سابق تاریخ ہمارے سامنے روشن مثال ہے اور جو کچھ تم اپنے ملک میں دیکھ رہے ہو۔ اس سے ایران اور روما کی حالت کا اندازہ کر لو، دولت و ثروت کے ساتھ فلسفہ اور سائنس کی تحقیقات نے ایجادات کا راستہ کھولا نئی نئی صنعتیں رونما ہوئیں اور ملک اپنے اس دور میں تمدن کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گیا۔ لیکن بد قسمتی سے اہلِ ثروت اور حکمران طبقہ میں عیش، فیشن اور وجاہت یا اقتدار پرستی اور ایک دوسرے کے مقابلے میں تفاخر (بڑھ چڑھ کر رہنے) کا مرض پیدا ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس پر فخر ہونے لگا کہ کس کا تاج زیادہ قیمتی ہے اور کس کے

سر پر سلطنت میں زیادہ جواہر ٹکے ہوتے ہیں۔

ارباب حکومت کے اس ٹھاٹھ نے سوسائٹی کا مزاج بگاڑ دیا نئے نئے فیشن، امیرانہ شان و شوکت اور شاہانہ تکلفات نبھانے کے لیے ہر ایک صاحب اقتدار اپنے ماتحت کو لوٹنے لگا، زمیندار اور جاگیر دار کاشت کاروں کا خون چوسنے لگا جو مزدوروں پر اختیار رکھتے تھے انھوں نے غریب مزدوروں کو نوچنا شروع کر دیا۔ اب اس با اقتدار طبقہ کی تمام عملی اور فکری طاقتیں ترقیِ ملک و دولت کی بجائے عیش و عشرت، شاہانہ تکلفات، نفع اندوزی اور استحصال بالجبر پر صرف ہونے لگیں اور ماتحت طبقہ اتنا گر گیا کہ اس کی زندگی کھیت جوتنے والے بیلوں اور بوجھ اٹھانے والے گدھوں گھوڑوں کی مانند ہوگئی۔ زرکشی اور زر اندوزی کے لیے نئے نئے قانون ایجاد کیے۔

مزدور اور کسان طبقہ اگر ان سے سرتابی کرتا تو مجرم بن کر طرح طرح کی سزاؤں میں مبتلا ہوتا اور اگر سزاؤں سے بچنا چاہتا تو لامحالہ بار بردار گھوڑوں اور گدھوں کی زندگی پر مجبور ہوتا۔ یہ دونوں اپنے اپنے حالات میں ایسے غرق ہو گئے کہ پیدائش انسان کا حقیقی مقصد کسی کے سامنے بھی نہیں رہا۔ ایک طبقہ کو حد سے بڑھے ہوئے عیش و دولت کی چمک دمک نے اندھا کر دیا اور دوسرا طبقہ پیٹ کی فکر میں ایسا سرگرداں ہوا کہ فکرِ مستقبل کی صلاحیت بھی ختم کر بیٹھا۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ تمام دولت سمٹ کر چند افراد کے ساتھ مخصوص ہوئی۔ جن کا سربراہ بادشاہ تھا۔

اقتصادی عدم توازن اور طبقہ اعلیٰ کی شان و شوکت اور عیش پرستی نے ایک تیسرا طبقہ پیدا کر دیا۔ یہ تن آسان، آرام طلب، سرکار پرست خوشامدیوں کا طبقہ تھا۔ جو بادشاہ اور شاہ پرستوں کے گرد جمع ہو گیا تھا اور مختلف عنوانات سے رقمیں وصول کرتا رہتا تھا۔ ان میں بہت سے صاحب فن و اہلِ علم بھی ہوتے تھے وہ فن اور علم کے نام پر روپیہ وصول کرتے تھے مگر ان کا مطمع نظر ملک کی خدمت نہیں بلکہ اپنی ذاتی اغراض، ذاتی جاہ و جلال اور ذاتی اقتدار ان کی جدوجہد کا نصب العین ہوتا تھا کوئی اس نام سے روپیہ

وصول کرتا تھا کہ وہ خاص سپاہ گری کا ماہر ہے۔ بہترین کمانڈر یا جرنیل ہے کوئی اپنے علم و ہنر اور سیاست دانی کے نام پر روپیہ وصول کرتا تھا۔ خانقاہ نشینوں کی ایک جماعت تھی جو تقدس کے نام وظیفے حاصل کرتی تھی، ایک جماعت تھی جو فنون لطیفہ و ادب، یہ شاعری کے نام پر رقمیں اینٹھتی تھی کہ شانِ خسروانہ یہی ہے کہ فنون لطیفہ کے ماہرین کی قدر کرتے ہیں۔

بادشاہ یا امراء کو خوش کرنا، خوش گپیوں سے گرمی مجلس پیدا کرنا ایک فن قرار دے دیا گیا تھا اور اس فن کے ماہرین طرح طرح کے ڈھونگ رچا کر روپیہ وصول کرنے لگے تھے، شاہانہ آداب، درباری آداب ایک خاص فن بن گیا اور ایک گروہ اسی طرح اس نام پر رقمیں وصول کرنے لگا۔ یہ تمام جماعتیں جن کو لازمہ تمدن مان لیا گیا تھا، درحقیقت مفت خوروں کے گروہ تھے جو ملک اور قوم کی خدمت کے بجائے اپنی تمام صلاحیتیں مٹھی بھر شاہ پرستوں کی اغراض اور ان کی خوشنودی کے لیے صرف کرتے تھے اور ملک اور ملک کے مزدوروں اور کسانوں پر بوجھ بنتے جا رہے تھے اس طرح خدا کی تمام مخلوق دن بدن افلاس فلاکت اور تباہ حالی میں مبتلا ہو کر روحانی فلاح و بہبود سے بھی محروم ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ پورے ملک میں بھی کوئی شخص ایسا نہیں ملتا تھا جسکو عاقبت کی فکر ہو۔ اللہ تعالے جو تمام مخلوق کا پروردگار ہے۔ اس نے رسول اللہ کو مبعوث فرمایا۔ تاکہ وہ روحانی اصلاحات کے ساتھ اقتصادی تباہ حالی بھی ختم فرمائیں اور معیشت کے ایسے اصول تلقین فرمائیں جن سے اقتصادی امراض کے مسموم جراثیم کا قلع قمع ہو جائے چنانچہ ایک قوم فرض کرو جس میں ملوکیت نہ ہو، شاہانہ شان و شوکت اور عیش پرستی کے لوازمات سے محروم ہو۔ ہر شخص اقتصادی طور پر آزاد ہو ٹیکسوں کے بوجھ سے اس کی کمر دوہری نہ ہوئی ہو، ایسی قوم کو یہ فراغت میسر ہو گی کہ وہ دین و ملت کے لیے کام انجام دے سکے۔ اخلاقی اور روحانی قوت حاصل کر سکے لیکن اگر اس قوم کی گردن پر ملوکیت، شاہ

پرستی اور سرمایہ کا بھوت سوار ہو جاتے تو اس کے ہوش و حواس گم ہو جائیں گے اور وہ انسانی شرف و عظمت سے گر کر چوپاؤں کی زندگی پر مجبور ہو جائے گی۔ جن کو رات دن پیٹ کا فکر رہتا ہے اور پھر بھی یہ جہنم بھرنے نہیں پاتا۔"

(حجۃ اللہ البالغہ جلد اول باب اقامۃ الارتفاقات و اصلاح الرسوم)

شاہ ولی اللہ کے ان تمام اقتباسات سے ان کے سیاسی، سماجی اور دینی افکار کا پوری طرح اظہار ہو جاتا ہے اس لیے ان افکار کی روشنی میں جب ہم شاہ ولی اللہ کے احمد شاہ ابدالی کے نام مکتوب کو دیکھتے ہیں تو فوراً یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ایک شخص جو بادشاہت اور ملوکیت کو تمام برائیوں، خرابیوں اور معاشرے کی آلائشوں کا منبع گردانتا ہے۔کیونکر پھر ان آلائشوں کی دوری کے لیے ایک بادشاہ کو ہی کیوں پکارتا ہے اس کے دروازے پر ہی کیوں دستک دیتا ہے کہ آؤ اور اس برِ صغیر کو افراتفری اور انتشار سے نجات دلاؤ۔

اس سوال کا جواب اور اس صورت حال کا تجزیہ وہی ہے جو جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اس روبہ زوال معاشرے اور اس اقتصادی بدحالی سے نجات دلانے کے لیے۔ جو نئے طبقات آگے آسکتے تھے وہ ہندوستان کی اور بالخصوص مسلم معاشرے میں ابھی وجود میں نہیں آئے تھے اس لیے شاہ صاحب کے فکر کو لے کر سماج کو عملی طور پر تبدیل کرنے والے طبقے چونکہ موجود نہ تھے اس لیے اس وقت افراتفری اور انتشار سے محفوظ و مامون رہنے کی عملاً ایک ہی راہ تھی کہ کسی صاحبِ شمشیر کو پکارا جائے۔اس سے امداد طلب کی جائے اس کو اپنی طرف سے قائل کیا جائے کہ وہ ظلم و جور نہ کرے اور عدل و انصاف کے ساتھ مضبوط مرکزی حکومت قائم کرے۔

یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ شاہ صاحب نے ہی صاحبِ شمشیر کو مدد کے لیے نہیں پکارا بلکہ اس راہ پر ان کے خانوادے کے دوسرے اکابرین بھی کافی دنوں تک چلتے رہے۔ اور یہ فکر و عمل کا تضاد سالہا سال جاری رہا۔ اور سچ یہ ہے کہ یہ سلسلہ شیخ الہند نے پہلی جنگ عظیم تک جاری و ساری رکھا۔

ایک اور بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے۔کہ اس وقت کے حالات میں جو علماء سماجی تبدیلیوں کی ضرورتوں کو محسوس بھی کرتے تھے، عامۃ الناس کی اقتصادی بدحالی سے مشوش بھی تھے اور

بادشاہت اور اس کے نظام سے بھی نالاں تھے۔ لیکن علاوہ بادشاہت کے علاوہ کسی اور نظام سے روشناس بھی نہ تھے اور وہ خود اور ان کے جاگیردار پیروکار بھی بادشاہت کے ہی حلقہ کے اسیر تھے۔ اس لیے کہ یہ بادشاہت ہی ان کے مفادات کی حفاظت کر سکتی تھی۔

نیز اس وقت کی افراتفری اور لوٹ مار نے ہر طبقہ کو ایک مضبوط مرکزی حکومت کا طالب بنا دیا تھا۔ چنانچہ یہ ضرورتیں تھیں جس کے تحت ایک طرف شاہ ولی اللہ نے اگر احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دی تو دوسری طرف احمد شاہ ابدالی کو نظام الملک آصف جاہ، حافظ رحمت اللہ خاں اور نجیب الدولہ روہیلہ سرداروں نے بھی ہندوستان پر حملہ کی دعوت دی تھی اور بقول "سید محمد میاں" تاکہ اپنے سیاسی حریفوں شیعہ نوابوں اور مرہٹوں وغیرہ کے مقابلے میں ان کو قوت حاصل ہو اور سلطنت دہلی کی وزارتِ عظمیٰ ان کے پلے پڑ جائے اس طرح سے ان حالات نے صاحب فکر عالموں اور جاگیرداروں اور سرداروں کے مفادات کو ایک حد تک ہم آہنگ کر دیا تھا۔ چنانچہ یہ تضاد کسی نہ کسی صورت میں قائم چلا آتا رہا اس لیے ہمارے ہاں کے علماء اور مورخ جب ان علماء کے فکر کے انقلابی پن کا اظہار کرتے ہیں تو وہ تصویر کا صرف ایک پہلو ہوتا ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ عملاً اس فکر کے نفاذ کے لیے جن طاقتوں پر انحصار کیا جاتا رہا ہے وہ اس فکر کی دشمن تھیں۔ اس لیے لامحالہ یہ فکر ان عوام دشمن طاقتوں کو ایک حد تک تقدس بخشنے کے کام آتا رہا۔ چنانچہ خود مولانا عبید اللہ سندھی بھی اس حقیقت کی طرف متعدد جگہ اشارہ کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ "شاہ ولی اللہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو گو خود بڑا صاحبِ مال و جائداد نہ تھا لیکن شاہی جاگیردارانہ نظام کے بچے کھچے حصے کا وارث وہ ضرور تھا۔ اس لیے قدرتاً شاہ صاحب کے ہاں میانہ روی اور اعتدال ہے۔" مولانا عبید اللہ آگے چل کر فرماتے ہیں" شاہ ولی اللہ سلطنت کے امراء و اکابر کے ذریعے انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے۔ اس میں وہ ناکام رہے۔"

اس تضاد کو صرف عبید اللہ سندھی نے ہی تسلیم نہیں کیا بلکہ عبید اللہ سندھی کے فکری نتائج کے مخالف مولانا مودودی نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے چنانچہ آج سے قریب قریب ۴۰ چالیس برس پہلے رسالہ "الفرقان" جو بریلی سے شائع ہوتا تھا، نے شاہ ولی اللہ نمبر شائع کیا۔ اس میں ہندوستان کے جید علماء نے شاہ ولی اللہ اور ان کی تعلیمات پر مضامین اور تجزیے شائع کیے تھے۔ ان میں مولانا مودودی کا طویل مضمون بھی شامل تھا جو بعد میں الگ کتابی صورت میں "تجدید احیائے دین" کے نام سے بھی چھپ گیا تھا۔ اس میں مولانا مودودی لکھتے ہیں۔

"جس دور میں ہمارے ہاں شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب اور اسماعیل شہید پیدا ہوئے اسی دور میں یورپ قرونِ وسطیٰ کی نیند سے بیدار ہو کر نئی طاقت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور وہاں علم و فن کے محققین اور مکتشفین اور موجدین اس کثرت سے پیدا ہوتے تھے جنھوں نے ایک دنیا بدل ڈالی۔ وہی دور تھا جس میں ہیوم، کانٹ، نتشے، ہیگل، اور مل جیسے فلاسفر پیدا ہوئے، جنھوں نے منطق و فلسفہ، اخلاقیات نفسیات اور تمام علومِ عقلیہ میں انقلاب برپا کیا۔ وہی دور تھا جب طبعیات میں گیلوینی اور وولٹا۔ علمِ الکیمیا میں پریسٹلے ڈیلوئی، ہاآوی اور برزیلیس۔ حیاتیات میں لینے، ہالر، بیشاآت اور وولف جیسے محققین اٹھے جن کی تحقیقات نے صرف سائنس ہی کو ترقی نہیں دی بلکہ کائنات اور انسان کے متعلق بھی ایک نیا نظریہ پیدا کر دیا۔ اسی دور میں کوئسنے، ٹرگوٹ، آدم سمتھ، اور مالتھس کی دماغی کاوشوں سے معاشیات کا نیا علم مرتب ہوا۔ وہی دور تھا جب فرانس میں روسو، والٹیر، مونٹسکیو، لامیٹری، کیبا آمینس، بغوں، رو بنیہ، انگلستان میں طامس پین، ولیم گوڈون، ڈیوڈ ہارٹلے، جوزف پریسٹلے، ڈارون اور جرمنی میں گوئٹے، شیلر، جیسے لوگ پیدا ہوئے، جنھوں نے اخلاقیات، ادب قانون، مذہب، سیاسیات اور تمام علومِ عمرانی پر زبردست اثر ڈالا اور انتہائی جرأت اور بے باکی کے ساتھ دنیائے قدیم پر تنقید کر کے نظریات و افکار کی ایک

نئی دنیا بدل ڈالی۔ پریس کے استعمال، اشاعت کی کثرت، اسالیب بیان کی ندرت اور مشکل اصطلاحی زبان کے بجائے عام فہم زبان کو ذریعہ اظہار خیال بنانے کی وجہ سے ان لوگوں کے خیالات مناسب وسیع پیمانے پر پھیلے انھوں نے محدود افراد کو نہیں بلکہ قوموں کو بحیثیت مجموعی متاثر کیا۔ ذہنیتیں بدل دیں۔ اخلاق بدل دیے، نظامِ تعلیم بدل دیا۔ نظریۂ حیات اور مقصد زندگی بدل دیا اور تمدن و سیاست کا پورا نظام بدل دیا۔ اسی زمانے میں انقلاب فرانس رونما ہوا جس سے ایک نئی تہذیب پیدا ہوئی۔ اسی زمانہ میں مشین کی ایجاد نے صنعتی انقلاب برپا کیا۔ جس نے ایک نیا تمدن، ایک نئی طاقت اور نئے مسائل زندگی پیدا کیے اسی زمانے میں انجینئرنگ کو غیر معمولی ترقی ہوئی جس سے یورپ کو وہ قوتیں حاصل ہوئیں کہ پہلے دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہ ہوئی تھیں اسی زمانہ میں قدیم فن جنگ کی جگہ نیا فن جنگ، نئے آلات اور نئی تدابیر کے ساتھ پیدا ہوا۔ باقاعدہ ڈرل کے ذریعے سے فوجوں کو منظم کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس کی وجہ سے میدان جنگ میں پلٹنیں مشین کی طرح حرکت کرنے لگیں اور پرانے طرز کی فوجوں کا ان کے مقابلے میں ٹھہرنا مشکل ہوگیا۔ فوجوں کی ترتیب عساکر کی تنظیم اور جنگی چالوں میں پیہم تغیرات ہوتے اور ہر جنگ کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر اس فن کو برابر ترقی دی جاتی رہی۔ آلات حرب میں بھی مسلسل نئی ایجادیں ہوتی چلی گئیں۔ قلعہ شکن توپیں پہلے سے بہت زیادہ طاقتور تیار کی گئیں اور کارتوس کی ایجاد نے نئی بندوقوں کے مقابلے میں پرانی توڑے دار بندوقوں کو بے کار کر کے رکھ دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ یورپ میں ترکوں کو اور ہندوستان میں دیسی ریاستوں کو جدید طرز کی فوجوں کے مقابلے میں مسلسل شکستیں اٹھانی پڑیں اور نپولین نے مٹھی بھر فوج سے مصر پر قبضہ کر لیا۔

معاصر تاریخ کے اس سرسری خاکے پر نظر ڈالنے سے بآسانی یہ بات معلوم

ہو جاتی ہے کہ ہمارے ہاں تو چند اشخاص ہی پیدا ہوتے تھے مگر وہاں تو قومیں کی قومیں ہی جاگ پڑیں۔ یہاں صرف ایک جہت میں تھوڑا سا کام ہوا تھا اور وہاں ہر جہت میں ہزاروں گنا زیادہ کام کر ڈالا گیا۔ بلکہ کوئی شعبۂ زندگی ایسا نہ تھا۔ جس میں پیش قدمی نہ کی گئی ہو۔ یہاں شاہ ولی اللہ اور ان کی اولاد نے چند کتابیں خاص خاص علوم پر لکھیں جو ایک نہایت محدود حلقے تک پہنچ کر رہ گئیں اور وہاں لائبریریوں کی لائبریریاں ہر علم و فن پر تیار ہوئیں جو تمام دنیا پر چھا گئیں اور آخر کار دماغوں اور ذہنیتوں پر قابض ہو گئیں۔ یہاں فلسفہ، اخلاقیات اجتماعیات، سیاسیات اور معاشیات وغیرہ علوم پر طرح نو کی بات چیت محض ابتدائی اور سرسری حد تک ہی رہی جس پر آگے کچھ کام نہ ہوا۔ اور وہاں اس دوران میں ان مسائل پر پورے پورے نظام فکر مرتب ہو گئے جنھوں نے دنیا کا نقشہ بدل ڈالا، یہاں علوم طبعیہ اور قوائے مادیہ کا عالم وہی رہا جو پانچ سو سال پہلے تھا اور وہاں اس میدان میں اتنی ترقی ہوئی اور اس ترقی کی بدولت اہلِ مغرب کی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ ان کے مقابلے میں پرانے آلات و وسائل کے زور سے کامیاب ہونا قطعی محال تھا۔

حیرت تو یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کے زمانے میں انگریز بنگال پر چھا گئے اور الٰہ آباد تک ان کا اقتدار چھا چکا تھا مگر انھوں نے اس نئی ابھرنے والی طاقت کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ شاہ عبدالعزیز کے زمانے میں تو دہلی کا بادشاہ انگریزوں کا پنشن خوار ہو چکا تھا اور قریب قریب سارے ہندوستان پر انگریزوں کے پنجے جم چکے تھے مگر ان کے ذہن میں بھی یہ سوال پیدا نہ ہوا کہ آخر کیا چیز اس قوم کو اس طرح بڑھا رہی ہے اور نئی طاقت کے پیچھے اسباب طاقت کیا ہیں۔ سید صاحب اور شاہ اسماعیل شہید عملاً اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے اٹھے تھے سارے انتظامات تو کیے۔ مگر اتنا نہ کیا کہ اہلِ نظر علماء کا ایک وفد یورپ بھیجتے اور

تحقیق کراتے کہ یہ قوم جو طوفان کی طرح چھائی چلی جا رہی ہے اور نئے آلات نئے وسائل نئے طریقوں اور نئے علوم و فنون سے کام لے رہی ہے اس کی اتنی قوت اور اتنی ترقی کا راز کیا ہے، اس کے گھر میں کس نوعیت کے ادارات قائم ہیں، اس کے علوم کس قسم کے ہیں۔ اس کے تمدن کی اساس کن چیزوں پر ہے اور اس کے مقابلے میں ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے۔"

(الفرقان کا ولی اللہ نمبر ۱۹۴۰ء ۔ صفحہ ۹۶، ۹۷، ۹۸)

مودودی صاحب جو دلائل و براہین کی اقلیم کے شاہ سوار ضرور ہیں لیکن ان میں ایک اور خوبی بھی ہے کہ وہ دلائل و براہین کی پوری کی پوری عمارت ایسے مفروضوں اور ایسے حقائق پر تعمیر کرتے ہیں جن کا اصل میں وجود ہی نہیں ہوتا۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے کی تحریک کی ناکامی کی وجوہات کی جو پوری عمارت کھڑی کی ہے اس میں ظاہری سچائی ضرور ہے۔ لیکن جسے بنیادی سچائی کہتے ہیں وہ مفقود ہے۔ کیونکہ اصل سوال تو جوں کا توں رہتا ہے کہ یورپ میں جو فکری، سائنسی، صنعتی انقلاب برپا ہوا وہ ہمارے ہاں کیونکر برپا نہیں ہوا؟ یہ سمجھنا کہ چونکہ شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے نے علماء کا کوئی وفد یورپ میں نئے حالات سے روشناس ہونے کے لیے نہیں بھیجا تھا۔ اس لیے وہ تحریک کو کامیابی و کامرانی سے ہمکنار نہیں کر سکے حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ ہندوستان کے شہنشاہ دنیا سے اتنے الگ تھلگ نہ تھے۔ چنانچہ ابو الفضل ہمیں بتاتا ہے کہ شہنشاہ اکبر کو کولمبس کے امریکہ دریافت کرنے کا علم تھا۔ اور جہانگیر کے عہد میں تمباکو امریکہ سے یورپ ہوتی ہوئی ہندوستان پہنچی اور باوجودیکہ جہانگیر نے اس کا رواج روکنا چاہا یہ نہایت حیرت انگیز تیزی کے ساتھ ملک میں رائج ہو گئی۔ یہی نہیں بلکہ مغلوں کے پورے عہد میں ہندوستان کے وسطی ایشیا کے ساتھ تعلقات قائم رہے یہ تعلقات روس تک پھیلے ہوئے تھے اور ایسے تاریخی حوالے موجود ہیں جن سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ ہندوستان سے سیاسی اور تجارتی سفارتیں بھیجی گئیں ۱۵۳۵ء میں بابر کا سفیر خواجہ حسین روس کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کرنے ماسکو گیا۔ زار مائیکل فیدرووچ

۱۶۱۱ء سے ۱۶۲۵ء کے عہد حکومت میں ہندوستانی تاجر والگا کے میدان میں آباد ہوتے ۱۶۲۵ء میں استراخاں میں وہاں کے گورنر کے حکم سے ایک ہندوستانی سرائے قائم ہوئی ہندوستان سے دستکاریاں بالخصوص جولاہے ماسکو لائے گئے ۱۶۹۵ء میں ایک روسی تاجر دہلی آیا۔ اس نے اورنگ زیب سے بھی ملاقات کی۔ ۱۷۲۲ء میں پیٹر اعظم نے استراخاں کا دورہ کیا۔ اور وہاں پر ہندوستانی تاجروں سے ملاقات کی۔ اور تو اور ۱۷۴۵ء میں سادھوؤں کی ایک منڈلی نے بھی استراخاں کا دورہ کیا۔ ان میں دو سادھو وہاں بس گئے اور روسی رعایا بن گئے اور ابھی حال ہی میں تاشقند کے قرب و جوار میں پنجابیوں کی ایک بستی کا چرچا ہوا ہے اور روس میں پاکستانی سفارت خانے کے ایک اہلکار نے اس ضمن میں تحقیق کی ہے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ شاہ ولی اللہ اور ان کا خانوادہ باہر کی دنیا سے بالکل لاعلم تھے بالخصوص جبکہ خود شاہ صاحب اس طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ ۱۷۲۸ء میں حج کے لیے گئے تو وہ دو سال تک حجاز میں مقیم رہے اور علمی اور روحانی مشاغل کے ساتھ ساتھ وہ یورپ اور ایشیا کے زائرین سے ان ممالک کے متعلق پوری واقفیت اور علم حاصل کرتے رہے۔ چنانچہ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"احوالِ ہند بر ما مخفی نیست کہ خود مولا و منشاء فقیر است۔ بلاد عرب نیز دیدیم و احوال مردم ولایت از ثقافت اینجا شنیدیم"۔

(کتاب التمہید فی ائمۃ التجدید بحوالہ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک صفحہ نمبر ۱۱)

حقیقت یہ ہے کہ نہ تو کسی ملک میں نظام نو یا سماجی تبدیلی کی تحریک صرف اس وجہ سے ناکام ہو جاتی ہے کہ بیرونی دنیا سے اس نے رہنمائی نہیں حاصل کی۔ آخر یورپ میں جو اتھل پتھل ہوئی سماجی اور صنعتی انقلاب بپا ہوتے تو انھوں نے کہاں سے رہنمائی حاصل کی تھی۔ دراصل یہ سماجی تبدیلیاں، یہ انقلاب اس وقت ہی ممکن ہوتے ہیں۔ جب انقلاب بپا کرنیوالی طاقتیں ابھرنے لگتی ہیں اور ان کا ابھار اور پھیلاؤ سماج کے پرانے ڈھانچے سے متصادم ہوتا ہے تو پھر یہ انقلاب بپا ہوتے ہیں۔ اب جو باتیں مودودی صاحب نے یورپ کے اندر

علم و دانش کی ترقی کے سلسلہ میں کہی ہیں وہ بالکل درست ہیں لیکن وہ یہ کیوں فراموش کر دیتے ہیں کہ علم و دانش کو یورپ میں پروان چڑھتے چڑھتے تین صدیاں لگ گئی تھیں۔ جو نظام ہمارے ہاں ایک طرح سے قائم و دائم تھا وہ یورپ میں ٹوٹ چکا تھا۔ جاگیرداری کی کوکھ سے تاجر طبقہ جنم لے رہا تھا اور تاجر طبقے اپنی ضرورتوں کے لیے دنیا کا چپہ چپہ چھان رہے تھے۔ یہ کولمبس اور واسکوڈی گاما کون تھے؟ یہ نئے تاجر طبقہ کے نمائندے تھے جو نئی دنیا کی تلاش میں نکلے تھے۔ کیونکہ یہ حقیقتیں ہمیں فراموش نہیں کرنی چاہییں کہ چودھویں اور پندرھویں صدیوں میں جب بحری قزاقی پروان چڑھ رہی تھی اور پرتگیزی اور ہسپانوی اور بعد میں برطانوی ملاح بحری جہازوں میں بیٹھ کر روئے زمین کے نئے نئے خطوں اور علاقوں کی تلاش میں سرگرداں اور مارے مارے پھر رہے تھے اور سمندر کی موجوں کے تھپیڑے کھا رہے تھے تو یہ خود یورپ کا بڑا افراتفری کا زمانہ تھا۔ یورپ کے پرانے طبقاتی رشتے ٹوٹ رہے تھے اور اہم تبدیلیوں کے لیے فضا تیار ہو رہی تھی۔ جب پندرھویں صدی کی آخری دہائی میں کولمبس نے نئی دنیا "امریکہ" کو تلاش کیا تو اس نے یورپ کو ایک انقلاب سے دوچار کر دیا۔ اس نئی دنیا نے یورپ کے اندر پرانے طبقاتی رشتوں کے توڑ پھوڑ کے عمل کو اور تیز کر دیا۔ اور نئے طبقوں کی ترقی اور نشوونما میں بہت مدد کی اور سچ یہ ہے خود ان سیاحوں اور ملاحوں کی ان سرگردانیوں، آوارہ گردیوں اور سمندر پیمائیوں اور نئی دنیا کی تلاش کے لیے بے تابی اور بے چینی کی پشت پر بھی نئے طبقوں کی خواہشات کام کر رہی تھیں یہ نئے طبقے ازمنۂ وسطیٰ کے جاگیرداری دور کے تاجر اور بنیے تھے۔ چنانچہ خود کولمبس کی پہلی مہم کے لیے سرمایہ کی فراہمی میں اسپین اور پرتگال کے دو تاجروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ کیونکہ ان تاجروں کے لیے اندرون ملک کی زبوں حالی کے پیش نظر باہر کی دنیا زیادہ اہمیت اختیار کر گئی تھی ویسے بھی یہ وہ زمانہ تھا جب جاگیرداری دور کی گھٹن اب شہروں اور اس میں بسنے والے صنعت کاروں اور ساہوکاروں کو پریشان کرنے لگی تھی اور ان میں کھلی فضا کی تلاش ایک جذبہ کی صورت اختیار کر گئی تھی چنانچہ اس دور میں لاانداز آوارہ گرد ملاح جو بحری قزاق بھی کہلاتے تھے گروہ در گروہ بحر الکاہل سے نکل کھڑے ہوتے اس کے علاوہ سونے کی تلاش کی خواہش

اور جذبہ بھی ان مہموں کی پشت پر کام کر رہا تھا۔ کیونکہ پورے یورپ کے پاس اسوقت مشرق کے ساتھ تجارت کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے کوئی قیمتی دھات موجود نہ تھی چنانچہ نوولس اپنی مشہور کتاب "ہماری سلطنت کی نشوونما" میں لکھتا ہے۔

"مشرق سے تجارت کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ اور مشکل یہ تھی کہ یورپ کے پاس ایسی چیزیں بہت کم تھیں جن کی مشرق میں مانگ ہوتی مثلاً شاہی درباروں کے لیے عیاشی کا سامان، سیسہ، تانبہ، پارہ، ٹین، سونا اور ہاتھی دانت ان کے علاوہ ہندوستان میں چاندی کی بھی کھپت ممکن تھی اس لیے یہ تاجر زیادہ تر چاندی لے کر آتے تھے۔"

چنانچہ یہ سونے اور چاندی کی تلاش بھی ایک ضرورت بن گئی تھی۔ انہی ضرورتوں اور جذبوں اور خواہشوں نے "نئی دنیا" کی تلاش کی مہم کو مہمیز لگائی۔ اور جب یہ نئی دنیا تلاش ہو گئی تو اس نے یورپ کی کایا پلٹ دی اور پہلی بار یورپ کو اپنے باہر کی نسل کے لوگوں پر اپنا تسلط جمانے کا موقعہ ملا اور ساتھ ہی جاگیرداری سے تنگ آتے ہوئے لوگ شہروں کے تاجر صناع بنئے، آوارہ گرد قزاق، لٹیرے، بھوکے ننگے سبھی اس نئی دنیا کی طرف نئے خوابوں اور سپنوں کو سینے سے لگائے ہوئے دوڑنے لگے۔ اور جس طرح یورپ پر صدیوں پہلے رومن، نارمن اور عرب چڑھ دوڑے تھے۔ اسی طرح یورپ آج نئی دنیا پہ چڑھ دوڑ رہا تھا اس تسخیر اور مہم جوئی نے تاجر طبقے کو بے پناہ تقویت دی اور وہ یورپ کے مختلف ممالک میں جگہ جگہ جاگیرداروں کے اقتدار کے خلاف نبرد آزما ہونے لگا اور کئی ملکوں میں تو خود شہنشاہوں نے اس نئے طبقے کے ساتھ مل کر جاگیرداروں کو شکست دینے کا عمل شروع کیا۔ کیونکہ طاقتور جاگیردار ہمیشہ بادشاہ کے لیے عذابِ جان بنے رہتے ہیں۔ لیکن اس زمانے میں رونما ہونے والے صلیبی جنگوں نے بھی جاگیرداروں کے اقتدار کے زوال کے عمل میں بہت مدد کی تھی۔ کیونکہ گیارہویں صدی میں جو صلیبی جنگیں شروع ہوئیں دو صدی تک ان کا چرچا یورپ کے کلیساؤں میں رہا۔ اور کلیسا جاگیردار کو روپیہ اور فوجیں فراہم کرنے کے لیے اکساتا رہا۔ ان صلیبی جنگوں

کے اخراجات نے ان جاگیرداروں کی کمر توڑ دی اور ان کو ان جنگوں کو جاری رکھنے اور خدائے یسوع مسیح کو خوش کرنے کے لیے ازمنہ وسطیٰ کے شہری تاجروں اور بنیوں سے روپیہ قرض لینا پڑا۔ ان قرضوں نے ان کے جاگیردارانہ اثر و رسوخ کو ایک طرف کمزور کیا تو دوسری طرف ان شہری تاجروں اور بنیوں کو نئی زندگی بخشی۔ چنانچہ اسی نئی زندگی نے ان تاجروں کو ابتدائی صنعت کاری کی طرف رجوع کیا۔ چنانچہ چودھویں اور پندرھویں صدی میں ہم یورپ میں ان تاجروں کی کایا کلپ ہوتے دیکھتے ہیں۔ جو تاجر پہلے یورپ کی منڈیوں میں صرف اشیا خریدنے اور فروخت کرنے کا دھندا کرتا تھا وہ اب مختلف علاقوں میں دستی صنعت کاروں کو اپنے تحت کرتا نظر آتا تھا۔ انھیں یہ تاجر خام مال مہیا کرتا ہے اور اس سے مصنوعات تیار کراتا ہے اس طرح دستی صنعت کار آہستہ آہستہ آزاد صنعت کار سے اس تاجر کا تنخواہ دار صنعت کار بننے لگتا ہے صرف یہی نہیں بلکہ بعض جگہوں پر تو اوزار تک ان تاجروں نے صنعت کار کو مہیا کیے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ مصنوعات تیار کر سکے۔ جنھیں یہ تاجر باہر کی منڈیوں میں فروخت کر سکیں اس طرح سے سرمایہ داری اور صنعتی سرمایہ داری کے رشتوں کی داغ بیل پڑنے لگی۔ ادھر جاگیرداری کے زوال نے ہزاروں لاکھوں مزارعوں کو آزاد کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین پر بھی سرمایہ دارانہ اور تاجرانہ رشتے استوار ہونے لگے۔ بعض ایسی فصلیں اگائی جانے لگیں جو خام مال مہیا کر سکیں اور ساتھ ہی مزارع وہاں کے جاگیردار کے غلام کے طور پر نہیں بلکہ اس تاجر کے تنخواہ دار کے طور پر کام کرنے لگا اور اس طرح جو تجارت بحیرہ روم میں ہوتی تھی اس کا رخ اب بحرالکاہل سے جہاں نئی دنیا آباد تھی، ہونے لگی۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ۱۴۹۳ء یعنی کولمبس کی مہم کے ایک سال بعد قسطنطنیہ پر ترکوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس وجہ سے بھی یورپی تاجروں کا رخ بحرالکاہل کی طرف زیادہ ہونے لگا یہ درست ہے کہ ترکوں نے تجارت کے دروازے بند نہیں کیے تھے اور ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تجارت اس کے بعد بھی ہوتی رہی۔ لیکن ایک بات ضرور ہوئی کہ بحرالکاہل میں ریل پیل بڑھ گئی اور اس ریل پیل سے اٹلی کے وہ شہر جو بحیرۂ روم میں واقع تھے ان کی رونق گھٹنے لگی۔

اسی ریل پیل، اسی تجارت نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو پروان چڑھایا۔ علم و دانش کے سوتے پھوٹنے لگے۔ چنانچہ برطانیہ کی صنعتی تاریخ کے مشہور ماہر ڈاکٹر کننگھم نے اپنی انگریزی کتاب عُہد جدید میں برطانوی صنعت و تجارت کی ترقی میں بتایا ہے کہ اس عہد میں اتنے بڑے پیمانے پر ایجادیں صرف اس لیے نہیں ہونے لگیں کہ لوگوں کی ذہانت اس طرح پھوٹ پڑی کہ جس کی کوئی توجیہہ نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ ملک میں سرمایہ اتنا اکٹھا ہو گیا کہ ان ایجادات کے مصرف نکلنے کا امکان پیدا ہو گیا۔ چنانچہ وہ یوں لکھتا ہے۔

بعض وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایجادات و انکشافات صرف قسمت سے ہو جاتی ہیں۔ بہت سے لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی میں اتنے بڑے پیمانے پر نئی مشینوں کی ایجادیں اس لیے ہوئیں کہ لوگوں کی ایجادی ذہانت یکایک ابھر آئی جس کی کوئی توضیح نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ آرک رائٹ اور واٹ خوش قسمت تھے کہ حالات ان کے موافق تھے تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم ان کی ذہانت اور ان کے کارناموں کو گھٹا کر دکھانا چاہتے ہیں، ولیم اور ڈاڈو، ڈونے جیسے موجدین کے بعد بھی بے شمار ذہین اور قابل لوگ پیدا ہوئے۔ لیکن حالات ان کے لیے ساز گار نہ تھے۔ جب قیمتی آلات بنائے جاتے ہیں یا ایسے طریقے معلوم کیے جاتے ہیں جن میں لاگت بہت آتی ہے تو اس کے لیے بڑے سرمائے کی ضرورت پڑتی ہے۔ کوئی آدمی خواہ کتنا ہی ذہین اور محنتی کیوں نہ ہو ایسی چیز پر اس وقت تک محنت نہیں کرے گا۔ جب تک اس کو کافی سرمایہ نہ مل سکتا ہو۔ اور جو چیز بنائے اس کے لیے وسیع منڈی نہ ہو۔ اٹھارہویں صدی میں ان دونوں چیزوں کے نقطہ نظر سے حالات زیادہ سے زیادہ موافق بن رہے تھے۔ بنک آف انگلینڈ اور دوسرے بہت سے بنک قائم ہو چکے تھے۔ جن کی وجہ سے سرمایہ اکٹھا ہو رہا تھا۔ اور اب ایک قابل اور ہوشیار آدمی کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ آسان ہو گیا تھا کہ وہ اپنے کاروبار میں نئے قیمتی اور ترقی یافتہ

طریقے رائج کر سکے۔"

(ڈبلیو۔ کننگھم۔ عہد جدید میں برطانوی صنعت و تجارت انگریزی ایڈیشن صفحہ ۶۱۰)

یہ تھے حالات جنھوں نے یورپ کی ترقی کو مہمیز لگائی۔ لیکن اس کے مقابلے میں ہمارے ہاں زرعی اراضی میں نجی ملکیت کے فقدان اور ہمارے دیہات کی خود کفالتی نے نہ تو ہمارے ہاں کے مخصوص زرعی نظام کو ٹوٹنے دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ہاں نہ تو کوئی طاقت ور اور جاندار تاجر طبقہ پیدا ہو سکا اور نہ ہی صنعت کی ترقی کے لیے میدان صاف ہو سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب یورپ میں جگہ جگہ پارلیمانی جمہوریتوں کے لیے فضا سازگار ہو رہی تھی اور اس کے لیے یہ تاجر اور صنعت کار آگے بڑھ کر قیادت سنبھال رہے تھے اور انھی طبقوں کے نمائندے نت نئے انقلابی فلسفی اور مفکر جنم لے رہے تھے۔ یہی فلسفی اور مفکر تھے جو روسو اور والٹیئر کے رُوپ میں انسانی آزادی، مساوات اور حقوق کے نعرے لگا رہے تھے اور انقلاب فرانس کے لیے راہ ہموار کر رہے تھے۔

ہمارے ہاں جب مغل شاہی ٹوٹ رہی تھی اور معاشرے میں اتھل پتھل ہو رہی تھی تو ہم نے بھی شاہ ولی اللہ جیسا مفکر پیدا کیا جنھوں نے سماج کی آلائشوں، ناآسودگیوں کی نشاندہی کی لیکن ان کی مجبوری یہ تھی کہ وہ جاندار اور طاقتور تاجر طبقہ موجود نہ تھا جو ایک طرف ہمارے زرعی نظام کی فرسودگی کو ختم کرتا اور تجارت و صنعت کے لیے میدان ہموار کرتا اور دوسری طرف جمہوری اداروں کی نشوونما کے لیے فضا سازگار بناتا نتیجہ کیا ہوا کہ ہمارے انقلابی مفکروں کو لے دے کے کسی صاحبِ شمشیر بادشاہ، نواب، یا راجے ہی کے در پہ دستک دینی پڑتی۔

باب ۸

ازمنۂ قدیم میں

مذہبی انقلابات

اور اُن کا پس منظر

شاہ ولی اللہ کے فکر و عمل میں جو تضاد نظر آتا ہے اور جس کا میں نے قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر بھی کیا ہے۔ اس تضاد کی بھی اپنی ایک تاریخ ہے کیونکہ صاحبِ شمشیر کی تلاش صرف شاہ ولی اللہ تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ اس سے پہلے بھی عالموں نے صاحب شمشیر کو عدل و انصاف کے لیے پکارا تھا اور شاہ ولی اللہ کے خانوادے نے شاہ صاحب کے بعد بھی پکارا ہے اور ان کے نام لیواؤں اور شاہ ولی اللہ کے مسلک کے پیروکاروں نے آخر دم تک اس اسلوب کو وقتاً فوقتاً اپنایا ہے کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ اور ان سے پہلے کے دور کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اہلِ علم اور اہل دنیا میں ایک تفریق قائم ہو چکی تھی اور ہم لاکھ کہتے رہیں کہ اسلام میں پاپائیت نہیں ہے لیکن عملاً یہ علماء یہ قاضی، یہ فقیہہ ایک الگ طبقے کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ کیونکہ ابتداء میں احکامِ شرعیہ جاری کرنے والا، ان کو نافذ کرنے والا اور ان کی توجیہہ کرنے والا ایک ہی ادارہ ہوتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے معاشرہ قبائلی دور سے گزر کر زیادہ گنجلک ہوتا گیا تو مختلف شعبہ ہائے زندگی میں در آتی گئی۔ چنانچہ یہ تقسیم آج ایک مسلمہ حقیقت اختیار کر گئی۔ اس موضوع پر بیروت کی عدالتِ

مرافعہ کے صدر ڈاکٹر صبحی محمصانی نے اپنی مشہور عربی کتاب "فلسفہ التشریع فی الاسلام" جس کا اردو ترجمہ "فلسفہ شریعت اسلام" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، ہیں اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔

"پس شارع حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے جس نے شریعت اسلامی کے ذریعے دین و دنیا دونوں کے احکام نازل فرمائے اس لیے قدرتی طور پر علم فقہ میں عبادات اور معاملات دونوں سے بحث کی جاتی ہے اور علمائے اصول، علمِ فقہ کو علومِ دینیہ میں شمار کرتے ہیں نیز معاملات کا اپنے اصول و ماخذ، احکام تفسیر، اجتہاد، طریقہ ہائے فکر و تجسس اور استدلال کے اعتبار سے دین کے رشتے میں منسلک ہونا بھی ایک قدرتی امر ہوا ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ قدیم اقوام کے نزدیک معاملات کے احکام دیگر مراسمِ دینی و رسوماتِ دنیوی کے ساتھ مخلوط تھے لیکن قوانین ملکی مسائل دینی سے آہستہ آہستہ مغربی ممالک میں الگ ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ یہ تفریق اس زمانے میں بالکل مکمل ہو گئی جب رومی سلطنت کا آفتاب ترقی کے نصف النہار پر تھا اور آج قانون کا اطلاق صرف شہری امور پر ہوتا ہے اور علمِ قانون معاملات دنیاوی کے لیے وضع کردہ حقوق کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گیا۔ الغرض شریعت اسلامی اپنے ماخذ اور بنیادی احکام کے لحاظ سے خدائی شریعت ہے اور دنیوی قانون کا اطلاق صرف معاملات تک محدود ہے جس کے احکام حکومت صادر کرتی ہے اور حکومت ہی مصالح ملکی کے لحاظ سے قانون وضع کرتی ہے۔ ان میں ترمیم کرتی ہے اور انھیں منسوخ کرتی ہے۔"

اب یہ دوئی جو معاشرے کے ارتقاء کے ساتھ ایک لازمی تقسیم تھی اور وقت کا تقاضا تھا کہ دنیاوی اور دینی معاملات میں تقسیم ٹھہرے۔ لیکن اسی دوئی اور تقسیم سے کتنی قباحتیں بھی پیدا ہوئیں اور ایک طرح سے عالم فاضل فقیہہ اور قاضی ایک طبقہ بنتے گئے، کیونکہ ایک طرف حکومت کے مصالح، اور ان کے مخصوص مطالبات تھے اور قاضی وقت کو ان مصالح کا اور رموز مملکت کا وہ چاہے نہ چاہے تابع ہونا پڑتا تھا اور جب وہ اپنی بالادستی پر اصرار کرتے تھے اور اس امر پر مصر ہوتے تھے کہ

اللہ تعالےٰ کا حکم تمام مصالح اور رموزِ مملکت سے ماورٰی ہے تو پھر اس دنیوی سلطنت اور فقیہہ شہر میں ٹھن جاتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جب بھی حاکموں کے خلاف تحریک اٹھتی تو وہ لامحالہ احکامِ شرعیہ اور مذہب کے نام پر اٹھتی اور بعض دفعہ یہ مذہب کے نام پر اٹھی ہوئی تحریکیں رجعت پسند ہوتیں ہیں اور معاشرے کو پیچھے کی طرف لے جانے کی غیر ارادی اور ارادی کوشش ہوتی ہے اور بعض دفعہ یہ تحریکیں سماجی تبدیلی کی نقیب بن کر ابھرتی ہیں۔ لیکن اکثر و بیشتر ان تحریکوں میں ملے جلے رجحان ہوتے ہیں اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس دوئی کے عمل کو سمجھا جائے۔ کیونکہ علماء جو دین کی بات کرتے ہیں جو دین کو دنیا پر حاوی کرنا چاہتے ہیں اور وہ لوگ جو حکومت کرتے ہیں اور رموز مملکت کو اولیت دیتے ہیں ان کا تصادم صرف اسلام اور مسلمانوں کے اندر ہی رونما نہیں ہوا۔ بلکہ یہ عمل ایک تاریخ رکھتا ہے اور تاریخ کے ادوار اس کش مکش اور تصادم سے اٹے پڑے ہیں اور یہ سلسلہ ازمنۂ قدیم سے جاری ہے اس لیے اس کو سمجھنا ضروری ہے۔

علماء ہوں یا پجاری و پروہت، پاپائے روم ہو یا اس کے پادری جگہ جگہ اور زمانے میں انھوں نے اپنی بالادستی کے لیے جدوجہد کی ہے اور بہت دفعہ یہ کش مکش، یہ جدوجہد بہت دوررس انقلابوں اور تبدیلیوں کا پیش خیمہ بنی ہے۔ اس کش مکش اور تصادم کو ذرا وسیع پس منظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب ایک لازمی اور بنیادی حقیقت ہے۔ کیونکہ انسانی زندگی بالآخر اس کائنات کا ایک جز ہی تو ہے جسے اپنے مادی عمل کے سلسلے میں خود ہی لامتناہی سلسلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہر انقلاب تمام انسانی سرگرمیوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ چنانچہ جدید ترین انقلابات جن کا خمیر سائنس اور مادی و تاریخی جدلیات کے خمیر سے اٹھا ہے انھوں نے صرف سیاست اور معاشیات کی دنیا میں ہی انقلاب بپا نہیں کیا بلکہ یہ انقلاب انسانی زندگی کے رُوحانی اور اخلاقی پہلوؤں پر اثر انداز ہوئے ہیں اور مستقل ہو رہے ہیں۔ کیونکہ ایک وقت تھا جب مذہب اور نام نہاد فوق الفطرت چیزیں انسانی ذہن میں پیش پیش تھیں پرانے لوگ بھی ہماری طرح زندہ تھے لیکن وہ ایک ایسی فضا میں زندگی بسر کر رہے تھے جس میں مذہب، اعتقاد، دیوتا اور دوسری فوق الفطرت باتوں کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی لہذا

اس زمانے کا ہر انقلاب بہت حد تک ایک مذہبی تحریک بن کر نمودار ہوا۔ اس تحریک کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ عقائد و خیالات میں ہلچل مچائی جاتی۔ تبدیلی پیدا کی جائے تغیر رونما ہو چنانچہ یہ نئے خیالات، نئے عقائد ہی مذہبی تعلیمات کا رُوپ اختیار کر لیتے اور اس طرح سے مذاہب نئے سماج اور نئے دنیا کے خالق ٹھہرتے ہیں، انقلاب کے محرک کہلاتے ہیں۔ یہ تو ہوتی تھی ظاہری صورت لیکن اصل میں خود مذہب، مذہب کی تعلیمات، یہ نئے عقائد یہ سب انقلاب کی پیداوار ہوتے تھے۔ بدھ مت یا عیسائیت یا پھر اسلام یہ سب انقلاب کا باعث بنے اور لطف یہ ہے کہ یہ سب مذاہب ایک نہ ایک انداز میں اپنے سے پہلے مذاہب کے پیشہ ور پجاریوں کے خلاف بغاوت کے طور پر وجود میں آتے۔

یہ بات ہمیں فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ خدا کی وحدانیت اور عقیدہ توحید تک پہنچنے کی ایک تاریخ ہے، ہزاروں لاکھوں برس کی جدوجہد ہے کیونکہ انسانی تاریخ کا ایک دور وہ بھی گزرا ہے جب ہر مادی حادثے کا خالق ایک دیوتا کو سمجھا گیا اگر ایک دیوتا کا کام بارش برسانا تھا تو دوسرا طوفان لاتا تھا اور تیسرا سورج طلوع کرتا تھا۔ اس طرح ہر مادی حادثے کے ساتھ کسی نہ کسی دیوتا کا نام وابستہ ہو گیا۔ لیکن یہ وہ تمام مادی حوادث تھے، جن پر ہماری زندگیوں کا انحصار تھا۔ بارش، طوفان، موت، زندگی، آگ، دولت یہ وہ تمام حوادث ہیں جن کے بارے میں انسان کا تجسس شروع دن سے کام کرتا رہا ہے پرانے انسان کی خواہش رہی ہے کہ ان حوادث کو سمجھا جائے اور ان پر اسے تھوڑا بہت قابو اور اقتدار حاصل ہو جائے فطری مذہب اسی خواہش کی پیداوار ہے کیونکہ ایک مرتبہ جب انسان نے اپنی سہولت کے لیے دیوتاؤں کو تخلیق کر لیا ان پر ایمان لے آیا تو بالآخر ان دیوتاؤں تک رسائی کا کوئی ذریعہ دریافت کرنا بھی تو ضروری تھا چنانچہ اس ضرورت نے ان دیوتاؤں کے اوتار، مہاتما اور پجاری پیدا کیے یہ دیوتاؤں کے ایجنٹ ٹھہرے جن کا دعویٰ تھا کہ وہ ان دیوتاؤں کو خوش کر سکتے ہیں۔ چنانچہ دیوتاؤں کو خوش کرنے، ان کو منانے، ان کو مائل بہ کرم کرنے کے لیے دیوتاؤں کے ایجنٹوں کو تحفے و تحائف پیش کیے جانے لگے۔ اس طرح سے ان ایجنٹوں، ان پجاریوں، ان پروہتوں کا ایک

الگ طبقہ وجود میں آگیا اور انھوں نے سماج میں غیر معمولی اقتدار حاصل کرلیا اور اس اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے انھوں نے سماج کے دوسرے طبقوں کا استحصال ہی نہیں کیا بلکہ ان کی ترقی کی راہ میں زبردست رکاوٹ بن گئے۔ چنانچہ اس طرح پجاریوں، برہمنوں، پروہتوں کے خلاف کش مکش کا آغاز ہوا اور ان طبقوں نے پجاریوں کو ان کے اقتدار سے محروم کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش کی بدولت بعض اہم ترین انقلاب رونما ہوئے۔

یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ پہلے زمانے میں جب انسان ابھی دیوی دیوتاؤں کے حکم میں تھا تو ان پجاریوں کے ذمے ایک سماجی فرض تھا اور اسی فرض کی تکمیل کے لیے تو یہ طبقہ وجود میں آیا تھا اور ایک مدت تک برسراقتدار رہا۔ یہ فرض تھا دیوی دیوتاؤں کو خوش رکھنا ان کو عبادت کے ذریعے مائل بہ کرم کرنا اور عوام کی خواہشوں اور آسوں، پیاسوں کی تشفی کے لیے دیوی دیوتاؤں کو راضی کرنا۔ چنانچہ اس فرض کی تکمیل کے لیے لوگ ان پجاریوں کی خدمت میں ہر قسم کی خیرات اور تحفے تحائف لے کر پہنچتے اس طرح سے یہ پجاری لوگوں کی زائد دولت کے امین بننے لگے۔ انسانی ترقی کا راز ضرورت سے زیادہ پیداوار میں پوشیدہ رہا ہے اور اب بھی ہے۔ انسانی سماج کا ترقی کی طرف اقدام اس وقت شروع ہوتا ہے جب وہ اپنی فوری ضرورتوں سے زیادہ دولت پیدا کرسکتی ہے۔ سماج کے ہر فرد کی زائد پیداوار کو ایک جگہ اکٹھا ہونا چاہیئے تاکہ وہ چیز عالم وجود میں آسکے۔ جسے قومی دولت کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں دیوی دیوتاؤں کے ایجنٹ پجاری مختلف افراد کی زائد آمدنیوں کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کا ذریعہ تھے۔ تاریخ کے مختلف دوروں میں قومی دولت مختلف ذریعوں سے فراہم ہوتی رہی ہے ابتدائی زمانے میں دیوتاؤں کی نذریں دولت کی فراہمی کا ذریعہ تھیں پجاری اس زمانے میں قوم کے بینکر تھے وہ صرف دیوی دیوتاؤں کے ایجنٹ ہی نہ تھے بلکہ قومی دولت کے امین بھی تھے یہ منصب دیوتاؤں کے ان ایجنٹوں کے لیے بہت منفعت بخش تھا اور آہستہ آہستہ وہ سماج کے حکمران بن گئے۔ یہ سب کچھ اتنا بڑا نہ ہوتا اگر ان دیوی دیوتاؤں کے ایجنٹ پجاریوں میں اپنے وعدوں کو پورا کرنے کی طاقت بھی ہوتی۔ اگر وہ واقعی دیوی دیوتاؤں کو خوش کر کے مائل بہ

کرم بھی کر سکتے اور ان سے لوگوں کی خواہشیں بھی پوری کروا سکتے تو پھر اس صورت میں نہ انقلاب کی ضرورت پیش آتی اور نہ علم نجوم اور اس قسم کے دوسرے علوم ہی وجود میں آتے۔ اس صورت میں انسان ان دیوی دیوتاؤں اور ان کے ایجنٹوں پر بھروسہ رکھتے ہوئے اجرام فلکی کی گردش کی طرف متوجہ ہونا ضروری خیال نہ کرتا اور نہ بارش اور طوفان وغیرہ کے سوالوں پر مزید غور کرتا۔ لیکن ان دیوی دیوتاؤں سے اپنی بات منوانا ان پجاریوں کے بس میں نہیں تھا۔ لہذا مزید جستجو ناگزیر ہوگئی۔

ایک طرف انسان اجرامِ فلکی کی گردش کی طرف متوجہ تھا اور قدرت کے ان حوادث پر قابو پانے کا جتن کر رہا تھا تو دوسری طرف اسکی محنت اور اس سے ہونے والی پیداوار میں بھی اضافہ ہو رہا تھا اور زائد پیداوار بھی اسی رفتار سے بڑھنے لگی تھی۔ چنانچہ ایک نئی سرگرمی شروع ہوگئی یہ تھی تجارت، ملک کے دور دراز حصوں میں مختلف افراد کی زائد پیداوار کا تبادلہ ضروری ہوگیا اور اس کام کو انجام دینے کے لیے ایک نیا سماجی عنصر نمودار ہوا۔ یہ تاجروں کا گروہ تھا۔ یہ لوگ اپنے کام کو ایک سماجی فرض کی حیثیت سے انجام نہیں دیتے تھے۔ ملک کے مختلف حصوں کی زائد پیداوار کا تبادلہ ان کے لیے منافع کا ذریعہ تھا۔ ان کی یہ خواہش قدرتی تھی کہ زائد پیداوار کی مقدار میں اضافہ ہو۔ جتنی زیادہ پیداوار ہوگی اتنی ہی تبادلے کی زیادہ گنجائش ہوگی اور تاجروں کا منافع بھی اسی رفتار سے بڑھتا جائے گا۔ لیکن ان دنوں ملک بہت چھوٹے تھے اور محنت کی قوت تخلیق بھی بہت کم تھی ظاہر ہے کہ اس صورت میں زائد پیداوار بھی کچھ زیادہ نہ ہو سکتی تھی اور اس کا بھی کافی حصہ دیوتاؤں کی نذر کی شکل میں پجاریوں کے قبضے میں چلا جاتا تھا۔ اگر ان نذروں کا سلسلہ بند کر دیا جائے تو زائد پیداوار تبادلے کے لیے بچ سکتی تھی اور اس طرح تاجروں کے منافع میں اضافہ ہو سکتا تھا۔ اس بات نے پجاریوں اور تاجروں کے درمیان کش مکش شروع کر دی۔

پجاریوں اور تاجروں کے درمیان کش مکش کے کئی شعوری اور غیر شعوری پہلو تھے۔ اصل مقصد تو تھا کہ زائد پیداوار جو پجاریوں کی نذر ہوتی ہے ان کی تجوریوں میں جاتی ہے وہ ان کے

پاس نہ جائے بلکہ وہ تبادلہ کے لیے تاجر کو ملے تاکہ وہ اس تبادلے سے مزید منافع کما سکے لیکن یہ زائد پیداوار جو پجاریوں کی نذر ہوتی تھی وہ بظاہر تو پجاریوں کے حضور پیش ہوتی۔ لیکن اصل میں ان کا مقصد تو دیوتاؤں کے حضور پیش کرنا اور ان کو خوش کرنا ہوتا تھا، اس لیے جب تک یہ دیوتا باقی رہتے ہیں اس وقت تک پجاری بھی باقی رہتا ہے۔ چنانچہ اس لیے یہ ضروری ٹھہرا کہ پجاری کو، برہمن کو، پروہت کو اپنے اقتدار کے مسند سے ہٹانے کے لیے دیوی دیوتاؤں کے وجود کو بھی لایعنی قرار دیا جائے اور ان دیوی دیوتاؤں کے حضور نذروں، تحفوں اور نیازوں کو پیش کرنا متروک ٹھہرے اس لیے دیوی دیوتاؤں کے خلاف تحریکیں اٹھیں اور یہ اصرار ہونے لگا کہ دیوی دیوتا تو بے جان ہیں۔ یہ پتھر کی مورتیاں ہیں ان کو مائل بہ کرم کرنے کے لیے نذر نیاز کیوں ضروری ٹھہرے۔ مقصد یہ تھا کہ یہ دولت استعمال ہو یہ اجناس جو دیوی دیوتاؤں کے حضور پیش ہوتی ہیں۔ وہ تجارت کی جنس میں تبدیل ہوں۔ زائد سماجی پیداوار کو ایک جگہ اکٹھا کرنا ایک مفید سماجی کام تھا۔ اس طرح جو دولت پجاریوں کے پاس اکٹھی ہو جایا کرتی تھی اس کا کچھ حصہ اجتماعی بہبود کے لیے صرف ہوتا تھا۔ مثلاً خیرات اور باولیوں کے لیے سڑکیں وغیرہ بنانا۔ لیکن اس دولت کا بیشتر حصہ بے کار بھی پڑا رہتا تھا۔ مگر زائد پیداوار صرف اسی صورت میں سماجی ترقی کا ذریعہ بنتی ہے۔ اگر وہ پیداوار کی رفتار میں مزید اضافے کا باعث ہو دوسرے لفظوں میں دولت کو بے کار نہیں پڑے رہنا چاہیے۔ بلکہ استعمال میں آنا چاہیے۔ تجارت نے اس دولت کے استعمال کا ایک ذریعہ پیدا کر دیا اور ان لوگوں کے لیے جنھوں نے یہ جدید سماجی فرض اپنے ذمے لیا تھا ضروری ہو گیا کہ وہ دیوتاؤں کی اہمیت اور برتری کو ختم کریں تاکہ زائد سماجی پیداوار ان کے حضور نذر نیاز کی بجائے ان کے قبضے میں آتے تاکہ ان کی تجارت پھیل سکے۔ یہ ایک وسیع آبادی کی ضرورت بھی تھی۔ کیونکہ جو دولت، جو اشیاء، جو تحفے تحائف دیوتاؤں کے نذر ہوتے تھے۔ اس کے عوض میں آبادی کو کچھ نہیں ملتا تھا۔ لیکن جب یہی اشیاء تاجر ان سے لیتا تھا تو وہ اس کے عوض میں ان کو انکی ضرورت کی اشیاء یا سکے کی صورت میں کچھ دیتا تھا جس سے وہ مزید اشیاء خرید سکتے تھے لیکن دیوتاؤں سے تو

انھیں کچھ وصول نہیں ہوتا تھا سوائے موہوم امیدوں کے، اس لیے تاجر کو پجاری پر فوقیت حاصل ہوگئی چنانچہ زائد پیداوار کا بیشتر حصہ ان تاجروں کے قبضے میں جانے لگا اور دیوی دیوتاؤں کی نذروں میں کمی آنے لگی اس کمی نے پجاریوں کو بوکھلا دیا اور کش مکش تیز ہوگئی اور ذہنی و مادی انقلاب کے لیے زمین ہموار ہوگئی۔

تاجروں کی جماعت نے انسانی ترقی کے سلسلے میں ایک اہم فرض انجام دیا۔ ان کے پیشے کا تقاضا تھا کہ وہ سفر کریں۔ سفر آدمی کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ لمبے سفر خصوصاً بحری سفر سے حوادث فطرت کے مادی اسباب سمجھ میں آنے لگتے ہیں اور سفر کرنے والوں کا ذہنی افق وسیع ہو جاتا ہے ان لوگوں نے پہلی مرتبہ حقیقی فلسفے کو جنم دیا۔ اگرچہ ایسا کرنے میں ان کی خود غرضی بھی پنہاں تھی وہ پجاریوں کو زائد پیداوار کے قبضے سے محروم کرنے کے لیے دیوتاؤں کے وجود کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ بہر حال یہ پہلے لوگ تھے جنھوں نے حوادث فطرت کے مادی اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اگر حوادث فطرت مثلاً بارش، بجلی اور طوفان کے متعلق یہ ثابت کر دیا جائے کہ دیوتاؤں کو ان سے کوئی تعلق نہیں تو ظاہر ہے کہ پجاریوں کا وجود غیر ضروری بن جاتا ہے۔ اس صورت میں دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے ان کے ایجنٹوں کو رشوت دینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور دیوتاؤں کو نذریں پیش کرنا ایک بے سود مشغلہ بن جاتا ہے۔

حوادث فطرت کی عقلی تشریح کا نتیجہ یہ ہوا کہ پجاریوں کا زور ٹوٹنے لگا اور ایک زبردست انقلاب رونما ہوا۔ ایک طویل عرصے کے لیے پجاریوں کے خلاف بغاوت سماجی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ثابت ہوئی لیکن یہ بغاوت بالآخر ایک نئے مذہب کے قیام کا ذریعہ بن گئی۔ ایسا ہونا قدرتی تھا۔ اس زمانے کا مادی علم بہت نامکمل تھا۔ لہذا فلسفیانہ تفکر، خیال آرائی سے بالکل الگ نہ ہو سکتا تھا۔ اس طرح مادی مسائل میں مابعد الطبیعاتی تصورات شامل ہوگئے

انسان فطرتاً تجسس پسند ہے۔ ایک ترقی یافتہ دماغ رکھنے کی وجہ سے وہ غور و فکر کے لیے مجبور ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ حوادثِ فطرت کی کوئی نہ کوئی تاویل کرے ورنہ اس کی عقل جواب دے جائیگی اور وہ پاگل ہو جائے گا۔ قدیم زمانے کے عقل پرست حوادث فطرت کے پورے پورے

مادی اسباب دریافت کرنے سے قاصر تھے، لہٰذا ان کے لیے مابعد الطبیعاتی مفروضوں پر اکتفا کرنا ضروری ہوگیا ہے بہرحال فلسفے کی نشوونما میں اس محدود فکر کو بھی کافی اہمیت حاصل ہے۔ مذہب اس محدود فکر کا ایک ذریعہ تھا۔

ان حالات میں قدیم فطری مذہب کے پجاریوں کی شکست کے بعد بھی ایک نئے مذہب کا قیام ضروری تھا یہ نیا مذہب توحید کا قائل تھا۔ اس نے قدیم مذہب کے آسمانی خداؤں کے ایک گروہ کی بجائے دنیا پر صرف ایک خدا کی بادشاہت قائم کردی۔ قدیم مذہب کے کثیر التعداد خداؤں کی بجائے ایک عالم گیر اصول رائج ہوگیا جس نے مختلف ممالک میں مختلف شکلیں اختیار کیں۔ ایک غیر شخصی خدا کی موجودگی میں پجاریوں کی سماجی ضرورت ختم ہوگئی پجاریوں جیسے ذی اقتدار گروہ کا خاتمہ ایک بہت بڑا انقلاب تھا۔

ہند قدیم میں بھی دیوتا انسانی مشکلات کو حل کرنے میں ناکام رہے تھے مادی دنیا کے اسباب وعلل کی تلاش دراصل بہت پہلے شروع ہوگئی تھی۔ اپنشد اس قسم کی تلاش اور جستجو کا ایک ریکارڈ ہیں۔ اس جستجو نے ویدک دھرم کی بنیادوں اور پجاریوں کے اقتدار پر ایک ضرب لگائی تھی لیکن تاجروں کی جماعت جو اس جستجو اور تلاش کی علمبردار تھی نہایت کمزور تھی۔ برصغیر ہندوستان کی ایک بدنصیبی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ ہر نازک مرحلے پر یہاں کی انقلابی جماعت اور طبقہ اپنے فکر، منصب اور تقاضوں کے مقابلے میں کمزور ثابت ہوئے۔ شاہ ولی اللہ کا فکر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس فکر کی عظمت بھی مسلم انقلابی پن بھی سر آنکھوں پر لیکن وہ جماعت جو اس فکر کو عملی جامہ پہنا سکتی تھی یا وہ طبقہ جس کے لیے یہ فکر ایک ضرورت تھا وہ مفقود تھے۔ نہ طبقہ تھا نہ وہ جماعت تھی اس لیے یہ فکر وہ انقلاب بپا نہ کرسکا جس کے جراثیم اس میں موجود تھے۔ لیکن بہرحال جس طرح شاہ ولی اللہ نے ایک عالم کی حیثیت سے فکری جمود کو جھنجھوڑا اور یہ کام اکثر اس زمانے میں علماء کا طبقہ ہی کرتا تھا۔ کیونکہ علم ان تک ہی محدود تھا۔ اسی طرح قدیم زمانے میں انقلابی تصورات برسر اقتدار پجاریوں کی جماعت کے افراد کے دماغ سے نکلتے تھے ان انقلابی تصورات کی بنا پر

پجاریوں کے دو گروہوں کے درمیان کش مکش شروع ہو جاتی تھی۔ لیکن یہ کش مکش انتہائی شکل اختیار کرنے میں ناکام رہتی تھی۔

بہر حال ان ابتدائی قسم کے انقلابی تصورات نے ویدک دھرم کی بنیادوں کو کمزور ضرور کیا اور یہی تصورات بدھ مت کے انقلاب کو جنم دینے کا باعث بنے۔ یہ انقلاب پجاریوں کے برسر اقتدار طبقے کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ یہ انقلاب دوسرے ممالک کے انقلابوں سے آگے بھی گیا اور اس نے خدا کی ہستی سے انکار کر کے خود مذہب کی جڑوں پر کلہاڑا چلانا چاہا۔ لیکن یہ بات اپنے وقت سے بہت آگے تھی۔ اس صورت میں جب انسان کو قوانین قدرت اور حوادثِ فطرت کے متعلق درست واقفیت حاصل نہ تھی وہ مابعد الطبیعاتی مفروضے کو خیرباد کہنے کا اہل نہ تھا۔ اس وقت مذہب ایک سماجی اور روحانی ضرورت تھی اصل میں بدھ کے فلسفے کی انتہا پسندی اس کی کمزوری تھی۔ یہ سماجی نظام کو درہم برہم کرنے کا فلسفہ ضرور تھا۔ لیکن تعمیر جدید کی طرف رہنمائی کرنے سے یہ خود بھی قاصر تھا۔

تاجروں کی جماعت اگرچہ کمزور تھی لیکن یہی جماعت انقلاب کی پشت پناہ تھی۔ بدھ دھرم کا بانی اگرچہ کھشتری طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ جو خود بھی پجاریوں کا مخالف تھا اور بعد میں اس طبقے نے بدھ دھرم کی امداد بھی کی لیکن جن پانچ صد لوگوں نے سب سے پہلے بدھ کی شاگردی اختیار کی وہ سب کے سب تاجر تھے سات سو سال تک ہندوستان میں بدھ دھرم کا بول بالا رہا اس زمانے کا کوئی ریکارڈ اس وقت موجود نہیں۔ اس کے بعد ہندوستان میں جو جوابی انقلاب ہوا اس نے ہندوستان کی مذہبی تاریخ کے اس باب کی تمام نشانیوں کو نیست و نابود کر دیا۔ لیکن یہ جوابی انقلاب اس ویدک سماج کو بحال نہ کر سکا جسے انقلاب نے ہمیشہ کے لیے تباہ کر دیا تھا۔ اس نے فطری مذہب کے دیوتاؤں کا وجود ختم کر کے اور مسئلہ تناسخ کی مخالفت کر کے مروجہ نظام کی اخلاقی بنیادوں کو منہدم کر دیا۔ اس کے بعد اس نظام کی عمارت کا گر جانا یقینی بات تھی۔

پرانے نظام کو ختم کرنے کے بعد کھشتری اور تاجر جماعتوں نے سماج کی تعمیر جدید کا کام

شروع کیا انھیں اس کام میں ضرور کامیابی ہوئی ہو گی ورنہ بدھ دھرم اتنی دیر تک پھل پھول نہیں سکتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ انقلاب کی بنیادی کمزوری ظاہر ہونے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کھشتری طبقے نے انتہائی اہمیت حاصل کر لی اور تاجروں کو جو اس انقلاب کے رُوح رواں تھے، پس پشت ڈال دیا۔ اشوک اور چندر گپت کی بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہو گئیں لیکن کھشتریوں کا قائم کردہ سماج ایک جاگیردارانہ سماج ہو گا۔ اور اس نے تجارت کے فروغ پر پابندیاں عائد کر دی ہوں گی۔

کھشتریوں کا اقتدار اگر کافی عرصہ قائم رہے تو سماج کی اقتصادی زندگی کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ان چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے خلاف انقلابی لڑائیاں لڑنا بھی ضروری تھا جو قدیم براہمن دھرم کی حفاظت کر رہی تھیں اور بقول ایم این رائے۔ اشوک ہند قدیم کا نپولین تھا۔ اس نے بدھ دھرم کو ایک بہت بڑی سلطنت کا سرکاری مذہب بنا دیا لیکن سلطنت قائم کرنے کے عمل میں انقلاب کی سماجی بنیادیں بالکل ختم ہو گئیں مسلسل جنگوں کی بدولت عوام بہت غریب ہو گئے جس کے سبب تجارت کی نشوونما نہ ہو سکی۔ اس کے علاوہ غریبی اور افلاس نے عوام کو مجبور کر دیا کہ وہ نئے مذہب میں سکون کی تلاش کریں۔ یہ نیا مذہب بدھ انقلاب کی ایک بگڑی ہوئی شکل تھی۔ بدھی ریاست ایک جاگیردارانہ ریاست تھی۔ ایک جاگیردارانہ ریاست پجاریوں کے تعاون کے بغیر نہیں چل سکتی۔ لہٰذا اس کمی کو پورا کرنے کے لیے بدھوں کے مٹھ قائم ہو گئے۔ اس رجحان نے بالآخر بدھ مت کی شکست کا سامان پیدا کر دیا اور برہمنی جوابی انقلاب کے لیے میدان تیار ہو گیا۔

قدیم زمانے کے انقلابوں کے دو رجحان خاص طور پر نمایاں ہیں۔ اختلال اور تعمیر جدید ایک لحاظ سے یہ بات ہر انقلاب کے متعلق درست ہے۔ پرانے نظام کے ترقی پسند امکانات کا خاتمہ انقلاب کو وقت کی سب سے بڑی ضرورت بنا دیتا ہے اور یہی امر پرانے نظام کی برہمی اور تباہی کو لازمی بنا دیتا ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو اختلال اور برہمی و تباہی انقلاب کا فوری نتیجہ ہے۔ اس کے بعد تعمیر جدید چاہے ہو چاہے نہ ہو۔ اس بات کا انحصار ان عناصر کی

قوت پر ہے۔ جو جدید نظام کے قیام کا باعث ہوتے ہیں۔

بدھ انقلاب میں تعمیر جدید کی نسبت اختلال کا رجحان زیادہ قوی تھا اس کی وجہ تجارتی طبقے کی کمزوری تھی۔ اس انقلاب نے ویدک سماج کی بنیادوں کو منہدم کر دیا اور برہمنی اقتدار کو تباہ و برباد کر دیا۔ لیکن جونہی سماج کی تعمیر جدید کی نوبت آئی تو انقلاب کی کمزوری نمایاں ہوگئی پرانے نظام کو تباہ کرنے کا بنیادی رجحان ہی زور پکڑ گیا۔ بجائے اس کے کہ لوگ بدھ مت کے تعمیری اصولوں کو اپنا کر سماج کی تعمیر جدید کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ وہ ہر درست تخریبی پہلو سے چمٹ گئے اور بدھ کے پیروؤں کی ایک بہت بڑی اکثریت، تباہ ہونے والے سماج کے مسائل سے راہِ فرار اختیار کر کے نروان کی تلاش میں منہمک ہوگئی۔ ممکن تھا کہ آخر کار تعمیری رجحان ہی اہمیت اختیار کر جاتا۔ لیکن جونہی ان دونوں رجحانوں کی ٹکر شروع ہوگئی اور بدھ سماج کا شیرازہ منتشر ہونے لگا۔ جوابی انقلاب نے جو اگرچہ شکست کھا چکا تھا لیکن فنا نہیں ہوا تھا۔ اپنا جوابی حملہ شروع کر دیا بدھ سماج جو اندرونی کش مکش میں مبتلا تھا۔ برہمنی رجعت پسندی کے اس حملے کی تاب نہ لا سکا۔

برہمنی فکر کے احیا اور اس کے اقتدار میں آنے کے عمل کے بارے میں ایم این رائے لکھتا ہے۔

بدھ مت کو شکست دینے اور اپنے اقتدار کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے برہمنوں نے اپنے ابتدائی فلسفیانہ فکر کے نتائج کو بھی خیرباد کہہ دیا اور اپنشدوں کو چھوڑ کر از سرِ نو ہزار ہا سال پرانے ویدوں کی پناہ میں آ گئے۔ اگرچہ بدھ انقلاب کی کامیابیوں کا ریکارڈ مفقود ہے تو اس جوابی انقلاب کی تباہ کاریوں کی تاریخ بھی عدم لاپتہ ہے۔

انقلاب اور جوابی انقلاب کی اس خوفناک کش مکش نے سوسائٹی کو ایک زبردست اختلال اور بدنظمی میں مبتلا کر دیا۔ قدیم انسان جسے اپنی قوت کا پورا پورا احساس نہیں تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس اختلال اور بدنظمی سے بچنے کے لیے فوق الفطرت قوتوں کی پناہ ڈھونڈے، اس دنیا میں بہتر زندگی کی امید خواہ دوسرے جنم میں ہی کیوں نہ ہو عظیم خلاء میں گم ہو جانے کی نسبت زیادہ خوش آئند تھی۔ انسانی فطرت کا جوہر زندہ رہنے کی تمنا

ہے۔ برہمنوں نے اس تمنا سے اپیل کی انھوں نے کہا کہ دیوتاؤں کی پرستش پھر شروع کر دو، وہ اس دنیا میں تمھیں مصیبت وآلام سے بچائیں گے اور تم دھرم کے راستے سے منحرف نہ ہوئے تو دوسری زندگی میں تمھیں اس کا اجر دیں گے۔ دھرم سے مراد منو کے قائم کردہ سماجی اصولوں کی پابندی تھی جو برہمنی رجعت پسندی کی بنیادوں کو مضبوط بنانے کے لیے قائم کیے گئے تھے۔

انسانی سماج کو عالم یاس میں تسکین کی ضرورت محسوس ہوتی ہوگی۔ یہ تسکین خدا سے حاصل ہوتی اور خدا کے ایجنٹ پجاری ایک مرتبہ پھر برسر اقتدار آگئے۔ شنکراچاریہ ان کا لیڈر تھا شنکراچاریہ کو ہندوستان کی تہذیب کا بہترین نمونہ سمجھا جاتا ہے وہ صرف ہندوستان کا ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کا بہترین مفکر خیال کیا جاتا ہے شاید یہ درست ہو لیکن سماجی اعتبار سے وہ ایک بہت ہی بڑی مصیبت تھا وہ جوابی انقلاب کا پیمبر تھا اور یہ جوابی انقلاب ہندوستان کی سب سے بڑی بدقسمتی ثابت ہوا۔ اس نے بدھ دھرم کا فاتحہ پڑھ دیا لیکن جس وقت سے یہ رسم ادا کی گئی ہے ہندوستان کی صحت ورانہ نشوونما ختم ہو چکی ہے اور اس سانحے کے برے اثرات آج تک محسوس کیے جا رہے ہیں اس کے بعد کی ہندوستانی تاریخ انقلابی تحریکوں سے یکسر محروم ہے اگرچہ کبھی کبھی تھوڑی بہت تبدیلیاں ہندوستان میں رونما ہوئی ہیں لیکن وہ سب بیرونی حملوں کا نتیجہ تھیں گزشتہ ایک ہزار سال کے دوران میں ہندوستان کے تمام تغیر کسی نہ کسی حملے کے توسل سے رونما ہوتے ہندوستان کی تاریخ کے اس عجیب و غریب پہلو کی تاویل اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ ہندوستان کی غیر قدرتی نشوونما کے سبب اس میں ایسی انقلابی تحریکیں زور نہیں پکڑ سکیں جو وقتاً فوقتاً سماج کا ڈھانچہ بدل دیا کرتی ہیں۔ اگر بیرونی حملوں کے توسل سے بھی ہندوستانی سماج میں تبدیلیاں رونما نہ ہوتیں تو یہ سماج کبھی کا فنا ہو چکا ہوتا۔ چنانچہ ایم این رائے لکھتا ہے کہ ہندوستان پر پہلا حملہ مسلمانوں نے کیا اسلام ایک انقلاب کی پیداوار تھا۔ بالآخر یہ ہندوستان بھی پہنچ گیا اور شروع شروع میں اسے ایک انقلابی قوت کی حیثیت سے کامیابی حاصل ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ہندوستانیوں کو قرآن اور تلوار میں سے ایک شے منتخب کرنے کے لیے کہا۔ لیکن ایسا کہتے وقت یہ حقیقت فراموش کر دی جاتی ہے کہ ہندوستانیوں کے سامنے ایک اور انتخاب بھی تھا۔ قرآن حکیم کو تسلیم کرنے کے فوراً بعد

وہ ایک عظیم برادری کے رکن بن جاتے تھے اور ان کے اور باقی ممبروں کے حقوق میں کوئی امتیاز باقی نہ رہتا تھا۔ اس صورت میں کیا قبولِ اسلام کو بزدلی کا نام دیا جا سکتا ہے؟ کیا اسلام بذاتِ خود ایک بہت بڑی ترغیب نہیں تھا۔ بدھ ازم کی شکست کے بعد ہندوستانی عوام کو برہمنی رجعت پسندی کا شکار ہونا پڑا۔ اور نچلے طبقوں کی حالت اتنی خراب ہوگئی کہ جب اسلام نے ان کے لیے ایک انسانی برادری کا مساوی رکن بننے کا امکان پیدا کر دیا تو انھوں نے خوشی خوشی اس کے پیغام کو قبول کر لیا۔ اسلام کی کامیابی کا یہی راز ہے ورنہ عرب سے آئے ہوئے چند سو حملہ آور ہندوستان کو فتح نہ کر سکتے تھے۔

برطانویوں کی آمد کی صورت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اس مرتبہ ہندوستان کو غیر ملکیوں نے فتح نہیں کیا تھا۔ بلکہ خود ہندوستانی غیر ملکیوں کی فتح کا آلۂ کار بنے تھے۔ جب تک واقعہ کے اس پہلو کی اہمیت کو مدنظر نہیں رکھا جائے گا۔ اس وقت تک ہندوؤں کو برطانوی فتح کی تاریخی قدر و قیمت کا درست اندازہ نہیں ہو سکتا۔ آخر اس کی کیا وجہ تھی کہ ہندوستانیوں کی ایک کثیر تعداد نے برطانویوں کو اپنا ملک فتح کرنے میں مدد دی۔ اس لیے کہ ملک کی حالت کسی اہم تبدیلی کا مطالبہ کر رہی تھی۔ اس تبدیلی کو لانے والی طاقتیں خود ہندوستان کے اندر زور نہ پکڑ سکیں اور اپنی کمزوری کے سبب انھوں نے ایک غیر ملکی طاقت کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ جو خود اپنے مقاصد کے لیے ہندوستان کے فرسودہ سیاسی نظام اور پارینہ سماجی اداروں کو تباہ کرنے میں مصروف تھی جن لوگوں نے تاریخ کا ایک سائنس کی حیثیت سے مطالعہ کیا ہے وہ ہندوستان کی برطانوی فتح کو ایک انقلابی واقعہ قرار دینے پر مجبور ہیں۔ لیکن جو انقلاب بیرونی مداخلت سے پیدا کیے جائیں وہ مناسب نتائج پیدا نہیں کر سکتے برطانوی فتح نے ہندوستان کے فرسودہ اداروں کو ختم تو کر دیا لیکن تعمیر جدید کا کام ہنوز باقی ہے۔"

قدیم مذاہب میں پجاریوں، پروہتوں اور تاجر طبقے میں جو کش مکش پوری تاریخ میں جاری و ساری رہی ہے اور اس کش مکش کے انجام میں تاجر طبقے کی تشفی کے لیے کسی حد تک نئے مذاہب جنم لیتے رہے ہیں۔ کچھ اس قسم کے حالات نے ہی اسلام کے لیے فضا سازگار بنائی تھی اور اسلام نے بھی اس وقت کے پجاریوں اور پروہتوں کے خلاف پرچم بلند کیا تھا اور خود رسول اللہ کا تعلق تجارت سے بھی تھا۔ مکہ اور مدینہ جن کو اسلام کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہمیت اور تقدس حاصل ہے یہ دونوں

شہر اس اہم تجارتی راستے پر واقع تھے جو یمن سے شام کو جاتا تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ گو اس وقت کے عرب کے بدوی اور حضری باشندوں کا معاشرہ قبائلی جمہوریت کے اصولوں پر سختی سے کاربند تھا لیکن شہروں میں تجارت پیشہ لوگوں کا ہی اثر و اقتدار قائم تھا۔ چنانچہ سید سبط حسن اپنی کتاب "ماضی کے مزار" میں ابن اسحاق کی سیرت رسولؐ کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ حجاز میں مکے کو مرکزی حیثیت حاصل تھی کیونکہ یہ شہر وہاں کا سب سے بڑا تجارتی شہر تھا۔ مکے میں ہر سال ایک بڑا میلہ لگتا تھا جسے سوق العکاظ کہتے تھے۔ شہر کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہاں خانہ کعبہ واقع تھا۔ یہ جگہ عربوں کی سب سے بڑی مقدس عبادت گاہ تھی۔ جہاں وہ ذی الحج کے مہینے میں حج کی رسم منانے جمع ہوتے تھے۔ حرم کے پاسبان زائرین سے حج کا محصول وصول کیا کرتے تھے اسی باعث کعبے کی پاسبانی کے لیے مکے والوں میں اکثر رسہ کشی ہوتی رہتی تھی عبد مناف اور ان کے بیٹے ہاشم کی دولت و ثروت کا ایک سبب حرم کی پاسبانی کا عہدہ بھی تھا اور جب ہاشم کے بیٹے عبد المطلب نے چاہ زمزم کو جو مدت سے ریت کے نیچے دبا پڑا تھا۔ کھود نکالا تو بنی ہاشم کا اثر اور بڑھ گیا۔"

اس لیے تمام مذاہب نے ایک نہ ایک وقت میں اپنے پیشرو مذاہب اور ان کے پجاریوں کے خلاف بغاوت کا پرچم کھولا ہے اور آج جب "مولوی" اور اس کے مخالف طاقتوں کے خلاف ایک مسلسل جنگ جاری ہے تو یہ کہیں تاریخ کا یہی تسلسل تو نہیں بہر حال اس موضوع پر آگے چل کر تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کروں گا

باب ۹

تحریک دین الٰہی
کا پس منظر

ازمنۂ قدیم میں جب اس برصغیر میں ہندو معاشرہ میں جو تصادم اور کشمکش دیوتاؤں کے ایجنٹ پجاریوں یعنی برہمنوں اور تاجروں کے درمیان دیکھنے میں آتی رہی ہے اس نہج کا تصادم اور کشمکش دوسرے معاشروں میں بھی رونما ہوتا رہا ہے، یورپ کے اندر کلیسا اور بادشاہ کا تصادم ہم دیکھتے رہے ہیں وہ بھی اسی عمل کا پرتو ہی تو ہے اور خود مسلمان معاشرے میں خواہ یہ مشرقِ وسطیٰ میں ہو یا برصغیر میں ہم ہم جگہ جگہ "علما" اور بادشاہ یا خلیفہ کو دست و گریباں ہوتے دیکھتے ہیں وہ بھی دراصل بہت سے موقعوں پر اسی عمل کا مظہر رہے ہیں لیکن آج ہم چونکہ ایک جدید دور میں رہ رہے ہیں اور بادشاہت راندہ درگاہ ٹھہری ہے اس لیئے ہم اس دور کی پوری طرح چھان پھٹک کم ہی کرتے ہیں اور چونکہ کئی بار ان "علما" ان ائمہ" اور مجددوں کو بادشاہوں کے ہاتھوں صعوبت زنداں بھی برداشت کرنی پڑی اس لیئے وہ مظلوم کے طور پر ابھرے اور مظلوم کے لئے ہمدردیوں کے ساتھ ساتھ بغیر غور و فکر کیئے ان مظلوم آئمہ" اور" مجددوں" کا فلسفہ بھی محترم ٹھہرا۔ اس کشمکش میں شاہ ولی اللہ کا شمار ان اہل علم میں ہوتا ہے، جو خود عالم اور مجدد کی صف میں کھڑے ہو کر بھی "علماء" کی

بالادستی کو تسلیم نہیں کرتے اور ان کے فکر میں جو وسعت ہے وہ دراصل اس طویل کشمکش اور تصادم کے نتیجے میں پیدا ہوئی جو اس برصغیر میں اکبر اور علماء کے ایک گروہ کے درمیان سے شروع ہوا اور دراصل یہ ایک طویل جدوجہد تھی جو اس برصغیر میں لڑی گئی لیکن اکبر کے دور میں اس نے واضح صورت اختیار کر لی، مگر اکبر کے بعد بھی یہ جنگ جاری رہی کبھی تہ دامن اور کبھی بر سر دامن اور آج بھی یہ کسی نہ کسی انداز سے لڑی جا رہی ہے، کل یہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے نام پر لڑی گئی تھی اور آج یہ "نظام مصطفےٰ" اور سیکولرازم کے نام سے لڑی جا رہی ہے، اس لئے اس طویل لڑائی کا پس منظر سمجھ لینا چاہیے۔

برصغیر پاکستان و ہند میں جب مسلمان حکومتوں کے قیام کا سلسلہ شروع ہوا تو اس وقت عربوں کی تہذیب کا سورج ڈھل رہا تھا جو مسلمان یہاں آئے ان کے سینے اس تپش سے محروم تھے جن سے محمد بن قاسم اور اس کی فوج کے سپاہی جل رہے تھے، اس لئے جب یہاں مسلم حکومتوں کے قیام کا دور آیا تو ان کی بنیادی ضرورت سیاسی نوعیت کی تھی، نہ کہ مذہبی اور نظریاتی نوعیت کی، نہ وہ مبلغ تھے نہ وہ خود بہت بلند پائے کے عالم تھے، البتہ تلوار کے دھنی ضرور تھے۔ اس لئے ان کی حکومتوں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اپنی پائداری اور استحکام کا مسئلہ تھا۔

سندھ اور مغربی ہند کے ساحل پر واقعہ علاقوں کی نوعیت البتہ مختلف رہی ہے اس لئے کہ بعض مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر عربوں کے بحری حملے حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہی شروع ہو گئے تھے۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ سوات، سورت وغیرہ کے علاقوں میں ایسے عرب آبسے ہوں، جنہوں نے دور رسالت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو، اس لئے سوات میں اور ان کے گرد و نواح کے علاقوں میں اسلامی عقائد کی پختگی کا آج بھی چرچا ہوتا رہتا ہے، سندھ پر محمد بن قاسم کے حملے اور فتح نے ہندوستان پر کوئی اثر نہیں چھوڑا۔ اس لئے کہ اس فتح نے مرکزی ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیا تھا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے فکری ارتقاء کو سمجھنے کے لئے یہ نکتہ بنیادی ہے کہ برصغیر کے

وہ علاقے جو پورے برّ اعظم کو متاثر کرنے کی اہلیت رکھتے تھے عربوں سے ناواقف رہے ہیں اور اسلام کے اس دور میں بھی وہ غیر متعلق رہے جب اسلامی اور عربی تہذیب کا سورج نصف النہار پر تھا۔ جب یہ تہذیب اپنے پورے شباب پر تھی اور آدھی دنیا اس تہذیب کے آگے سر تسلیم خم کر چکی تھی، اس وقت ہندوستان اپنی ہی تہذیب اور خیالات کی روشنی سے منور تھا۔ اس کو اس نئی اور ترقی یافتہ تہذیب اور مسلک کا علم نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ سید مسعود عالم ندوی اسی نکتے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اس ملک اور خاص کر شمالی خطہ کی انتہائی بدبختی یہ ہوئی ہے کہ یہ عرب فاتحین کے فیض سے تقریباً محروم رہا۔ اور ان کے بدلے ترکوں اور مغلوں کی غیر اسلامی حکومت اس کے حصہ میں آئی۔ حالت یہ تھی کہ درہ خیبر سے آنے والے جرنیل اسلام کی خوبیوں سے بالکل ناواقف تھے ان کے رگ و پے میں دین حنیف کی سچائیاں سرایت نہ کر سکی تھیں اور زندگی کے ہر شعبے میں وہ اسلامی رنگ جسے آجکل کلچر کہتے ہیں بالکل نہ رچ سکا یہ اسلام بھی ایسے وقت میں لائے جب خود اسلامی مرکزوں حجاز، عراق، شام میں انحطاط کا آغاز ہو چکا تھا اور عباسی خلافت ترکوں کے ہاتھ میں کھلونا بن گئی تھی، سپہ سالار اکثر ترک غلام تھے جن کے کان اسلام کے قانون سے یکسر ناآشنا تھے۔ ان کی فوج کے سپاہی مال و دولت کے لالچ میں چلے آئے تھے ان کے دلوں میں نہ ابو عبیدہ رضؓ کی تڑپ تھی اور نہ ان کے فرمانرواؤں میں عمر فاروقؓ کا ولولہ جہاد۔ درہ خیبر کی راہ سے سب سے پہلا داخل ہونے والا جرنیل محمود غزنوی تھا اور اس کی سپاہ کا یہ حال تھا کہ اکثر نو مسلم تھے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی فوج میں ہندو سپاہی بھی تھے۔"

ان حملوں کے اثرات

محمود غزنوی کے حملوں کا سلسلہ ہندوستان کی تاریخ میں بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے ان کی اصل اہمیت سیاسی اثرات میں نہیں دیکھنی چاہیے بلکہ ان کا ردّعمل ہندوستان کی مجموعی کمزوری کے اظہار میں کرنا چاہیے۔ جہاں تک سیاسی اثرات کا تعلق تھا وہ حقیقتاً کوئی زیادہ

نہیں تھی کیونکہ محمود غزنوی ہندوستان کے وسط تک نہ پہنچ سکا نہ ہی اس نے کبھی ہندوستان میں کسی قسم کی پائیدار سلطنت قائم کرنے کی خواہش ہی کی، لیکن اس کے مقابلے میں ان حملوں نے شمالی ہندوستان کے تنزل اور ہندوستان کی کمزوریوں کا پردہ فاش کر دیا، شمال مغرب کی طرف سے یہ بار بار کے حملے ہندوستان کے محدود فکر اور اجتماعی تنظیم میں نئے عناصر شامل کر گئے اب تک تقریباً تین سو برس تک اسلام مذہب کی حیثیت سے پُرامن طریقے سے پھیلا تھا اور اس نے ہندوستان کے مذاہب میں بغیر کسی تصادم اور اختلاف کے اپنی جگہ حاصل کر لی تھی لیکن اب نئے طریقے نے ایک نیا ردعمل پیدا کر دیا۔

محمود کی حکومت پنجاب تک محدود رہی لیکن اس محدود حکومت کے استحکام کے لئے بھی اس کو سیاسی اقدام کرنے پڑے اور وہ یہی تھے کہ یہاں کی آبادی اور باشندوں کو مانوس کیا جائے، ان کی یگانگت اور اجنبیت کو دور کیا جائے، چنانچہ ان باشندوں کے طور طریقوں اور زندگی کے عام چلن میں مداخلت کم سے کم کی گئی، ہندو کو فوجی اور انتظامی عہدوں پر فائز کیا گیا۔

ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں نے جیسے جیسے اپنی حکومتیں مضبوط کیں ان کے سامنے یہ مسئلہ ہمیشہ رہا کہ کیسے اور کس طریقہ سے اپنی حکومت کو مستحکم اور پائیدار کیا جائے لیکن ہندوستان میں جس وقت مسلمانوں کی سلطنتیں اُبھر رہی تھیں وہ تیرھویں صدی بین الاقوامی طور پر مسلمانوں کے تنزل کی صدی تھی۔ مشرق وسطیٰ میں چاروں طرف انتہائی تردد اور انتشار کا دور دورہ تھا مختلف فرقے ابھر رہے تھے، سازشیں جنم لے رہی تھیں۔ باطنی فرقے کی منظم سازشوں نے مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی زندگی کو بالکل کھوکھلا کر کے رکھ دیا تھا۔ ایسے زمانے میں ہندوستان کی سطح پر دہلی کی سلطنت کا ابھرنا تھا، کہ مسلمانوں کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ پھر سے روشن ہو گئے ان کے مستقبل میں پھر سے امید پیدا ہو گئی، انھیں ایک امن کا گوشہ ایک پناہ کی جگہ نظر آنے لگی علماء اولیاءاللہ سپہ سالار، مدبر تمام جوق درجوق اس طرف رُخ کرنے لگے اور دہلی عالم اسلام کے ایک اہم مرکز کی حیثیت میں اپنا ایک خاص مقام حاصل کرنے لگا۔ لیکن اس پورے دور میں جو بادشاہ تخت پر بیٹھا اس کو دوام نہیں ملا، کیونکہ اس دور میں بھی کسی حد تک حملے ہوتے رہے

لڑائیاں ہوتی رہیں اور کوئی ایک خاندان پائیدار حکومت قائم کرنے کا موجب نہیں ہوا۔ کسی ایک خاندان کو پچیس تیس برس سے زائد حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اور اس دوران میں بھی اس کو ملکی معاملات نے امن اور چین نصیب نہیں ہونے دیا کہ وہ یہ طے کرتے کہ اس ملک میں اپنے مفادات اور مقاصد کی خاطر کس قسم کا نظام حکومت وجود میں لایا جائے اس زمانے میں اسلام کی تعلیمات یہاں کافی زوروں سے پھیلیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہندو فلسفے پر بھی اثر انداز ہوئیں، لیکن یہی زمانہ ہے جب ہندو فلسفے اور طور طریقوں نے مسلمانوں اور ان کی تعلیمات کو بھی متاثر کیا۔

نیا فلسفہ

اس عمل اور ردعمل کے متعلق دو مکاتیب خیال ہیں ایک تو ہندوستان کے مختلف مذاہب اور طور طریقوں کا جو اسلام پر اثر ہوا اور یہاں کے مسلمانوں نے جو اثرات قبول کئے۔ اور اس قبولیت کے بعد جو تہذیب اُبھری اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں اور ان لوگوں نے اس خلط ملط اور ایک دوسرے کو قریب لانے کی ہر کوشش کو خوش آمدید کہا اور اس کی تبلیغ کی۔ دوسرا مکتب خیال ہندوؤں کے طور طریقوں اور ان کا مسلمانوں کی زندگی پر جو اثر مرتب ہوا ہے اس کا زبردست مخالف ہے اور وہ اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کی الگ اور برتر ہیئت برقرار رکھنے کی کوششوں میں مصروف رہا ہے، لیکن کوئی بھی مکتب خیال ایسا نہیں ہے جو اس حقیقت سے منکر ہو کہ اسلام اور مسلمانوں کے مختلف فلسفوں اور تعلیمات پر ہندو اور ان کا فلسفہ اثر انداز ہوئے ہیں جیسے کہ اسلام ہندوؤں پر اثر انداز ہوا ہے۔ تمدن ہند کا مصنف تو یہاں تک کہہ دیتا ہے "ہندوستانی اسلام کا مطالعہ کرتے وقت ایک محقق کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں اس مذہب کی مٹی بُری طرح پلید ہوئی ہے اور یہی نہیں بلکہ اگر ہندوستان میں دین محمدیؐ نے اپنے کچھ اثرات چھوڑے ہیں اور یہاں کے مذہب اور عقائد میں کچھ تبدیلی کی ہے تو اس سے زیادہ وہ خود یہاں کے تمدن اور مذہب سے متاثر ہوا بلکہ ہندو ان سے اس قدر متاثر نہیں ہوئے

جتنے یہ ہندو سے ہوئے ہیں۔" اور سید مسعود عالم ندوی جو خلط ملط اور دو مذہبوں اور تہذیبوں کے میل جول سے مرتب ہونے والے اثرات سے بہت دکھی ہیں۔ وہ بھی یہ تسلیم کرتے ہیں:"اسلام کے اس دیس میں ہزاروں احسان ہیں اور اس کی روشن تعلیمات کے اثر سے یہاں کے مذاہب میں تبدیلیاں اور اصلاحات ہوئی ہیں تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ ہندوستان میں اسلام جتنا بھی مؤثر ہو سکا اس سے زیادہ متاثر ہوا ہے اور یہاں مسلمانوں نے جو زبان تہذیب لباس اختیار کیئے وہ سب ہندوانہ ہیں یا ہندو مسلمانوں کے امتزاج کا نتیجہ اور یہ بیچ میل ہندوانہ تہذیب اور معجون مرکب مذہب عوام تو عوام، علماء اور صوفیاء کے دل و دماغ پر کچھ ایسا چھا گیا کہ حضرت مجدد سرہندی سے لے کر آج تک تین سو سال سے کچھ اوپر کی مسلسل اصلاحی کوششوں کے بعد بھی یہ صدیوں کا بیٹھا ہوا زنگ دور نہیں ہو سکا ہے اور اللہ جانے رسول خدا کے لائے ہوئے سچے دین کی تعلیمات یہاں اپنے سادے اور اصلی رنگ میں کبھی جلوہ گر بھی ہو سکیں گی بھی یا نہیں؟ یہ تصوف و ویدانیت سے مرکب مذہب تو ہر دور میں دماغوں پر مستول رہا ہے پر دسویں صدی ہجری سے پہلے کفر و شرک کی یہ اندھیاری اپنی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔ اور گجرات و سندھ کے ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر جن کے تعلقات عرب ممالک سے زندہ تھے۔ صحیح اسلام کی روشنی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ جدھر نگاہ اٹھاؤ ایرانی، ہندی تصوف حلول، بروز اور وحدۃ الوجود کے عقیدے اعمال ہندوانہ اور مشرکانہ گھر قرآن وحدیث سے خالی اور کتاب و سنت کے چشمہ صافی سے پیاس بجھانے والوں کا عام قحط۔"

کل یہ رونا ہندو تہذیب کے اثرات کے خلاف رویا جارہا تھا پھر بہت دن مغربی تہذیب کے خلاف رونا رویا جاتا رہا اور اب کمیونسٹ تہذیب کے اثرات کے خلاف یہ پرچم بلند ہونا شروع ہو گیا ہے۔ دراصل ہمیشہ ایک طبقہ دین یا کسی خاص نظریے کی برتری کے نعرے کے نام پر پرانی اقدار کو محفوظ کرنے کی کوشش میں سرگرداں رہتا ہے لیکن پرانی زمین اس کے پاؤں تلے کھسکتی رہتی ہے اور وہ یہ نہیں محسوس کرتا کہ زمانہ جن تبدیلیوں سے دوچار ہوتا ہے ان کے خلاف بند باندھنا کوئی آسان کام نہیں، بہرحال یہ دو رجحانات کی کشمکش پھیلتی رہی ہے اور بعض دفعہ پیچھے لے جانے والے

گروہ کو کسی حد تک اور ایک مدت تک کامیابی بھی ہو جاتی ہے۔ بہر حال ہندوستان میں بھی یہ ٹکراؤ صدیوں سے چلا آرہا ہے۔

سلطنت کے تقاضے

ہندوستان میں جس نے بھی پائدار سلطنت کا خواب دیکھا اس کو اس مسئلہ سے الجھنا پڑا۔ چنانچہ بابر کو اسی لئے ہمایوں کو وصیت کرنا پڑی۔

"فرزند من! ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ اس نے تمہیں اس ملک کا بادشاہ بنایا ہے۔ اپنی بادشاہی میں تم کو ذیل کی باتوں کا خیال رکھنا چاہیے

۱۔ تم مذہبی تعصب کو اپنے دل میں ہرگز جگہ نہ دو اور لوگوں کے مذہبی رسوم کا خیال رکھتے ہوئے رو رعایت کے بغیر سب لوگوں کے ساتھ پورا انصاف کرنا۔

۲۔ گاؤ کشی سے بالخصوص پرہیز کرنا تاکہ اس سے تمہیں لوگوں کے دلوں میں جگہ مل جائے اور اس طرح وہ احسان اور شکریہ کی زنجیر سے تمہاری مطیع ہو جائیں۔

۳۔ تمہیں کسی قوم کی عبادت گاہ مسمار نہیں کرنی چاہیئے اور ہمیشہ سب سے پورا انصاف کرنا چاہیے۔ تاکہ بادشاہ اور رعیت کے تعلقات دوستانہ ہوں اور ملک میں امن وامان رہے۔

۴۔ اسلام کی اشاعت ظلم وستم کی تلوار کے مقابلے میں لطف واحسان کی تلوار سے بہتر ہو سکے گی۔

(۵) شیعہ سنی اختلافات کو ہمیشہ نظر انداز کرتے رہو۔ کیونکہ ان سے اسلام کمزور ہو جائے گا۔

۶۔ اپنی رعیت کی مختلف خصوصیات کو سال کے مختلف موسم سمجھو تاکہ حکومت بیماری اور ضعف سے محفوظ رہ سکے۔

یہ وصیت اس رجحان کی غماز ہے جس نے ہندوستان میں ایک ملی جلی تہذیب کو فروغ دینے کی کوششوں میں حصہ لیا۔ بابر نے ہندوستان پر زیادہ دیر حکومت نہیں کی لیکن جتنی دیر بھی اس نے

حکومت کی اس کے دوران میں بھی اس نے اس بنیادی مسئلہ کو سمجھ لیا کہ ایک دوسرے ملک کو تادیر صرف بزور شمشیر قابو میں نہیں رکھا جا سکتا اور بالخصوص جب تہذیب اور مذہب متحارب ہوں تو ملکوں کو قابو میں رکھنا محال ہو جاتا ہے یہ بات آج بھی سچ ہے اور اس وقت بھی سچ تھی۔ جہانبانی بھی ایک خاص طریقہ ہے اور اس طریقے کے اپنے اسلوب ہوتے ہیں اور یہی اسلوب تھے جس نے اکبر کے دین الٰہی کو جنم دیا اور ایک دوسرا طریقہ تھا کہ اپنی تہذیب کی برتری کو بزور منوائے رکھنا اور اس کے لئے کسی قسم کا خلط ملط میل جول اور عقائد کی آمیزش نہ ہونے دینا اور عقائد اور طریق حکومت میں ہم رنگی برقرار رکھنا۔ ایک طریقے نے اور یہ وہی طریقہ تھا جس کی ابتداء بابر نے کی تھی ایک طرف اکبر کو جنم دیا۔ اور بھگتی اور گورو نانک کی تحریکوں کو پروان چڑھایا اور وحدۃ الوجود کے فلسفے کو مقبول کیا لیکن اس کے مخالف گروہ نے اورنگ زیب عالمگیر کو جنم دیا اور فلسفوں میں وحدۃ الوجود کی بجائے وحدۃ الشہود کو آگے بڑھایا اور اس کے منظہر احمد سرہندی مجدد الف ثانی ٹھہرے۔

بابر نے جس حکومت کی بنیاد رکھی وہ پہلے کی تمام مسلم سلطنتوں سے مختلف سلطنت ثابت ہوئی اور آل تیمور کی یہ یلغار پہلی تمام یلغاروں سے مختلف نتائج کی ذمہ دار بنی اس سے پہلے جو ترک ہندوستان میں آئے، اور انہوں نے جو حکومتیں قائم کیں وہ اپنی جگہ پر کتنی ہی اہم ہوں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان سلطنتوں نے ایک مربوط نظام حکومت کو جنم نہ دیا۔ یہ فریضہ آل تیمور کو ہی سرانجام دینا پڑا اور اس مربوط نظام حکومت کے قیام اور طور طریقوں کے سلسلے میں ہی فکر کی دو متحارب راہیں آشکارا ہوئیں۔

تیرھویں صدی میں جو مسلم حملہ آور ہندوستان آئے، وہ محض جنگ جو سپاہی تھے وہ بہادر تھے تلوار کے دھنی تھے اور ہندوستان کے مال و دولت سے مسحور تھے، لیکن اس کے باوجود وہ فرماں روائی اور حکمرانی کا کوئی وسیع تجربہ نہیں رکھتے تھے، ان کی ذہنی سطح بھی کوئی زیادہ بلند نہیں تھی، انہوں نے اپنے عہد کی ایرانی تورانی اور عربوں کی اسلامی تہذیبوں کو بے تکلف قبول کیا تھا انہوں نے ہندوستان کی تہذیب سے بھی اثرات قبول کئے لیکن انہوں نے ان سب تہذیبوں کے امتزاج سے کسی ایک تہذیب ایک نظام حکومت اور ایک طریقے کی نہ تو داغ بیل ڈالی اور

نہ ہی اس سمت میں کوئی قدم اٹھایا، یہ کام بابر کی اولاد کے ہاتھوں سرانجام پایا ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں "چغتائی خاندان ہندوستان آنے سے پہلے پشت ہاپشت سے ملک گیری اور ملک داری کرتا چلا آیا تھا اس نے مغلوں اور ترکوں کی جفاکشی اور سخت کوشی میں ایرانیوں کی لطافت اور شائستگی اور اسلام کی روحانی گہرائی اور اخلاقی ضبط کی قلم لگا کر تہذیب کا ایک خوش نما اور جان دار درخت تیار کر لیا تھا، جب وہ ہندوستان کی زرخیز زمین میں آیا تو اپنے ساتھ اسلامی مغل تہذیب کا قیمتی پودا اور اس سے زیادہ قیمتی چیز یعنی نخل بندی اور پیوند کاری کا تجربہ لے کر آیا تھا۔ بابر اور ہمایوں کی شخصیتیں تہذیب کا عمدہ نمونہ تھیں، اگر ان کا عہد حکومت کچھ طویل ہوتا تو یقیناً یہ تہذیب کی تعمیر نو کا کام شروع کر دیتے لیکن ان دونوں کو مشکل سے مغلیہ سلطنت کا پودا نصب کرنے کا موقع مل سکا اس کی آبیاری اور پرداخت اکبر کے ہاتھوں ہوئی۔

یہ درست ہے کہ حکومت اور حکمرانی کی سطح پر مغلیہ خاندان نے مختلف تہذیبوں کو قریب لانے اور ان کا بُعد دور کرنے کی کوشش کی لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ایسی تحریکیں ہندوستان میں مغلوں کی آمد سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھیں اور ہندو اور مسلمان دونوں ان تحریکوں سے متاثر ہو رہے تھے ان تحریکوں کا مقصد ہندوستان کے مختلف مذاہب کی تعلیمات کو یکجا اور ہندوستان گیر ملک کی نشوونما کرنا تھا دراصل ہندوستان میں اسلامی تعلیمات کا سب سے بڑا مرکز صوفیاء تھے، انہی کی تعلیمات نے یہاں کی آبادی کو اسلام سے روشناس کرایا، مولانا عبیداللہ سندھی کے افکار بیان کرتے ہوئے پروفیسر سرور لکھتے ہیں، صوفیاء اسلامی تحریک کا ہراول دستہ تھے عام طور پر حاکم و محکوم کبھی صلح و آشتی سے شیر و شکر نہیں ہو سکتے حاکم زبردستی سے محکوم پر حکومت کرتا ہے اور جب محکوم میں طاقت آتی ہے تو وہ حاکم کی حکومت، اس کے مذہب، اس کے کلچر اور اس کے تمدن کو مٹا دیتا ہے۔ ہندوستان میں ہندو تو مذہب، زبان، تمدن بلکہ ہر چیز میں مسلمان حاکموں سے جدا تھے۔ اور ظاہر ہے ترک اور مغل تلوار سے اتنے بڑے ملک پر حکومت نہیں کر سکتے تھے اور ہندوؤں کو اسلام سے قریب لانا ان شمشیر آزما سپہ سالاروں کے بس میں نہ تھا۔ اس لئے ضرورت تھی کہ محکوم قوم کی ذہنیت کو صحیح طور پر سمجھا جائے اور اُسے اس طرح ڈھالا جائے کہ اسلام ان کے لئے اجنبی نہ رہے ہمارے

صوفیاء اس ملک میں یہ کام کرتے تھے۔

یہ عمل جو تاریخی ضرورتوں اور حالات نے صوفیاء کے سپرد کیا تھا اسی قسم کا عمل خود ہندوؤں میں بھی رونما ہو رہا تھا جس طرح مسلمانوں کو اپنی اجنبیت اور بُعد دور کرنے کے لئے ایک ایسے سانچے اور فکر کی شعوری اور غیر شعوری طور پر ضرورت تھی جو اسلام کی روح کو برقرار رکھتے ہوئے ہندوستان کی عام آبادی کو قابل قبول ہو اسی طرح ہندوؤں کو بھی یہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ حاکم سے بعد زیادہ دیر تک قائم نہیں رہنا چاہیے۔ دوسرے اسلامی تعلیمات کے چرچے نے ہندوؤں کو متاثر بھی کرنا شروع کر دیا، اس طرح سے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں میں ایسی فکر اور تحریکیں ابھرنے لگیں جو ایک دوسرے کو قریب لانے اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں ممد ہوں ان میں سے بعض تو خاصی کامیاب ہوئیں اور انہوں نے اپنے اثرات بھی چھوڑے

ذہنی تبدیلیاں

ان ذہنی تبدیلیوں اور نئے افکار کے دائروں کی تلاش کا سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے اور اس کا سرا مشکل سے ہاتھ آتا ہے بہرحال ایک نتیجہ مسلّم ہے کہ اکبر کی تخت نشینی تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک دوسرے کے قریب آنے کا جذبہ موجود تھا اور ضرورت بھی تھی۔ اب اس جذبے اور ضرورت کی فضا میں اکبر کے سیاسی داؤ اور مقاصد حکمرانی مل گئے تو ایک ارتعاش پیدا ہو گیا۔

اکبر نے جب بیرم خاں سے علیحدگی اختیار کی تو اس کی عمر صرف بیس برس اور کچھ ماہ تھی۔ اس جوانی کے عالم میں اسے ایک وسیع سلطنت کو سنبھالنا تھا اب اکبر نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو اس کی اپنی بے بسی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی ایک طرف دربار میں ایرانی اثر بہت زوروں پر تھا۔ اور بیرم خاں کی علیحدگی دراصل اسی زور کو توڑنے کے لئے تھی دوسری طرف افغان اور ہندوستان کے مسلمان بھی مغلوں کو بدیسی حاکم تصور کرتے تھے اور لودھیوں نے جب بابر کا مقابلہ کیا تھا تو فوج میں ہندوستانی مسلمان بھی تھے اور پھر جب پانی پت سے بابر آگے بڑھا تو راجپوتوں نے قدم قدم پر مغلوں سے مقابلہ کیا اب یہ اجنبیت تھی، یہ مخالف طاقتیں تھیں جن کو اکبر نے یا تو مسخر کرنا تھا یا

ان سے سمجھوتے کی راہ نکالنی تھی اس کے متعلق مولانا سندھی بہت تفصیل سے لکھتے ہیں بیشک اکبر بابر سے کم تیغ آزمانہ تھا، لیکن وہ یہ جانتا تھا کہ اگر تیغ آزمائی کے ساتھ ساتھ سلطنت کی بنیادیں محکم اور پائیدار بنائی نہ جائیں تو سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں اکبر اگر صحیح معنوں میں بڑا بادشاہ نہ ہوتا تو ان حریف قوتوں کے مقابلہ میں سپر ڈال دیتا۔ لیکن اس کی قسمت میں تو ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے نظام کا ڈول ڈالنا لکھا تھا اور قدرت نے اس کو اس بڑے کام کی پوری صلاحیت بھی دی تھی۔ چنانچہ اکبر نے اس عہد کے تاریخی تقاضوں کو پورا کرنے کی ہمت کی اس وقت ہندوستان میں ضرورت تھی ایک ایسی سلطنت کی جو ہندوؤں کو جن کی اکثریت تھی اور جن میں اب سیاسی بیداری اور قومی شعور پیدا ہو چلا تھا اپنا سکتی وہ ہندوستان میں آباد مسلمانوں کو بھی مطمئن کرتی اور بابر اور ہمایوں کے ماتحت جو نئے عناصر ملک میں آگئے تھے ان کو بھی ساتھ ملاتی اگر خلجیوں اور تغلقوں کی طرح محض فوجی طاقت کے زور پر نئے عناصر حکومت کرنا چاہتے تھے تو ہندو اور ہندوستانی مسلمان مل کر ان کو ہمایوں کی طرح سلطنت سے بے دخل کر سکتے تھے اور اگر ہندوؤں کو حکومت میں شریک نہ کیا جاتا تو ان کی ریشہ دوانیوں سے کبھی چین نصیب نہ ہوتا کیونکہ اب ہندوستان کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ ہندوؤں کو ناراض کر کے اس ملک میں امن قائم کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

اکبر کے افکار اور ضرورتیں

ہندوستان کا یہ تاریخی دور ایک ایسے نظام کا متقاضی تھا جو ہندوؤں اور ہندوستانی مسلمانوں اور مغلوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کرتا جس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل ملاپ سے ایک متحدہ کلچر بن رہا تھا اور ایک مشترکہ زبان کی بنیاد پڑ رہی تھی، نیز ہندوؤں میں کبیر اور نانک ایسے مصلح پیدا ہو رہے تھے جو دونوں قوموں دونوں تمدنوں اور دونوں مذہبوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں کوشاں تھے، اسی طرح سلطنت اور ریاست میں بھی ایک ایسے نظام کی ضرورت تھی۔ جو دونوں قوموں میں مشترک ہوتا وہ اسلامی بھی ہوتا، ہندوستانی بھی ہوتا اور ظاہر ہے آزاد بھی ہوتا چنانچہ اکبر پہلا مسلمان فرمانروا ہے جس نے اس ملک میں آزاد اسلامی ہندوستانی سلطنت کی بنیاد رکھی جو نہ

ایران کے حلقہ بگوش تھی نہ عثمانی سلاطین کی تابع یہ مسلمانوں کی قیادت میں ہندوستان میں قومی حکومت کی تشکیل تھی اور عالم اسلام کے اصول و قوانین کے اندر ہندوستانی قومیت اور اس کے تمدن اور تہذیب کو زندہ کرنے کی کوشش تھی۔ اکبر کے دور میں جونیا عمل شروع ہوا اس کے حق اور مخالفت میں اس قدر لکھا گیا ہے کہ توازن ہی باقی نہیں رہتا، لیکن مولانا عبید اللہ سندھی نے اس مسئلہ پر جس قدر وضاحت اور تفصیل سے لکھا ہے وہ کم لوگوں کے حصے میں آیا ہے۔ اسی لئے اس مسئلے پر ان سے زیادہ بہتر کوئی اور نہیں کہہ سکتا، کیونکہ وہ عالم دین بھی تھے۔ اور نئے پن اور جدید افکار کے موید اور حامی بھی تھے اور سچ یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی فکر کو نئی راہیں دکھائی ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں کہ اس وقت کوئی ہندوستانی حکومت خواہ اس کا اقتدار کلیتہً مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں ہوتا غیر مسلم ہندوستانیوں کو شریک کئے بغیر نہیں بن سکتی تھی۔ اکبر نے راجپوتوں کو اپنے ساتھ ملایا حاکم محکوموں کو زور بازو سے بھی اپنے ساتھ ملا سکتے تھے۔ لیکن یہ اوپری دل سے ہوتا اور دیرپا نہ ہوتا۔ اکبر نے راجپوتوں کے دلوں کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کی اس نے راجپوتوں سے ناطہ جوڑا ان کی بعض رسمیں قبول کیں۔ ان کو اپنے سے قریب کیا۔ ہندوؤں سے جزیہ اٹھا دیا اور وحدت الوجود کے عقیدہ کو اپنے نئے فکر کی بنیاد قرار دے کر یہ واضح کر دیا کہ صداقتیں سب مذاہب میں ہیں اور ایک ہی مصدر سے ہر قوم کو رشد و ہدایت کی نعمتیں ملتی رہتی ہیں، اکبر کی یہ باتیں محض سیاسی مصلحتیں نہ تھیں بلکہ وہ دل سے بھی ان کا قائل تھا۔ اور فیضی اور ابوالفضل نے اکبر کو ان باتوں کے سچا ہونے پر یقین دلا دیا تھا اور وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ اسکے اس مسلک سے اسلام کو گزند نہیں پہنچے گا،

اکبر کی ریاست کا تخیل اور نقشہ

اکبر نے ایک بالکل نئی طرز کی حکومت کا تصور اور پھر اس کا ڈھانچہ تیار کیا، اُسے یہ یقین ہوگیا کہ ایک پائیدار مملکت کسی ایک فرقے کی نہیں ہو سکتی اس میں سب فرقوں، سب مذہبوں اور سب طبقوں کا برابر کا حصہ ہونا چاہیئے۔ بنیادی حقوق سب کے مساوی ہوں، جس میں تمام باشندوں کو ایک بادشاہ کی رعایا ہونے سے فخر محسوس ہو اور ان میں کوئی شہری کی حیثیت سے برتری

محسوس نہ کرے۔ چنانچہ اس ڈھانچہ کی تیاری کے لئے اس کو قومی اور فکری دونوں محاذوں پر نئی عمارتیں تعمیر کرنی تھیں اور نئے اقدام کرنے تھے۔

فوجی محاذ پر اس نے سب سے پہلے راجپوتوں کی طرف توجہ کی، اس لئے کہ مسلمانوں کے آنے سے پہلے شمالی ہند پر راجپوت ہی مکمل طور پر قابض تھے اور گواب وہ راجپوتانہ کے وسیع وعریض قطعے میں ایک طرح سے سمٹ گئے تھے، لیکن ان کے دل میں حکمرانی کا جذبہ موجود تھا۔ اور یہ کسک بھی موجود تھی کہ وہ اقتدار سے محروم کئے گئے تھے اور اقتدار سے محروم کرنے والے مغل ہیں اور آج ان کا نمائندہ اکبر ہے چنانچہ اکبر نے راجپوتوں کے متعلق جو پالیسی وضع کی اس کی بنیاد راجپوتوں کے وجود کو تسلیم کرنا اور اس کے عوض میں اپنی حاکیت تسلیم کروانا تھا کیونکہ یہی ایک بنیاد ہو سکتی تھی۔ جس سے راجپوت سپر بھی ڈال دیں گے اور اکبر کی حکومت کو تسلیم بھی کریں گے اور اس سے لشکر کشی کی نوبت بھی نہیں آئے گی۔ چنانچہ سب سے پہلے امبر کے راجہ بھارمل کی لڑکی سے شادی کی، اس سے انہوں نے راجپوتوں کی پوری سیاست بدل کے رکھ دی۔ ان کے دل سے محرومی کی کسک نکل گئی اور وہ اکبر کی سلطنت کو اپنی سلطنت سمجھنے لگ گئے، پھر اس نے یاتریوں پر ٹیکس معاف کر دیا اور ۱۵۶۴ء میں اس نے جزیہ بھی منسوخ کر دیا اور یہ اعلان کر دیا کہ ملک ہند کا کوئی باشندہ بلا تفریق مذہب وملت غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کے بعد اس سے ہندوؤں کو کثرت سے اعلیٰ عہدوں پر مقرر کرنا شروع کر دیا اور اس نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ صرف ہندوؤں کی تالیف قلوب کے لئے ہی نہیں بلکہ بنیادی طور پر ان کو ریاست اور مملکت کے امور میں شریک کرنا چاہتا ہے۔

رکاوٹیں اور ان کا ردّ عمل

اکبر جس راہ پر چل رہا تھا وہ راہ کوئی اتنی آسان اور کانٹوں کے بغیر نہ تھی۔ مملکت کے اس تصوّر سے مسلمانوں کی برتری کو ٹھیس لگتی تھی، لیکن کن مسلمانوں کی برتری کو ؟ عام مسلمانوں کی نہیں بلکہ تنگ نظر علماء کی۔ کیونکہ ریاست اور مملکت کے امور میں ان کا دخل ختم ہو جاتا ہے اور اگر ختم نہیں ہوتا تو کم از کم گھٹ ضرور جاتا ہے اس لئے ان میں اکبر کے خلاف ایک جذبہ پیدا ہونا لازمی تھا۔ اُدھر

اکبر کو اپنی مملکت کے لئے ایک فکر کی ضرورت تھی اور جب سب قومیں مل کر حکومت کر رہی ہوں تو اس فکر میں سب قوموں، مذہبوں اور رجحانات کی آمیزش ہونی چاہیے۔ اسی ضرورت نے اُسے ایک نیا فکر مرتب کرنے کی طرف اکسایا اور یہی فکر "دین الٰہی" کے نام سے پکارا جانے لگا لیکن اس دین الٰہی کے گرد اس قدر متضاد بیانات کے تانے بانے بنتے گئے ہیں۔ کہ ان کی چھان پھٹک خاصی مشکل ہو جاتی ہے۔

مختلف تاریخیں اس بات پر متفق ہیں کہ اکبر خاصا مذہبی شغف رکھنے والا انسان تھا اور بچپن سے ہی اس کے رگ و پے میں مذہبیت رچی ہوئی تھی۔ اور اس میں تصوف کے ساتھ گہرا لگاؤ تھا وہ سالہا سال ریاضت کرتا رہا، چلہ کشی بھی اس نے کی اور خواجہ معین الدین چشتی سے بھی اسے بہت گہری عقیدت تھی، وہ علمائے دین کا بھی بہت احترام کرتا تھا۔ اور وہ شریعت کا بھی پابند تھا لیکن جوں جوں وہ علماء کو قریب سے دیکھتا گیا ویسے ویسے اس کی طبیعت رسمی مذہب سے ہٹتی گئی، پھر بھی یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے اسلام کو ترک کر دیا یا اس کے حقیقی مذہبی احساسات میں کوئی کمی ہوئی علماء سے اکبر کے تصادم کی تاریخ اور کہانی بھی بہت دلچسپ ہے۔

اکبر کی ابتدائی زندگی میں جو گہرا مذہبی رنگ تھا اور علماء کا جو احترام تھا اس کے پیش نظر یہ تصادم بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس کی بچپن سے جوانی تک مذہبی امور شیفتگی کی لاتعداد داستانیں ہیں، شیخ اکرام لکھتے ہیں کہ شاہان سور نے علماء کو بڑا زور و اقتدار دے رکھا تھا اس میں ملکی مصلحتیں بھی تھیں اور طبیعت کا لگاؤ بھی، اکبر نے یہ سلسلہ اور وسیع کر دیا۔ جا بجا قاضی و مفتی مقرر کئے۔ مخدوم الملک شیخ الاسلام کی قدر منزلت بڑھا دی اور صدر الصدور کو وہ اختیار دیئے کہ نہ اس سے پہلے نہ اس سے بعد یہ ملے ہوں گے۔ مخدوم الملک تو امور ملکی میں اس کے مشیر اور رکن سلطنت تھے، صدر الصدور شیخ عبدالنبی کا بھی وہ دل و جان سے معتقد تھا کبھی کبھی حدیث سننے ان کے گھر جاتا۔ ایک دفعہ جوتے ان کے سامنے اٹھا کر رکھے۔ شاہزادہ سلیم کو ان کی شاگردی میں داخل کیا تاکہ جامی کی چہل حدیث ان سے پڑھے۔ صدر الصدور شیخ عبد القدوس گنگوہی کے پوتے تھے اور تقویٰ و پرہیزگاری میں منفرد تھے۔ ان

کی تلقین و تعلیم اور فیض صحبت سے یہ حال ہوا کہ نماز باجماعت کی پابندی تو ایک طرف اکبر اذان دیتا۔ امامت کرتا اور مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتا۔

یہ اکبر تھا جو بعد میں "کافر" ٹھہرا اور جس نے ایک نیا دین قائم کیا اور یہی اکبر تھا جس کا علماء سے تصادم ہوا اور اس نے ان کا زور توڑ دیا۔ یہ داستان عبرتناک بھی ہے۔ اور المناک بھی۔ اکبر جس کا بچپن سخت مذہبی ماحول میں گزرا تھا جس کی رگ رگ میں مذہب کا تقدس اور احترام رچا ہوا تھا، جو مسجد میں جھاڑو دیتا، اولیاء کے مزاروں پہ پا پیادہ جاتا جو برسر دربار علماء کی جھڑکیاں اور ڈانٹ ڈپٹ سنتا اور سر تسلیم خم کر دیتا، اس نے آخر مولویوں سے بغاوت کیوں کی۔ ایک ایسا فکر کیوں اپنایا جس میں علماء کا فیصلہ قطعی نہ ہو سکتا تھا وہ خود امام عادل کیوں بنا؟ یہ سوال خاصے دلچسپ ہیں۔ اور ان سوالوں کے جواب میں تاریخی طور پر عبرت بھی پوشیدہ ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اکبر اپنی سالگرہ کے موقع پر زعفرانی رنگ کے لباس میں ملبوس دربار میں آیا اور وہ اپنے تخت کی طرف بڑھ رہا تھا کہ صدر الصدور نے اسے اس لباس اور اس کے رنگ پہ سر دربار ٹوک دیا اور اس شدت سے ٹوکا کہ صدر الصدور کے عصا کا سرا اکبر کے سینے کو چھو گیا۔ اکبر چپکا ہو رہا اور جا کر تخت پہ بیٹھ گیا لیکن دربار کے اختتام پر اس نے اپنی ماں سے رو کر شکایت کی تو اس کی ماں نے کہا کہ بیٹا یہ رنج اور دکھ کی بات نہیں ہے بلکہ یہ تو خوشی، فخر اور نجات کا ذریعہ ہے۔ تاریخ دان کل کہے گا کہ ایک بوڑھے عالم نے اتنے بڑے بادشاہ کو عصا مار کر جھڑک دیا اور وہ بادشاہ فقط شرع کے ادب سے خاموش رہا۔

یہی نہیں بلکہ جب اکبر کو سلطان المشائخ خواجہ اجمیری سے عقیدت پیدا ہوئی تو اس نے ہر سال اجمیر جانے کو اپنا معمول بنا لیا، اور سال کے سال ہی نہیں بلکہ ہر مہم اور حملہ سے پہلے وہ اجمیر جا کر دعا مانگتا اور پھر مہم پہ روانہ ہوتا۔ اور وہ ایک منزل پہلے سے اجمیر تک پا پیادہ جاتا، بلکہ بعض دفعہ تو وہ فتحپور یا آگرے سے اجمیر تک پیدل جاتا۔ وہاں مزار پہ ہزاروں اور لاکھوں روپے نچھاور کرتا، چڑھاوے چڑھاتا اور دنوں وہاں مراقبے میں پڑا رہتا۔ فوج کو ہدایت تھی

اکہ ہر مہم میں "یا ہادی یا معین" کا نعرہ لگا کر حملہ کریں۔ اور علامہ شیرانی کا تو یہ خیال ہے کہ سلطان المشائخ کو دسویں صدی میں جو خاص شہرت حاصل ہوئی اس میں اکبر کی عقیدت مندی کو بہت بڑا دخل ہے۔

عبادت گھر

یہی مذہب سے شیفتگی اور پیروں، فقیروں پر اعتقاد تھا۔ جس نے اکبر کو فتحپور سیکری جیسا شہر تعمیر کرنے پر اکسایا، یہ شہر اسی جگہ تعمیر کیا گیا جہاں سلیم چشتی سے اکبر نے اپنے ہاں اولاد نرینہ کے لئے دعا منگوائی تھی۔ چنانچہ ۱۵۷۱ء میں جو جگہ ایک معمولی گاؤں کی حیثیت رکھتی تھی وہاں شہنشاہوں کی رہائش کے لئے محل اور دربار تعمیر ہونے لگے، اور دیکھتے دیکھتے یہ گاؤں ہندوستان کے مغل شہنشاہ کا دارالسلطنت بن گیا یہیں اکبر ایک زمانے میں ایک چھوٹے سے حجرے میں اپنا وقت مراقبوں، عبادت اور دعاؤں میں گزارا کرتا تھا۔ چنانچہ جب نیا دارالسلطنت تعمیر ہوا تو یہاں شیخ سلیم چشتی کی نئی خانقاہ کے پاس ایک عالی شان عمارت تعمیر کرائی گئی اور اس کو عبادت گھر کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہاں اکبر ہر جمعہ کو شیخ سلیم کی خانقاہ پر حاضری دینے کے بعد دربار منعقد کرتا اور اس میں علماء و فضلاء اور دانشوروں کو جمع کیا جاتا اور دین کی باتیں ہوتیں۔ مسئلے مسائل کا تذکرہ ہوتا، عبادات کی اہمیت بیان ہوتی۔ یہ عبادت گھر اکبر کے مذہبی جوش و خروش کا مظہر تھا۔ لیکن اسی عبادت گھر سے اسے ایک نئے فلسفہ اور نئے فکر کی راہ ملی اور یہی راہ اسلام اور دین کے منافی قرار پائی۔

اکبر کو پہلی دفعہ یہاں عبادت گھر کی مجالس سے بعض علماء کی کمزوریاں، نفس پرستیاں اور طلب جاہ کے لیے سازشوں کے تانے بانے، جھوٹ اور افترا کی بلند بانگ عمارتیں بالکل قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اس کے متعلق منتخب التواریخ کا مصنف بدایونی لکھتا ہے کہ جب اس عبادت گھر کے دربار میں مرزا مفلس نے ایک تفسیر پیش کی تو اس وقت حاجی ابراہیم سرہندی نے ان سے سرِ دربار پوچھا کہ آپ یہ تو بتایئے کہ موسیٰ کا صیغہ کیا ہے اور اس کا ماخذ

اشتقاق کیا ہے؟ مرزا مفلس علومِ عقلی میں دسترس رکھتے تھے اور ان کا درجہ بہت بلند تھا لیکن ماخذوں اور گرامر کے جھگڑوں میں نہ پڑتے تھے چنانچہ کوئی جواب نہ بن پڑا بس پھر کیا تھا۔ دربار میں قہقہہ پڑ گیا۔ اور چاروں طرف یہ بات زبانِ زدِ عام ہوگئی کہ حاجی ابراہیم نے مرزا مفلس کو لاجواب کر دیا۔ چنانچہ اکبر نے ایک اور عالم سے پوچھا کہ وہ عبادت گھر کی محفلوں میں شرکت کیوں نہیں کرتے تو دست بستہ فرمانے لگے کہ اگر وہاں حاجی ابراہیم نے عیسیٰ کا صیغہ پوچھ لیا تو فرمائیے میں کیا جواب دوں گا۔

اس عبادت گھر کے دربار کی کیفیت الف لیلیٰ کی اچھی خاصی داستان معلوم ہوتی ہے اس دربار اور اس محفلِ علم میں شریک ہونے والے علمار کا مقصد علم کی تشنگی مٹانا نہیں تھا۔ بلکہ اپنے مخالفوں کو چاروں شانے چت گرانا، ان کی تضحیک اور توہین کرنا اور بادشاہ کی نظروں میں ان کو گرانا ہوتا تھا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب ملا عبدالقادر بدایونی اس مجلس میں پہلے پہل آئے تو انھوں نے شیخ عبدالنبی جو اکبر کے دربار میں صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھے، کو اور حاجی ابراہیم جو دربار کے جید سربراہ اور مانے ہوتے عالم سمجھے جاتے تھے کو نیچا دکھانے کا عزم کیا تاکہ اپنے لیے صف اول میں جگہ حاصل کر سکے تو اکبر نے سرِ دربار کہہ دیا کہ اب حاجی ابراہیم اور صدر الصدور کا سر پھوڑنے والا آگیا ہے۔ اب لطف رہے گا۔ یہاں معاملہ اگر علمی چٹکیوں کا ہوتا تو پھر بھی گوارا تھا۔ لیکن علمار نے مذہبی مسائل پر جس انداز سے اختلاف کیا اور تکفیر حرام و حلال جس انداز سے عام ہوئے اس نے اکبر کو خاصا برگشتہ کر دیا۔

اس ضمن میں ایک قصہ خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ اکبر کی چار سو سے زیادہ بیویاں تھیں ایک دن تعدد ازدواج کے مسئلہ پر گفتگو شروع ہوئی تو اکبر کو بھی خیال پیدا ہوا کہ کسی بیوی کو طلاق دیے بغیر کس طرح سے شرح کی پابندی کا مسئلہ حل ہو۔ ایک دو علمار نے متعہ کا راستہ دکھایا دوسروں نے اس کی مخالفت کی۔ اس پر بدایونی نے کہا اگر ایک مالکی قاضی اس کے حق میں اپنے اصول کی رُو سے فتویٰ دیدے تو پھر ایک حنفی عالم کے لیے بھی لازمی ہو جاتا ہے کہ وہ مُتعہ کو جائز قرار دیدے۔ چنانچہ یہ سننا تھا کہ حنفی قاضی کو برخواست کر دیا اور اس کی جگہ مالکی

فقہ کے حامل عالم قاضی حسین کو مقرر کر دیا۔ اور اس نے حسب خواہش فتویٰ دیدیا۔

عُلماء سے برگشتگی

علماء کے ان طور اطوار نے اکبر کو خاصا برگشتہ کر دیا۔ اور جب دربار میں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جانے لگیں۔ ان میں حنبلی، سنی، مہدوی، شیعہ، سبھی قسم کے بزرگ تھے اور ہر ایک اپنے مسلک کی بات کرتا تھا۔ ان اختلافات نے اکبر کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس تشکک اور برگشتگی کے عالم میں اکبر کی ملاقات شیخ تاج الدین سے ہوئی یہ بہت بڑے عالم بھی تھے اور شیخ ابن عربی کے معتقد اور وحدۃ الوجود کے فلسفہ کے ماننے والے بھی تھے چنانچہ انھوں نے ابن عربی کی تصانیف سے اکبر کو متعارف کرایا۔ اور ایک وحدۃ میں جب کئی وجود بتائے تو اکبر بہت متاثر ہوا۔ اور اسے علماء کے متشددانہ رویے کا جواب مل گیا۔ کیونکہ ان علماء کی سخت گیری اور تنگ نظری سے وہ پہلے ہی خاصا تنگ اور برگشتہ تھا۔ اس برگشتگی میں اضافہ کی وجہ سے ابوالفضل اور فیضی کی صحبت بھی تھی۔ چنانچہ علماء نے جب ابوالفضل اور اس کے باپ کے خلاف محاذ بنانا شروع کیا تو اس نے اکبر کو اور بھی ان علماء کے خلاف کر دیا۔

فیضی ١٥٦٨ء میں اکبر کے دربار میں پہنچا اور رفتہ رفتہ اس نے اپنے کم سن بھائی ابوالفضل اور اپنے والد شیخ مبارک کو بھی دربار میں پہنچا دیا۔ ان تینوں میں ابوالفضل نے بادشاہ کے مزاج میں بہت زیادہ دخل حاصل کر لیا۔ اس کی غیر معمولی ذہانت، قابلیت موقعہ شناسی، مزاج دانی اور اس کے ساتھ خوشامد کے فن میں مہارت اس کے لیے مفید ثابت ہوئی اور اکبر اس نوجوان عالم کا گرویدہ ہو گیا۔ ابوالفضل اپنے باپ اور بھائی کی طرح فلسفی ذہن کا مالک تھا۔ وہ عقل کو رہبر مانتا تھا اور اس کی آزاد خیالی اور وسیع المشربی مسلمہ تھی۔ اس نے اکبر کو آزاد خیالی کی راہ پر لگایا اور نئے مسلک کے لیے راہ ہموار کی۔

دین الٰہی کی تحریک

دراصل اکبر کے دل و دماغ میں جو شکوک و شبہات اور وسوسے جنم لے رہے تھے ان کو اس کی اپنی سیاسی اور حکمرانی کی ضرورتوں نے اور بھی ہوا دی تھی اور اس کے ایک طرف اکبر کو سیاسی اقدام کے لیے مجبور کیا تو دوسری طرف وہ ایک ایسے فکر کو اپنانے پر مجبور ہوا جو ہندوستان کے مختلف مذاہب کی بھی تشفی کر سکے۔

ایک طرف اکبر نے راجپوتوں جیسی طاقت کو اپنے ساتھ ملانے اور ہاتھ میں لینے کی کوشش کی۔ اس کے لیے اس نے ان سے رشتے کیے اور راجپوتوں کے تیوہاروں، ان کے لباسوں اور ان کے رسوم کو اپنایا۔ صرف یہی نہیں بلکہ نئے مسلک کے لیے وحدۃ الوجود کے فلسفے کو بھی اپنایا۔ اس فلسفے کو قبول کرنے کا مطلب واضح تھا کہ صداقت تمام ادیان اور مذاہب میں مشترک ہے اور رشد و ہدایت کا منبع ایک ہی ہوتا ہے۔ اکبر کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اس مسلک کو ایک نئے دین کی حیثیت سے پیش کرنے کا داعی تھا۔ غلط ہے اور یہ کہنا کہ اس کا اعتقاد اسلام سے اٹھ گیا تھا۔ اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ اس کی آزاد خیالی مسلمہ تھی لیکن وہ سمجھتا تھا کہ یہ آزاد خیالی اسلام کو گزند نہیں پہنچائے گی۔

اکبر کے دین الٰہی کے متعلق مولانا عبیداللہ نے تفصیلی گفتگو کی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ اکبر کے دین الٰہی کے متعلق اس عہد کے مورخ ملا عبدالقادر بدایونی نے بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ ملا صاحب بڑے سخت گیر مورخ ہیں ہمیں یہاں ان کے بیانات کی تردید مقصود نہیں لیکن ہمارے خیال میں ملا صاحب نے اکبر کے ان واقعات کو سطحی نظر سے دیکھا ہے اور انھوں نے زیادہ تعمق سے کام نہیں لیا۔ خود ہمارے زمانے میں مصطفےٰ کمال کی مثال موجود ہے۔ مرحوم کی بے دینی اور الحاد کے متعلق کئی عینی شاہد پیش کیے جاتے ہیں وہ بھی ایک نہیں بلکہ سینکڑوں۔ مصطفےٰ کمال کو ترکی میں ایک نئے دور کا آغاز کرنا پڑا اگر وہ ایسا نہ کرتا تو ترکی کے حالات کچھ ایسے تھے کہ ترک قوم کا وجود ہی خطرے میں پڑ جاتا۔ اور مخالف قوتیں اسے ابھرنے کا موقعہ نہ دیتیں۔ مصطفےٰ کمال نے نئے دور کی داغ بیل ڈالی۔ جو اس طرزِ نو کا

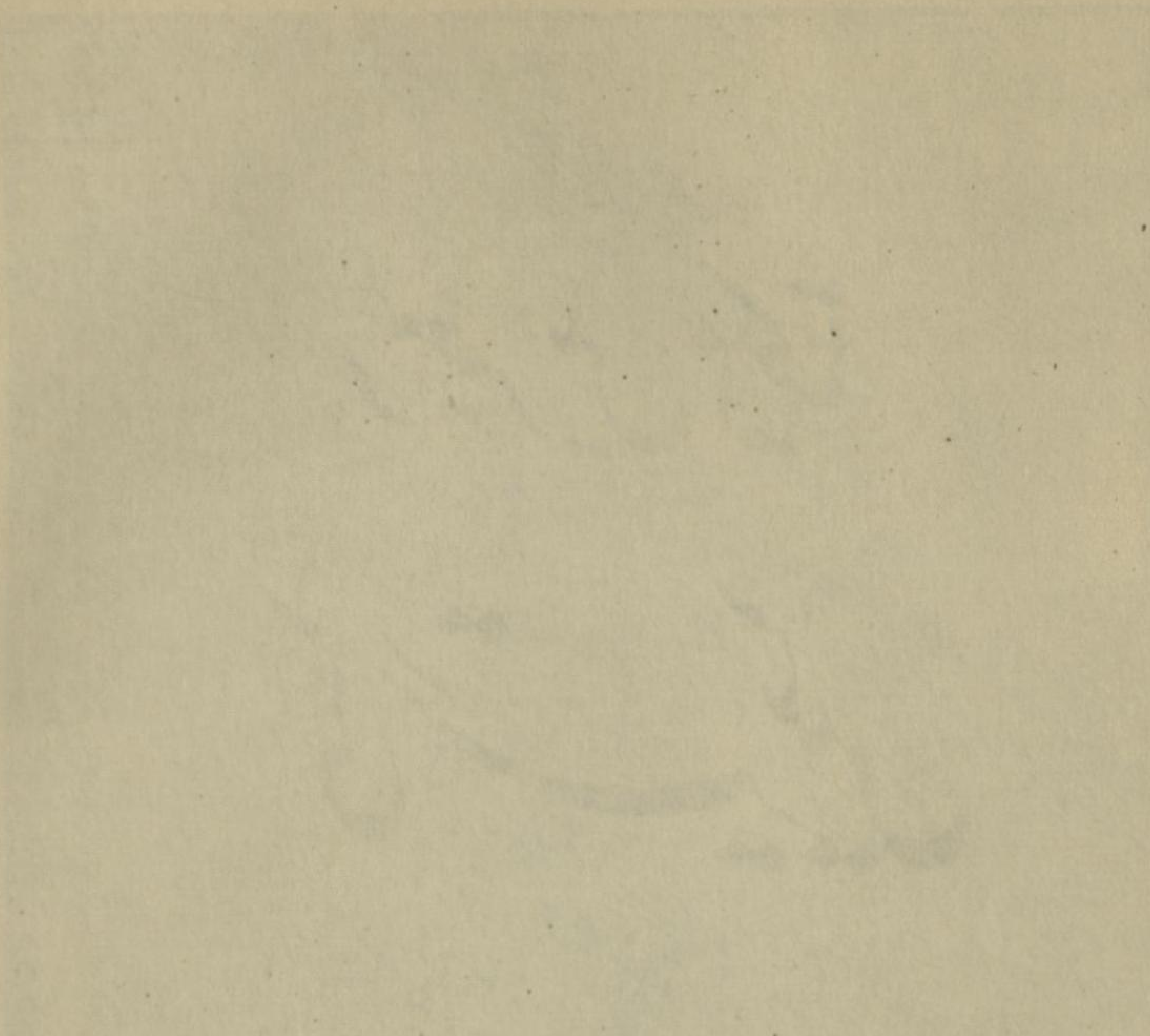
حامی نظر آیا اسے اپنے ساتھ ملا لیا جن لوگوں نے اس کی مخالفت کی ان کو اور ان کی ہر چیز کو مردود قرار دیا ممکن ہے کہ اس کے معاون اپنے ساتھ بری عادتیں بھی لاتے ہوں۔ لیکن چونکہ ضرورت مددگاروں کی تھی اس لیے انھیں قبول کر لیا گیا۔ اسی طرح اکبر کو اپنے نئے ملک کے لیے حمایتی چاہئیں تھے۔ وہ اسے جس گروہ سے بھی ملے اس نے انھیں اپنے اردگرد جمع کر لیا اور ان سے اپنا کام چلایا۔ جب کسی فکر پر عمل ہوتا ہے تو شروع شروع میں بعض دفعہ گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ خواہ فکر کتنا ہی صاف اور واضح کیوں نہ ہو۔ لیکن چونکہ کام کے لیے موزوں آدمی میسر نہیں آتے اس لیے کام نہایت بے ڈھنگے پن ہوتا ہے اور اکثر اوقات اس سے عجیب خلفشار سا پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر یہ خلفشار صرف ایک پہلو ہے اور دین الٰہی اور اکبر کے ریاستی تقاضے ایک طرف لیکن اس سے بہت پہلے ہندوستان میں مختلف تہذیبوں کو یکجا کرنے کی تحریکیں شروع ہو گئی تھیں۔ ان کو بھی جاننا چاہیے تاکہ آج جو لاعلمی اور غلط فہمی کی بنا پر مشترک تہذیب کو کفر کے مترادف قرار دیا جا رہا ہے اس کو صحیح پس منظر میں جانچا اور پرکھا جا سکے۔



شیرانوالہ دروازہ کے باہر فاروق گنج کی ایک تنگ گلی میں یہ ٹوٹا پھوٹا سا مکان ایک یادگار عمارت ہے۔ ایک ایسی عمارت جہاں علم و عرفان کا منبع، زہد و تقویٰ کا پیکر، ایک مجسمِ نور ۱۹۱۷ء میں آکر آباد ہوا اور کئی سال تک مقیم رہا۔

باب ۱

برصغیر میں ایکتا کی تحریکیں



تاریخ بھی ایک بحر بیکراں ہے جس کا تجزیہ مختلف ندیوں، نالوں، دریاؤں کو جو مختلف سمتوں سے آکر اس میں جا ملتے ہیں گننے کے مترادف ہے اور اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ تاریخ کی ترتیب میں بعض ایسے عناصر بھی حصہ لیتے ہیں جن کے متعلق مدتوں تاریخ دان کچھ نہیں جان سکتے یا تاریخ کا ایک مجوزہ اور مستقل نظریہ ان عناصر کو اہمیت ہی نہیں دیتا اس لیے مدتوں تک تاریخ کی ترتیب میں حصہ لینے والے ایک اہم عنصر کا پتہ نہیں چل سکتا۔ کچھ اسی انداز میں اکبر کے دین الٰہی پر گفتگو کی جاتی رہی ہے اور اس کو مذہب کی آویزش یا ایک نئے فرقے یا ایک نئے دین کی ابتداء بتایا جاتا رہا ہے اور کم مورخوں نے ان حالات کا تجزیہ کیا ہے جنھوں نے اس نئی تحریک کو جنم دیا۔ چنانچہ اب تک سیاسی ضرورتوں کی نشاندہی کی جا چکی ہے جن کی وجہ سے یہ نیا فکر ضروری ہوا۔ لیکن اس ضرورت کے باوجود یہ فکر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اور صحیح معنوں میں قومی یک جہتی اور فکری یگانگت کی کوئی ٹھوس بنیاد کیوں نہ رکھی جا سکی؟ اس لیے کہ ہندوستان کے اس وسیع برصغیر میں فکری یگانگت کے لیے جو طاقتیں ضروری تھیں وہ سرے سے پیدا ہی نہ ہوئی تھیں یہی وجہ ہے کہ اکبر کو اپنی بادشاہت اور دبدبے کے باوجود اپنی تحریک کی حمایت میں ڈیڑھ درجن

سے زیادہ افراد میسر نہ آسکے۔ اس لیے کوئی فکر جب تک معاشرے کے ایک طبقہ کی نمائندگی اس کی خواہشوں کا اظہار، اس کی مادی ضرورتوں کا مطالبہ اور اس طبقہ کی آسوں پیاسوں کے لیے جد وجہد نہیں کرتا۔ اس وقت تک وہ فکر سماج کے کسی حصہ کی روح کا حصہ نہیں بنتا چنانچہ یہی حال اکبر کی اس تحریک کا ہوا۔

اس کی وجہ ڈھونڈنے کے لیے ہمیں اس برصغیر کے اقتصادی ڈھانچہ کو سمجھ لینا چاہیے اس برصغیر کے سماجی نظام کے متعلق شروع میں کہا جا چکا ہے کہ یہاں کے دیہاتی نظام میں زمین کی مشترکہ ملکیت نے وہ طبقہ پیدا ہی نہ ہونے دیا جو یورپ کے زرعی نظام میں زمیندار یا جاگیر دار کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور پھر تاجر طبقے کو جنم دیتا اس طرح سے سماج کی نشو ونما اور ترقی اپنے معمول کے مطابق ہوتی رہتی۔ اب جب افغان یہاں آئے تو وہ اپنے ساتھ نئی زندگی اور حرارت ضرور لائے انھوں نے اپنی اس حرارت سے ہندوستان کی زندگی کو تپایا ضرور لیکن یہاں کے آرٹ، فن تعمیر، موسیقی، مصوری اور طرز معاشرت سبھی کچھ کو متاثر بھی کیا لیکن ان تمام فنون میں تبدیلیوں کے باوجود ہندوستانی سماج کی بنیادی ہیئت اور ڈھانچہ میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی اس ضمن میں حقیقتاً افغانوں کے اپنے پاس بھی کوئی ترقی یافتہ نظام یا ڈھانچہ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ خود بھی جس نظام سے متعلق تھے وہ فرسودہ اور ایک جاگیرداری قبائلی نظام تھا۔ اور ہندوستان کا زرعی نظام اس سے بہتر تھا۔ اس کے بعد جب مغل آئے تو انھوں نے بھی زرعی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی۔ سوائے اس کے کہ مالیہ کی وصولی کے متعلق قواعد وضوابط ترتیب دیے لیکن دیہی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی رونما نہ ہوئی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس بنیادی تبدیلی کی عدم موجودگی میں یہ نیا فکر بھی پروان نہ چڑھ سکا اور رجعت پسندی اور جدت پسندی کی ٹکر میں رجعت پسندی کو جیت حاصل ہوئی۔

اگر اکبر زرعی ڈھانچہ میں تبدیلی کرنے کا باعث بنتا تو وہ ہندوستان میں یقینی طور پر ایسی راہیں کھول دیتا جو آگے چل کر ایک نئے نظام کا باعث بنتیں لیکن اس کی تمام تر توجہ اپنی حکومت کے اُوپری استحکام پر لگی رہی اور اس استحکام کے لیے اس نے فکر کو ضرور اپنایا لیکن اس فکر کی مقبولیت کے

لیے جو طبقہ ہونا چاہیے تھا اس کو وجود میں نہ لا سکا۔

اکبر نے اپنی سلطنت کے استحکام کے لیے یہ جو تمام ادیان کے ملغوبے سے ایک فکر اور ایک ضابطۂ حیات دینے کی کوشش کی اس نے علماء کی کھیپ کی کھیپ کو ضرور چونکا دیا اور ان کو اپنی سیادت جب خطرے میں محسوس ہوئی تو انھوں نے مزاحمت بھی شروع کی اس سے عام تاثر یہ ہوگیا ہے کہ شاید اکبر ہی پہلا بادشاہ تھا جس نے سلطنت کے لیے ہندوؤں کے دل جیتنے کی کوشش کی اور اس کے لیے اس نے وحدت الوجود کا فلسفہ اپنایا۔ اس ضمن میں ہم بابر کی وصیت بھی بھول گئے کہ کس طرح ہر ذی ہوش حکمران کو اس برصغیر کے ان حقائق کا احساس تھا۔ اور وہ ان حقیقتوں کو تسلیم کر کے ان سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ حقائق خاندان غلاماں کو بھی پیش آئے، خلجیوں، تغلقوں اور پھر افغانوں کو بھی ان سے دوچار ہونا پڑا۔ چنانچہ ہر دور میں اور ہر عہد میں یہ سوال اٹھتا رہا کہ سلطنتِ دہلی کی نوعیت کیا ہونی چاہیے؟ آیا یہ سلطنت اور حکومت خالصتہً مذہبی اور دینی ہونی چاہیے جہاں شریعت کا قانون نافذ ہو اور شریعت کی وضاحت کرنے کی ذمہ داری اور اجارہ داری علماء کو حاصل ہو اور یہ علماء جو بھی فیصلہ کریں حاکم وقت اس کا پابند ہو یا پھر بادشاہ خود فیصلہ کرے کہ کون سا قانون اس کی ضرورتوں پر پورا اترتا ہے۔ یعنی مذہب اور علماء کی بالادستی سے اجتناب کیا جائے اور ایک طرح کی سیکولر حکومت قائم ہو۔ جس میں ہر شخص کو اس کے دین اور عقیدے کے تحفظ کی ضمانت ہو یا کوئی اور بین بین راستہ تلاش کیا جائے جس سے علماء بھی مطمئن ہو جائیں اور حکومت کا کام بھی غیر مسلموں کی دل آزاری کیے بغیر چلتا رہے۔

برصغیر میں جب یہ سوال اٹھ رہے تھے تو اس وقت کے حالات نے دہلی کو علماء کا ایک بہت اہم مرکز بنا دیا تھا۔ کیونکہ منگولوں کی یلغاروں نے وسطی ایشیا کے علاقوں کو تباہ و برباد کر دیا تھا اور وہاں کی زندگی میں جو بے سکونی پیدا ہوگئی تھی اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے علماء، فوجی اور صناع و کاریگر سبھی بھاگم بھاگ دہلی آرہے تھے جہاں ان کو گوشۂ عافیت نظر آتا تھا۔ چنانچہ یہ اس دور کے مہاجر تھے اور انھوں نے دربار کے مولویوں کے ساتھ مل کر مقامی آبادی

کے خلاف زبردست مورچے باندھنے اور ہندو دشمنی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ ان نو واردوں کو زیادہ سازگار ماحول میسر آسکے چنانچہ التمش کے زمانے یعنی تیرہویں صدی کی دوسری تیسری دہائیوں میں کفر و اسلام کی نزاع نے بہت ہی سنگین صورت اختیار کر لی اور ان مولویوں اور ملاؤں کا اصرار تھا کہ ہندو نہ اہلِ کتاب ہیں نہ اہلِ زمہ، شرع میں تو ان کے لیے ایک ہی حکم ہے کہ وہ اسلام قبول کریں ورنہ قتل کر دیے جائیں۔ چنانچہ ان مولویوں کا ایک باقاعدہ وفد سلطان التمش کے حضور یہ مطالبہ لے کر پیش ہوا کہ حکم جاری کیا جائے۔ "اماً القتل و اماً الاسلام" التمش جو ان مولویوں کے طبائع کو جانتا تھا وہ خود خاموش رہا اور اس نے اپنے وزیر نظام الملک جنیدی کو آگے کر دیا، جنیدی سلطان کے مزاج کا واقف تھا چنانچہ اس نے اس وفد کو سلطنت کی ضرورتوں، امورِ سلطنت کے نشیب و فراز اور رموز مملکت سے آگاہ کیا اور کہا کہ اسلام کسی کو زبردستی تبدیلی مذہب کے لیے مجبور نہیں کرتا اور اگر بفرضِ محال ہندوؤں کا قتل بروئے اسلام جائز بھی ہو تو پھر اتنی تلواریں کہاں سے آئیں گی کہ کروڑوں ہندوؤں کو قتل کیا جاسکے اور پھر بچوں اور عورتوں کا کیا بنے گا اور اگر جب کہ سلطنت کو قائم ہوئے ابھی ربع صدی بھی نہیں گزری۔ ہندو اگر آمادہ بغاوت ہو گئے تو وسیع و عریض ملک ہند میں ان کی بغاوت کو کون فرو کر سکے گا۔ اس پہ مولوی خاموش ہو گئے۔

ان مسلمان سلطانوں کی تاریخ ایسے واقعات سے اٹی پڑی ہے کہ وہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی مولوی کی بالادستی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور تمام مسلمان مورخوں نے خواہ وہ البیرونی ہو یا ضیاء الدین برنی ہو یا پھر الفضل ہو سبھی نے بیک آواز ان مولویوں کی ریشہ دوانیوں، ان کی حرص اور لالچ کے قصے مزے لے لے کر بیان کیے ہیں اور بلبن کا یہ قول تو بہت مشہور ہے جس کو شیخ اکرام نے "آبِ کوثر" میں درج کیا ہے کہ

" امورِ ملکی سیاسی مصلحتوں کے پابند ہیں نہ کہ شرع و فقہا کے "

چنانچہ اکبر سے بہت پہلے ان مسلمان شہنشاہوں کو بھی یہ مسائل در پیش آتے رہے اور ان میں سے کسی ایک نے تو نئے مذہب اور نئے فکر کے بارے میں بھی سوچا۔ چنانچہ سید

سبط حسن اپنی کتاب "پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء" میں لکھتے ہیں۔

ریاست درحقیقت ہر دور میں ایک طبقاتی ادارہ رہی ہے اس کا مقصد برسرِ اقتدار طبقوں کے مفاد کی حفاظت کرنا ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں ریاست کا کام بادشاہ اور اس کے امراء کے طبقے کا بچاؤ تھا۔ یہ درست ہے کہ ریاست کے اربابِ اختیار مذہب کو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر استعمال کرتے تھے اور مولویوں، پنڈتوں اور پادریوں کی خدمات سے فائدہ اٹھانے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے لیکن وہ مذہب کے نمائندوں کو اپنا آقا تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔"

تاریخ فیروز شاہی میں بلبن کے بارے میں درج ہے کہ جب اس کے دونوں بیٹے بغرا خاں اور احمد خاں لکھنا پڑھنا سیکھ گئے تو شاہی ملازموں نے بادشاہ سے عرض کی کہ شہزادوں کو فقہ اور صرف و نحو میں سے کس کی پہلے تعلیم دی جائے بلبن نے جواب دیا کہ "مولویوں کو انعام دے کر رخصت کر دیا جائے اور شہزادوں کو آداب السلاطین اور ماثر السلاطین جیسی کتابیں جو بغداد سے التمش کے بیٹوں کے لیے منگوائی گئی تھیں تاریخ و سیاست کے فاضلوں سے پڑھوائی جائیں گدا طبع مولوی جو کچھ پڑھاتے ہیں وہ میرے بیٹوں کے لیے امورِ مملکت میں مفید نہ ہوگا۔" صرف یہی نہیں بلکہ ریاست کو مذہب سے دور رکھنے میں علاؤالدین خلجی ۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۶ء بلبن پر بھی سبقت لے گیا۔ وہ مذہبی عالموں اور قاضیوں کے بارے میں کہا کرتا تھا کہ ان میں رموزِ مملکت کی سمجھ بالکل نہیں ہوتی۔ سلطنت کے لیے قواعد و ضوابط بنانا بادشاہ کا کام ہے۔ شرع اور اہلِ شرع کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس عہد کے مولویوں کی علمی سطح اور ذہنیت کے بارے میں تاریخ فیروز شاہی میں ہی ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک بار علاؤالدین خلجی نے اپنے قاضی مغیث الدین بیانوی سے پوچھا کہ ہندوؤں کے ساتھ ہمارا سلوک کیسا ہونا چاہیے؟ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ "اگر سرکاری ملازم کسی ہندو سے چاندی طلب کرے تو اس کا فرض ہے کہ پوری عاجزی اور تعظیم کے ساتھ سونا پیش کرے اور اگر سرکاری ملازم اس کے منہ میں تھوکے تو بغیر کسی کراہت کے اپنا منہ کھول دے۔

بادشاہ کو چاہیے کہ ہندوؤں کے مال و اسباب پر قبضہ کرلے اور ان کو غلام بنالے"۔

بقول سید سبط حسن نفرت اور انسان دشمنی کے ان نمونوں کا موازنہ صوفیاء کے حسن و اخلاق و محبت سے کرو تو پتہ چلتا ہے کہ صوفیاء نے اسلام کو مقبول عام بنانے اور مولویوں نے اسلام کو مطعون کرنے میں کیسی کیسی گراں بہا خدمات انجام دی ہیں۔ شاید مولویوں کی حرکتوں ہی سے بیزار ہو کر علاؤ الدین خلجی نے ایک نیا مذہب شروع کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

علاؤالدین تو خیر قریب قریب ان پڑھ تھا لیکن محمد تغلق ۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء پر کوئی شخص جہالت کا الزام نہیں لگا سکتا مولویوں کو تو اس سے شکایت ہی یہ تھی کہ معقولات کو منقولات پر ترجیح دیتا ہے اور اپنا بیشتر وقت فلسفہ و حکمت کی کتابوں میں صرف کرتا ہے اس نے مولویوں اور صوفیوں سے نجات پانے کی یہ ترکیب نکالی کہ ان کو جبراً کشمیر، دکن، اور بنگال بھجوا دیا کہ جایئے اور دور افتادہ مقامات پر اسلام کی تبلیغ کیجیے۔ علاؤالدین خلجی کی طرح محمد تغلق بھی ایک نیا مذہب قائم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے دوسرے منصوبوں کی طرح یہ منصوبہ بھی کامیاب نہ ہوا۔ مختصر یہ کہ سلاطین دہلی کی برابر یہی کوشش رہی کہ مولویوں کو ریاست کے معاملات میں مداخلت سے باز رکھا جاتے۔ اس لیے کہ ریاست کا تقاضا تھا کہ ہندوؤں کی صلاحیتوں سے بھی فائدہ اٹھایا جائے۔ اور ان کی دل آزاری نہ کی جاتے ہم یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتے کہ سلطنت دہلی کے زمانے میں ہندوؤں کو مجموعی طور پر مسلمانوں کے برابر حقوق و مراعات حاصل تھیں۔ لیکن تجارت، بقالی، روپیہ کا لین دین اور محکمہ مال کا حساب کتاب زیادہ تر ہندو ہی کرتے تھے بلکہ بعض لائق اور معتبر ہندوؤں کو تو صوبیداری، وزارت اور فوج کی سالاری بھی سونپ دی جاتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ ریاست کے مفادات اور ضرورتوں کا بھی یہی تقاضا تھا کہ ہندوؤں کا تعاون حاصل کیا جائے دگرنہ یہ سلاطین، یہ بادشاہ اگر مولویوں کی دکھائی ہوئی راہوں پر چلتے تو ان کی سلطنت جو ۳۳۲ برس قائم رہی وہ شاید تین سو دن بھی نہ چل پاتی۔ کیونکہ جابر سے جابر شہنشاہ بھی اپنی رعایا کے منہ میں تھوک کے زیادہ دن حکومت نہیں کر سکتا۔ صرف یہی نہیں بلکہ خود حکومت کے کاروبار کے لیے ہندوؤں کا تعاون ازبس ضروری تھا۔ وگرنہ کاروبار حکومت کیسے چل سکتا تھا۔

ہمارے ہاں ایک اور مشکل ہے کہ ہمارے بہت سے اہلِ علم و دانش جہانبانی اور حکمرانی کو ایک باقاعدہ سائنس کے طور پر سمجھنے اور تجزیہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ آج جب کہ نظم و نسق ایک الگ مضمون بن چکا ہو جب افسر شاہی کی تربیت کے لیے الگ اکاڈمیاں قائم ہیں تو اس دور میں بھی جہانبانی کے اپنے انداز تھے چنانچہ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ پرانے بادشاہوں نے جب ہندوؤں کو ملازم رکھا یا ان سے شادیاں رچائیں یا انکو سرکار دربار میں عہدے دیئے تو یہ صرف رواداری نہ تھی بلکہ ضرورتیں تھیں سلطنتوں کے تقاضے تھے۔ حکمرانی کا دباؤ تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کبھی قائد اعظم کو اپنی حکومت کے لیے قادیانی سر ظفر اللہ کو وزیر خارجہ بنانا ضرورت ہوتا ہے اور کبھی اسی ملک کے حاکم قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ سب حکمرانی کی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ سلاطین دہلی نے جب مسلسل مولویوں کے دباؤ کو رد کیا اور ہندوؤں کو اہم عہدے دیے تو یہ ان کی مجبوری، ضرورت اور سلطنت کا تقاضا تھا چنانچہ اس صورت حال کے بارے میں "تمدن ہند پر اسلامی اثرات" کے مصنف ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں۔

مسلمانوں کی فتح نے ہندوستانی تمدن کے ارتقاء پر زبردست اثر ڈالا۔ بظاہر تو اس نے ہر چیز کو تہ وبالا کر دیا۔ ہندو مذہب کو خوفناک صدمہ پہنچا، پجاریوں اور پنڈتوں کی سرپرستی کا دور دورہ نہ رہا، ہندو یادگاریں تباہ و برباد ہو گئیں، ادب کو شاہی حوصلہ افزائی نہ ملی اور وہ بھی کمزور ہو گیا! الغرض بظاہر تو سیاسی فتح کے ساتھ تمدنی موت نظر آتی ہے مگر بنیادی طور پر اس فتح کا مختلف اثر ہوا۔ مسلم بادشاہوں نے اہم راجواڑوں سے ہندو راجگان کو نکال دیا۔ دہلی، قنوج، گوالیار، انہلواڑہ، دیوگیر اور گور مسلمانوں کے قبضہ تصرف میں آگئے۔ مگر دور دست علاقے نہیں، اس زمانے میں بھی یہ نئے مسلم حکمران اس قریب ترین علاقے کے مالک تھے جو ان کے فوجی سرداروں کی خیمہ گاہ کی زد میں آتے ہوں۔ لیکن اس سے بڑے چھوٹے زمیندار اپنے معاونین کے ساتھ مٹی کے قلعوں میں محفوظ رہ کر حکمران طاقت کا مقابلہ کر رہے تھے ان کو ختم کرنا ایک بے مثال بہادری کا کام تھا قطب ایبک کے زمانے سے لے کر اکبر کے وسیع عہد تک مختلف خاندانوں کے ہر طاقتور حکمران کو جو تخت دہلی پر متمکن ہوتا تھا۔ ان کو قابو میں رکھنے، یا مال گزاری وصول کرنے کے لیے سال کے سال فوج کشی کرنی پڑتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہی اقتدار کو مقامی داخلی خود مختاری کے ایک حیرت انگیز وسیع نظام کو قابو میں رکھنا پڑا جو برابر بکھر کر مزاج

کی شکل اختیار کرنے پر تلا رہتا جب تک کوئی بلبن، کوئی علاؤالدین خلجی یا کوئی محمد تغلق اس کی روک تھام نہ کرتا رہتا۔

مسلم اقتدار انہی دو معاملات سے محدود نہ تھا۔ بلکہ اسے اپنے اوپر کچھ اور پابندیاں بھی عاید کرنا پڑیں ہندوؤں کی ملازمت مسلمانوں کی حکومت کی ایک ضرورت تھی۔ محمود غزنوی کے پاس بہت سے ہندو فوجی دستے تھے جو اس کی طرف سے وسطِ ایشیا میں لڑے اور یہ محمود کا کمانڈر تلک ہی تھا جس نے محمود کے مسلمان سپہ سالار نیا لتگین کی بغاوت کو فرو کیا تھا۔ جب قطب الدین ایبک نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تو اسے ہندو ملازمین بحال رکھنے پڑے جو انتظام دیوانی سے مانوس تھے اور ان کے بغیر ساری حکومت اور مالیہ کے حصول میں بڑی گڑبڑ پڑ جاتی۔ مسلمان بیرون ہند سے اپنے ہمراہ کاریگر اور دبیر نہیں لاتے اور ان کی عمارات بھی ان ہندوؤں نے تعمیر کیں جنھوں نے اپنے قدیم طریقوں کو نئے حالات سے ہم آہنگ کر لیا تھا۔ مسلمانوں کے سکے بھی ہندو سناروں نے گھڑے اور ان کے حسابات بھی ہندو افسران نے رکھے۔ ہندوؤں کے قوانین کے بارے میں اور ان کے نفاذ کے متعلق برہمن قانون دان بادشاہوں کو مشورہ دیتے اور برہمن ہیئت دان مسلمانوں کی عام تقاریب کی انجام دہی میں مدد دیا کرتے تھے چنانچہ جو مسلمان ہندوستان میں آتے انھوں نے اس کو اپنا وطن بنا لیا ان کے چاروں طرف ہندو تھے اس لیے ان کے لیے ان ہندوؤں میں دائمی خصومت اور دشمنی رکھنا ناممکن تھا چنانچہ باہمی تعلقات نے ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد دی۔ بہت سے نومسلم اپنے غیر مسلم خویش و اقارب سے بہت کم مختلف تھے۔ اس طرح فتح کے پہلے جھٹکے کے بعد ہندو اور مسلمان ایک درمیانی راہ ڈھونڈنے پر آمادہ ہوئے جس کی بنا پر وہ بطور ہمسایہ کے زندگی گزار سکیں۔ ایک نئی زندگی کی جست جو ایک نئے تمدن کی ترقی کی طرف لے گئی جو نہ تو بالکل ہندو تمدن تھا۔ اور نہ ہی خالص اسلامی تھا۔"

تہذیبیں جب ایک دوسرے پر اثر انداز ہو رہی ہوں۔ جب سیاسی ضرورتیں ایک دوسرے کو قریب کر رہی ہوں تو پھر ادیان کا قرب بھی لازمی ہو جاتا ہے اور یہی قرب صوفیاء کو محبت کا پیغام دینے پر اکساتا ہے۔ ایسے ہی ادوار میں فلسفہ وحدۃ الوجود مقبولیت کی سند حاصل کرتا ہے

اور ایسے ہی ادوار میں بھگتی اور گورو نانک کی تحریکیں پھلتی اور پھولتی ہیں اور ایسے ہی زمانے میں کبیر کے دوہے زبان زد عام ہوتے ہیں۔ غرضیکہ یہ وہ دور ہے جب اکبر سے بہت پہلے اس پورے برصغیر میں ایسی تحریکیں ابھر رہی تھیں جو ایکتا اور ہندو مسلمانوں کے قرب یا ان ادیان کے ملغوبے پر منتج ہوئی تھیں یہ موضوع بذات خود اتنا وسیع اور تفصیل طلب ہے کہ اس موضوع پر صرف ان تحریکوں کے رہنماؤں کی تعلیمات اور اقوال پیش کرنے پر اکتفا کرنے پر مجبور ہوں۔ وگرنہ اس موضوع پر ڈاکٹر تارا چند نے اپنی کتاب "تمدن ہند اسلامی اثرات" پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس موضوع پر ابھی تک اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے دلچسپ بات یہ ہے برصغیر میں جن علاقوں اور خطوں میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی وہاں میل جول اور ادیان کے حلقوں کی تحریکیں بعد میں مقبول ہوئیں اور ان تحریکوں کی ابتدا اور اجراء سے جنوبی ہند کے ایسے خطوں میں ہوئی جہاں پر مسلمان بحیثیت حاکم نہیں پہنچے تھے بلکہ وہاں وہ تاجر اور سیاح کی حیثیت میں داخل ہوئے تھے۔

بھگتی تحریک

سب سے اہم تحریک جو گورو نانک کی بھی پیشرو ہے وہ بھگتی تحریک ہی ہے اسی تحریک نے بعد میں شمالی ہند کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس تحریک کی ابتداء بارہویں صدی میں جنوبی ہند میں اس کے بانی رامانج اور ان کے رفقاء مادھو، انند تیرتھ، دشنو سوامی اور باسو تھے۔ اس تحریک کا زمانہ گیارہویں اور بارہویں صدی ہے۔ اس تحریک کے جنوبی ہند میں جنم لینے اور نشو و نما کی بنیادی وجہ عربوں کی تہذیبی چھاپ ہے جو ان خطوں پر بہت پرانی ہے۔ چنانچہ سلیمان ندوی اپنی کتاب "عرب ہند تعلقات" میں لکھتے ہیں کہ عرب تاجر ہزاروں برس پہلے سے ہندوستان کے ساحل تک آتے تھے اور یہاں کے بیوپار، پیداوار کو مصر اور شام کے ذریعے سے یورپ تک پہنچاتے تھے اور وہاں کے سامان کو ہندوستان، جزائر ہند، چین اور جاپان تک لے جاتے تھے چنانچہ اسلام کے بعد بھی آتے رہے اب وہ اپنے جدید مذہب کی تبلیغ کے شوق سے سرشار تھے۔ ان کے طور طریقوں

اور اخلاق و اطوار میں بھی ایک گونہ نکھار آگیا تھا وہ عبادت، دیانت اور امانت کے پیکر بھی ہونگے ان کی تاجرانہ دیانت نے یہاں کے لوگوں اور حاکموں کو بہت متاثر کیا۔ چنانچہ جنوبی ہند کے اکثر مقامات پر جن میں گجرات، مالا بار، کونکن، اور کارومنڈل کے ساحلی علاقے شامل تھے اپنی بستیاں آباد کرلیں یہی نہیں بلکہ آٹھویں صدی میں حجاج بن یوسف کے مظالم سے تنگ آکر بنی ہاشم اور ان کے معتقدین کی بڑی تعداد نے بھی جنوبی ہند میں ہی پناہ حاصل کی اور یہاں کے راجوں اور حاکموں نے ان کی خاصی پذیرائی بھی کی۔ اسی زمانے میں یعنی نویں اور دسویں صدی میں اسماعیلی مبلغ اور داعی ان عرب تاجروں کے ہمراہ آنا شروع ہوئے۔ چنانچہ آج بھی یہ علاقے اسماعیلیوں کے اہم مراکز ہیں۔ ان اسماعیلی مبلغوں نے اپنی تعلیم کو عام کرنے اور تبلیغ کے لیے فضا پیدا کرنے کے لیے اپنے نام بھی ہندوؤں سے ملتے جلتے رکھنے شروع کر دیے۔ چنانچہ ان کے ایک عالم اور مبلغ جن کا نام شیخ زید بن ابو یحییٰ تھا کو نو دست گرو کے نام سے یاد کیا جاتا یہ مبلغ ہندوؤں ہی کی مذہبی اصطلاحوں میں اپنے دین کی تلقین و تبلیغ کرتے تھے۔ چنانچہ اسماعیلیوں کی ایک مقدس کتاب کا نام دس اوتار ہے اس میں اللہ کو برہما، حضرت آدم کو شیو اور حضرت علی کو وشنو سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ بقول شیخ اکرام شریعت سے انحراف کی یہ جرأت طریقت پسند صوفیاء ہی کر سکتے تھے۔ چنانچہ بھگتی تحریک کے ست پنتھی فرقے کے بانی سید امام دین اسماعیلی تھے۔

یہ تھے حالات جنھوں نے ہندو عالموں کو متاثر کیا اور جنوبی ہند میں بھگتی تحریک کو جنم دیا۔ شمالی ہند میں بھگتی تحریک کا بیج تو سوامی رامانند نے بویا اور ان کے چیلوں اور پیروکاروں، جن میں سب سے نامور کبیر نکلا، نے پروان چڑھایا لیکن اس کے لیے فضا تیرھویں اور چودھویں کے صوفیائ نے تیار کی تھی اور اسی فضا نے اس بھگتی تحریک کو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں بہت حد تک مقبول بنایا لیکن اس تحریک کا سب سے زیادہ اثر ہندوؤں کی نیچ ذاتوں پر ہوا۔ چنانچہ رامانند کے تمام چیلے انھی نیچ ذاتوں سے متعلق تھے۔ چنانچہ کبیر جولاہا تھا، دھنا جاٹ تھا، سائیں نائی تھا اور رائے داس چمار تھا۔

شمالی ہند میں بھگتی تحریک کے بانی رامانند تیرھویں صدی کے چل چلاؤ کے دور میں الہ آباد میں

پیدا ہوئے، اس وقت خاندان غلاماں دلی کے تخت پر قابض ہوا تھا۔ رامانند کی ابتدائی تعلیم بنارس میں ہوئی اور وہ یہیں رہائش پذیر ہو گئے۔ رامانند کے گرو راگھونند شنکر کے چیلے تھے جو ویدول کے فلسفے میں یقین رکھتے تھے لیکن رامانند نے اس فلسفے کو رد کر دیا۔ انھوں نے شنکر کی یہ بات بھی تسلیم نہ کی کہ شودروں اور عورتوں کو اپنے حلقے میں شامل نہ کیا جائے۔ چنانچہ اس نے اس امر پر اصرار کیا کہ۔

"ذات پات اور چھوت چھات برہمنوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ ایشور پریم ہے اور پریم ایشور، پریم بھگتی سے شودر ہو یا برہمن، مرد ہو یا عورت کسی کو روکا نہیں جا سکتا"

ان کی ان تعلیمات نے اُونچی ذات کے ہندوؤں کو برانگیختہ کر دیا۔ لیکن نیچے درجے کے ہندو ان کی طرف کھنچنے لگے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تعلیمات کی بنیاد صوفیوں کی مانند "ہمہ اوست" پر رکھی۔ چنانچہ ان کا ایک اشلوک یوُں ہے۔

میں کہاں جاؤں میں گھر ہی میں خوش ہوں۔
ایک دن میرا جی چاہا کہ بھگوان کے درشن کو جاؤں۔
پس میں نے چندن گھسا اور ایلوا کا رس نکالا
اور پوجا کرنے جانے ہی والا تھا کہ
میرے گرو نے ایشور کے درشن میرے من میں کرا دیے لیکن۔
اے بھگوان تُو تو ہر شے میں موجُود ہے۔
اگر بھگوان یہاں نہ ہو تو وہاں جاؤں۔
رامانند کا بھگوان سب جگہ پایا جاتا ہے۔
گرو کے شبد نے مجھے لاکھوں پاپ سے بچا لیا

بھگتی تحریک شروع تو رامانند نے کی لیکن بھگتی تحریک کو اصل شہرت رامانند کے چیلے کبیر کے نام سے ہی حاصل ہوئی اور آج بھی یہ تحریک کبیر کے حوالے سے ہی زیادہ جانی جاتی ہے اور سچ یہ ہے

کہ کبیر کے دوہوں نے آج تک ایک عالم کو متاثر کیا ہے اور اسی تاثر ہی کا نتیجہ ہے کہ کبیر کے ارد گرد ایک افسانوی اور رومانوی حصار کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اس کی پیدائش اور موت دونوں داستان سرائی کا موضوع بنے رہے ہیں بہر حال کہا جاتا ہے کہ کبیر کسی بیوہ برہمنی کی ناجائز اولاد تھا جسے وہ بدنامی کے ڈر سے تالاب کے کنارے ڈال گئی تھی اور وہاں سے منیرو نامی ایک بے اولاد مسلمان جولاہا اُسے اٹھا لایا اور اس نے اور اس کی بیوی نعیمہ نے اسے پال پوس کر جوان کیا۔ اس کی تعلیم کے بارے کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کے گیتوں، دوہوں اور بانیوں میں اسلامی اصطلاحیں بہت عام نظر آتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کچھ نہ کچھ کسبِ فیض مولویوں اور صوفیوں سے کیا ہوگا۔ کبیر نے اپنے مسلمان باپ کا پیشہ اختیار کیا اور تمام عمر وہ اسی پیشے سے متعلق رہا۔ لیکن جوان ہو کر اس نے رامانند کی سنگت اختیار کر لی اور اس نے کبیر کو ہندو دھرم، ہندو فلسفے اور بھگتی کی تعلیم دی۔ چنانچہ کبیر نے اپنے اس دور کے متعلق کہا تھا۔ کہ "میں کاشی میں ظاہر ہوا اور رامانند نے مجھے سوتے سے جگایا۔" لیکن وہ زیادہ دن رامانند کی صحبت میں نہ رہ سکا۔ اور سچائی کی تلاش میں اس نے گھر کو خیرباد کہہ دیا اور جہاں بھی اسے کسی صوفی، سنت کی بھنک پڑتی وہ وہیں پہنچ جاتا۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا اور مختلف صوفیوں سے اکتسابِ علم کیا اور بالآخر وطن واپس آیا اور اس نے ایکتا اور بھگتی کی تعلیم شروع کی تو پنڈت اور مولوی دونوں ہی اس کی جان کے بیری ہو گئے اور جب ہندو پنڈت اُسے ٹوکتے تو وہ جواب دیتا۔

میرے گھر میں تو سُوت کا ڈھیر لگا ہے اور میں برابر کپڑا بنتا رہتا ہوں
البتہ تمہارے گلے میں تو ایک ہی سوت (جنیؤ) پڑا ہے۔
تم تو فقط وید اور گیتا پڑھنا جانتے ہو۔
لیکن بھگوان تو میرے من میں بسا ہے۔
وہ تو میری زبان پر ہے۔ میری آنکھوں میں ہے۔
تو برہمن ہے اور میں کاشی کا جولاہا
پر میری بات کان کھول کر سن لے

تو بادشاہوں اور امیروں کی ڈیوڑھی پر بھیک مانگتا ہے
اور میں اپنے بھگوان کا دھیان کرتا ہوں۔
پس بتا ہم دونوں میں کون بہتر ہے۔

یہ ہندو برہمن اور پنڈت کا جواب تھا۔ لیکن کبیر کو مولوی ملاؤں کی تضحیک بھی برداشت کرنی پڑی تھی اور جب وہ اس کو کافر کہتے کیونکہ اس کا ختنہ نہیں ہوا تھا۔ تو وہ یوں گویا ہوتا ہے۔

ہندو مسلمان کہاں سے آئے ؟
کس نے اِن کو الگ راستے پر لگایا ؟
خوب سوچ بچار کر کے بتاؤ کہ
کون جنّت میں جائے گا اور کون جہنم میں۔
اے قاضی تیرا علم کس کام کا۔
تو نے جس کو پڑھایا وہ جاہل رہا۔
کسی ایک کو بھی معرفت نصیب نہیں ہوئی۔
تم ختنہ عورت کی ہوس میں کرتے ہو۔
مگر بھائی میرا عقیدہ ان چیزوں پر نہیں ہے۔
اگر خدا کو منظور ہوتا تو ہمیں مختون پیدا کرتا۔
اگر مرد ختنے سے ہی مسلمان ہوتا ہے
تو پھر عورت مسلمان کیسے ہو ؟
کیا تم اپنی بیویوں کو ہندو کہہ کر دھتکار دیتے ہو ؟
اے بے وقوف ! ان کتابی باتوں سے باز آ۔
اور خدا کی عبادت کر اور
ظلم سے پرہیز کر
کبیر نے تو خدا کی رسی پکڑ لی ہے۔

کبیر نے اس برصغیر کی اس زمانے کی سماج پر جتنا اثر ڈالا اور اس کی مثال تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر تارا چند، کبیر کی تعلیمات اور اس کے اثر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ کبیر ایک دوسرے نظام کا عبقری ہے۔ اس نے اسرارِ حیات کا بغور مطالعہ کیا اور نورِ لم یزل کا جلوہ دیکھا۔ وہ ایک عالمِ ماوراء سے فرد اور سماج کے لیے ایک نیا پیغام لاتا ہے وہ ایک مستقبل کا خواب دیکھتا ہے جو تمام کدورتوں، ناراستیوں، بدصورتیوں، بے ہنگمیوں سے پاک ہے، وہ ایک ایسے مذہب کی تعلیم دیتا ہے جو ایسی بلیادپر مبنی ہے کہ صرف اسی پر قائم رہ سکتا ہے۔ یعنی ذاتی تجربہ، وہ بغیر کسی جھجک کے مسلّمہ عقیدے اور اقدار کے تمام لوازمات کو جھٹک کر دور کر دیتا ہے کیونکہ اس کی رُوح مذاہب کے باہمی مناقشات اور ظاہر دارانہ دینداری کی خالی خولی پرستش کے ذریعے وہ مناظر سے اکتا گئی ہے وہ کسی ریاکاری کو برداشت نہیں کرتا اور طلب حق میں حقیقت کا طالب ہے۔ کبیر گوشہ نشین تیاگی نہیں ہے جس نے ناامید ہو کر دنیا کو خیرباد کہہ دیا ہو، نہ وہ تخیل پرست ہے جسے ہر چیز میں خیر ہی خیر نظر آتی ہے وہ تو یہ چاہتا ہے کہ دنیا کی اخلاقی جدوجہد میں شمشیر بدست ہو کر صداقت کی فتح کے لیے ایک بھرپور وار کیا جائے وہ معقولیت پسندانہ اطوار کی تمام خلاف ورزیوں اور شرف انسانی کی تمام تذلیلوں پر سخت سے سخت تذلیل کرنے سے بھی نہیں ڈرتا۔ وہ ایک طاقت ور تنبیہہ کرنے والا ہے ایک نڈر راہ یاب ہے۔ ہندوستان کی ہندو مسلم جماعتوں کے اتحاد کا بڑا علمبردار ہے اور مذہب انسانیت کا پیغامبر ہے۔ جس نے یہ درس دیا ہے کہ خدا نے مجموعی طور پر تمام نسل انسانی میں اپنی جلوہ گری کی ہے۔ چنانچہ کبیر اپنے مسلک کو خود اپنے ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"نہ میں اپنی آنکھیں اور کان بند کرتا ہوں، نہ اپنے جسم کو ہلاک کرتا ہوں۔ میں آنکھیں کھول کر چپے چپے میں اس کے جمال کا مشاہدہ کرتا ہوں اور مسکراتا ہوں اس حالت میں جو کچھ میں کرتا ہوں وہ اس خدا کی عبادت ہو جاتی ہے اور جو کچھ میں حاصل کرتا ہوں وہ اس کی بندگی ہے۔"

کبیر بار بار کہتا ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک ہیں۔ ایک ہی خدا کی پرستش کرتے ہیں اور ایک ہی باپ کی اولاد ہیں ایک ہی خون سے پیدا ہوتے ہیں چنانچہ وہ کہتا ہے۔

"تمام مخلوق مرد و عورت تیری ہی تمثیل ہیں۔ کبیر اللہ اور رام کا بیٹا ہے اور وہی کبیر کا گرو اور پیر ہے۔"

"ہندوؤں اور ترکوں کا ایک ہی راستہ ہے، جو مرشد برحق نے بتایا ہے اے رشیو! سنو! کبیر کہتا ہے چاہے رام کہو چاہے خدا اس میں کوئی فرق نہیں۔"

"اہلِ شعور کا مذہب ایک ہی ہے خواہ وہ پنڈت ہوں یا شیوخ۔"

"ہندو خدا کو رام کہہ کر پکارتے ہیں اور مسلمان رحمان۔ پھر بھی دونوں آپس میں لڑتے ہیں اور ایک دوسرے کو ہلاک کرتے ہیں۔ مگر حقیقت سے کوئی باخبر نہیں۔"

کبیر کی ان تعلیمات اور تحریک کے بارے میں ڈاکٹر تاراچند تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کبیر نے اسلام اور ہندو مت کے امتزاج کی اولین کوشش کی جنوبی ہند کے ہندو گروؤں نے مسلم عناصر کو جذب کر لیا تھا۔ لیکن کبیر وہ پہلا شخص ہے جس نے ایک مرکزی مذہب، ایک بیچ کی راہ کا بے باکانہ آگے آکر اعلان کیا۔ اس کا نعرہ پورے ہندوستان میں گونج اٹھا اور سینکڑوں مقامات سے اس کی آواز بازگشت سنی گئی۔ کبیر کے بے شمار ہندو، مسلم ماننے والے تھے۔ آج اس کے فرقے کی تعداد لاکھوں تک ہے لیکن کبیر کے پیروان مذہب کی تعداد اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنا کہ کبیر کا وہ اثر جو پنجاب، گجرات اور بنگال تک پھیل گیا اور دورِ مغلیہ میں بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک عاقل بادشاہ نے اس کے مذہب کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتے ہوئے یہ کوشش کی کہ اس کو سرکاری مذہب بنا لیا جائے۔

شہنشاہ اکبر کا دینِ الٰہی ایک ایسے مطلق العنان بادشاہ کی ترنگ نہ تھا جو طاقت رکھتے ہوئے یہ نہ جانتا ہو کہ اس کو کس طرح استعمال کیا جائے بلکہ یہ تو ان طاقتوں کا لازمی نتیجہ تھا جو سینۂ ہند میں موجیں مار رہی تھیں اور کبیر جیسے انسان کی تعلمات میں اظہار کا راستہ ڈھونڈ رہی تھیں گو حالات اس کوشش میں آڑے آئے مگر تقدیر اب بھی اس منزل کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

باب ۱۱

دو مکاتیبِ فکر

اکبر نے جب اپنی سیاسی ضرورتوں کے پیش نظر اور کسی حد تک اس نے اعتقاداً ایکتا اور وحدت ادیان کے فلسفے کو قبول کیا اور اس کو اپنے دربار اور حکومت کی اہم پالیسی قرار دیا تو اس سے بہت پہلے کبیر، گورونانک رامانج، رامانند، تلسی داس اور دیگر صاحب فکر لوگ اس پورے برصغیر میں ایکتا کی تحریکوں کی آب یاری کر چکے تھے اور ان کو اس ضمن میں کامیابیاں بھی ہوئیں، مقبولیت بھی حاصل ہوئی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اکبر سے پہلے کے سلاطین خلجی ہوں یا تغلق کسی نہ کسی حد تک ایکتا کی تحریکوں کو اچھی نظروں سے دیکھتے رہے ہیں کیونکہ ان سلاطین کی حکومتیں بھی نظریاتی حکومتیں نہ تھیں۔ ہمارے تجزیوں میں جو اصل پیچ پڑتا ہے وہ یہی ہے کہ ہر بادشاہ کو جس کا نام مسلمانوں کا سا ہے کو نعوذ باللہ خلفائے راشدین کے زمانے میں لے آتے ہیں اور ان کی جہانبانی کی ضرورتوں اور تقاضوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ کیونکہ جہانبانی کی ضرورتوں اور تقاضوں سے تو خلفائے راشدین بھی اپنا دامن نہ چھڑا سکے تو یہ سلاطین کیسے ان زنجیروں سے اپنے کو آزاد کرا سکتے تھے اس لیے یہ تمام پرانے سلاطین بھی گو مذہبی گروہ کی حیثیت سے حاکم نہ تھے اور نہ ہی وہ شرعی احکام کے سختی سے پابند تھے لیکن اس کے باوجود اس وقت ہر مسلمان اپنے مذہب کی بناء پر اپنے کو ایک حد تک حکومت میں شریک سمجھتا اور بادشاہِ وقت بھی یہ تاثر دیتا اور اس تاثر کا اظہار ٹیکسوں کی معافی

صورت میں ہوتا اس کے برعکس ہندوؤں سے جزیہ لیا جاتا اور ان کو ذمی تصور کیا جاتا چنانچہ تمام انصاف پسندیوں کے باوجود غیر مسلموں میں حکومت کو اپنا سمجھنے کا تصور پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بادشاہ وقت کو خدشہ لگا رہتا کہ کہیں کوئی اس کا اپنا بھائی بندہی ان غیر مطمئن غیر مسلموں کو اکسا کر اس کے خلاف استعمال نہ کرے اس لیے ہر وقت قبضہ شمشیر پر ہاتھ رہتا۔ اب اکبر اس خدشے کو دور کرنے کے لیے ایک ایسی غیر مذہبی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا جس کے تفوق کی بنیاد مذہب نہ ہو جس وقت اکبر نے اس سمت قدم اٹھایا اور ایک نئے مذہب یا تحریک کی بنیاد رکھی تو ساتھ ہی جزیہ بھی معاف کر دیا اور علماء سے کھلم کھلا برگشتگی کا اظہار کیا اس طرح اس نے اپنے نئے منصوبوں کے دشمن منصوبوں پر عملدرآمد سے بھی پہلے پیدا کر لیے۔ مسلمانوں اور عالموں کے وہ گروہ جو دربار سے متعلق تھے انھوں نے اس نئے اقدام سے یہ سمجھا کہ یہ ان کی فوقیت پر زبردست حملہ ہے صرف یہی نہیں بلکہ بہت سے علماء اور اہل اللہ نے بھی دیانت داری سے اکبر کے اس اقدام کو اسلام اور اس کی تعلیمات کے منافی قرار دیا۔

ادھر اس نئے دین کو ہندوؤں نے بھی قبول نہ کیا اس لیے کہ دین کا قیام نہ تو بادشاہوں کیطرف سے کبھی ہوا ہے اور نہ درباروں میں کبھی مذہب پنپا ہے بلکہ درباروں نے تو مذاہب کو بدنام کیا ہے چنانچہ یہی وجہ ہوئی کہ اس دین الٰہی نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی بجائے اس کے خلاف غم و غصہ پیدا کر دیا اور یہ غم و غصہ آج بھی تاریخ میں موجود ہے اور تاریخ کے ماہرین کا ایک گروہ اب بھی اس سلسلے میں اپنے غیض و غضب کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ لیکن اب جیسے جیسے زمانہ گزرتا جا رہا ہے یہ غیض و غضب کم ہوتا جا رہا ہے اور ان تحریکوں کو سختی سے الفاظ اور محاوروں کے دائرے میں نہیں دیکھا جاتا ہے بلکہ سیاسی پس منظر اور حکمرانی کے تقاضوں کے پیش نظر جانچا جانے لگا ہے اور یہ اسی امر کا نتیجہ ہے کہ اب اکبر کے ان اقدامات کو سیاسی بنیادوں پر جانچا جانے لگا ہے۔ چنانچہ شیخ اکرام جو عام طور پر سیاسی اور سماجی پس منظر کے اظہار سے گریز کرتے ہیں اور مسلمانوں کی تحریکوں کے محدود اور تنگ دائرے میں رکھ کر ان کے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں وہ بھی کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک فیضی اور ابوالفضل آزاد خیال لیکن مخلص مسلمان تھے۔ ہندوستان کے جو حالات تھے ان

کے لحاظ سے ان کی اور اکبر کی یہ کوشش بھی بری نہ تھی کہ ملک کے غالب حصّہ آبادی یعنی غیر مسلموں کی دلجوئی اور بہبودی کا انتظام ہو۔ ہندوستان کے نظم و نسق اور آئین و قوانین کو بعینہٖ ان اصولوں پر چلانا جو ان ملکوں میں رائج تھے۔ جہاں ساری آبادی مسلمان تھی مصلحت اور انصاف کے خلاف تھا اور ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے نظری نہ سہی عملی طور پر مقامی صورت حالات کا خیال رکھا۔ لیکن فیضی۔ ابوالفضل اور شیخ مبارک کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ علم اجتہاد کے اتنے بڑے دعوؤں کے باوجود ایسا اسلوبِ کار مدون نہ کر سکے جو مقامی ضروریات کو بھی پورا کرے اور حکمران قوم کے لیے قابل قبول ہو

دو مکاتیب فکر

اکبر کی حکمرانی اور اس کی سیاست کو اس کے ہمنوا علماء نے جو فلسفہ مہیا کیا اس کی اساس وحدۃ الوجود کے فلسفہ پر رکھی گئی تھی اور یہی وہ بنیاد تھی جس پر یہاں کے اکثر و بیشتر صوفیائے کرام نے اپنے افکار کی بلند و بالا عمارتوں کو مزین کیا۔ اس فلسفے کی اہمیت یہ تھی کہ یہ ہندوستانی ذہن کو بھی قبول تھا کیونکہ ویدانیت کی تعلیم کی بنیاد بھی اسی فلسفہ پر تھی اور اس میں کسی ایک تعلیم اور ایک مسلک کی برتری ظاہر نہیں ہوتی۔ چنانچہ جب ہندو کو یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کی بنیاد اسی تعلیم پر ہی ہے جو تم اپنا چکے ہو تو وہ اسلام سے قرب محسوس کرتا اور اس کی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے وہ اپنے اندر کسک محسوس کرتا مسلمانوں کی تبلیغ اسلام میں اس فلسفہ نے بہت ہی اہم کردار ادا کیا ہے چنانچہ یہ بھی واقعہ ہے کہ صرف وہی سلسلے یہاں کامیاب رہے جو اس فلسفے کو تسلیم کرتے تھے۔

اس عقیدے اور فلسفے کی حمایت کرتے ہوئے مولانا عبیداللہ سندھی فرماتے ہیں کہ وحدۃ الوجود کے عقیدے کے یہ معنی ہیں کہ سارے مذاہب ایک ہی صداقت کی مختلف تعبیریں ہیں فرق صرف شکلوں کا ہے اصل حقیقت ایک ہی ہے لیکن اس کا پتہ کیسے چلایا جائے کہ اصل دین کیا ہے اور کون سی صداقت ہے جو سب مذاہب میں مشترک ہے۔ ابن عربی اور ان کے پیروؤں کے نزدیک اسلام ہی اس سچائی کا معیار ہے۔ یہی ایک کسوٹی ہے جس پر سب دین پرکھے جا سکتے ہیں اور تمام مذاہب میں اس کی حیثیت ایک میزان کی ہے وحدۃ الوجود کو اس طرح ماننے سے

نعوذ باللہ اسلام کی برتری کا انکار لازم نہیں آتا بلکہ اس میں اسلام کی حقانیت اجاگر ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ابن عربی جو مسلمانوں میں اس فکر کے بانی اور مبلغ ہیں۔ ان کی اپنی زندگی اتباع حدیث کا نمونہ تھی چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں کہ ہر حقیقت جو خلاف شریعت ہو وہ گمراہی ہے چنانچہ ہندوستانی صوفیاء کا سلسلہ چشتی ابن عربی کی وحدۃ الوجود سے بہت زیادہ متاثر ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس سلسلہ کو ہندوستان میں تبلیغ میں بھی خاص طور پر کامیابی ہوئی۔ اس کے سلوک کے طریقے ہندی طبائع سے سے زیادہ قریب ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے بارے میں مشہور مسلمان مورخ فرشتہ نے چند ایسے رسالوں کا نام گنایا ہے جو ان کے زیر مطالعہ رہتے تھے۔ اکبر اعظم اسی سلسلہ کا معتقد تھا۔ اور اکبر کے دین الٰہی میں بہت حد تک اسی عقیدہ وحدۃ الوجود کی جھلک نظر آتی ہے گو اکبر سے پہلے وحدت الوجود کے خیالات ہندوستان میں موجود تھے اور اس کی بناء پر اہلِ تصوف میں وحدت ادیان کا خیال بھی عام تھا۔ لیکن اکبر پہلا شخص ہے جس نے وحدت ادیان کو سلطنت کی سیاسی حکمت عملی کا اصول بنایا۔ اور ہندو اور مسلمان رعایا میں مذہب کی بناء پر جو عدم مساوات برتی جاتی ہے اس کو مٹانے کی کوشش کی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ وحدت الوجود کا عقیدہ اپنی جگہ بالکل صحیح ہے اور اس سے لازمی طور پر وحدت ادیان کا جو خیال پیدا ہوتا ہے وہ بھی ٹھیک ہے لیکن وحدت ادیان ان معنوں میں کہ چونکہ سب دین ایک ہی ہیں اس لیے کسی ایک دین کا ماننا اور اس کے قانون پر چلنا ضروری نہیں غلط ہے۔ اکبر کے دین الٰہی کے مفکروں سے یہ چوک ہوئی یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے ذہنوں میں تو یہ حقیقت موجود ہو لیکن عمل میں اس کا خیال نہ رکھا گیا ہو۔ وحدت ادیان کو اس طرح ماننا مزاج اور انارکزم ہے۔ شریعت، طریقت پر مقدم ہے یعنی ایک شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس جماعت میں رہے اس کے اجتماعی قانون کو تسلیم کرے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے جی میں جو آئے وہ اس کو اپنا قانون بنائے اور اس پر چلنے کی کوشش کرے اس سے زندگی میں کوئی نظم پیدا نہیں ہو سکتا اور جماعتی زندگی کا سرے سے شیرازہ ہی بکھر جاتا ہے اکبر کے عہد حکومت میں وحدت ادیان کی جو تعبیر کی گئی اس کے نتائج بہت مہلک نکلے اور انھوں نے پوری تحریک کے نیک مقاصد کو بھی نقصان پہنچایا اور دین الٰہی کی تحریک کے پیرؤوں کے ذہنوں میں انتشار پیدا ہو گیا۔ اس انتشار میں کچھ دربار کی خوشامد کچھ عہدوں

کالالچ، کچھ بادشاہ کی قربت کے لیے سازشیں اور کچھ ذہنی عدم اعتقاد ان سبھی عناصر نے اضافہ کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی اس انتشار کے ہاتھوں بری طرح مجروح ہوتی چنانچہ اسی انتشار اور مسلمانوں کے فکری ہیجان کا رد عمل حضرت مجدّد الف ثانی کی صورت میں ہوا۔ حضرت مجدد الف ثانی نے اس ہیجان اور فکری انتشار کا جواب ایک بالکل نئے فکر کی صورت میں ترتیب دیا۔

اکبر کی موت نے اس کش مکش کو تیز کر دیا جو اس کی زندگی میں شروع ہوئی تھی کہ سلطنت کی پائیداری کے لیے مختلف ادیان کو ملا کر نیا دین ضروری ہے یا اس کے بغیر ہی پائیداری حاصل ہو سکتی ہے۔ جہانگیر نے تخت پر بیٹھنے کے بعد ایک حقیقت پسند بادشاہ کی حیثیت سے ہندوؤں اور راجپوتوں کو اس طرح اپنے قریب رکھا اور ان میں غیریت اور اجنبیت کا احساس قطعاً پیدا نہیں ہونے دیا لیکن اس کے برعکس اس کے باپ اکبر نے جو مذہبی امور میں نئی نئی جدتیں شروع کی تھیں ان سے ہاتھ کھینچ لیا اور ان بدعات کو ختم کر دیا۔ جن سے مسلمان امراء اور علماء ناراض تھے۔ چنانچہ ایک لحاظ سے جہانگیر نے اکبر کی سیاسی پالیسی کو زیادہ وسعت دی اور اس کی تمام اغلاط کو دور کیا اور اس طرح سے اس نے مسلمانوں کی ناراضی بھی دور کر دی اور راجپوتوں کی شمشیر کو بھی اپنے قابو میں رکھا۔

اکبر نے جب دین الٰہی کی تحریک شروع کی تو اس کا خاصا شدید رد عمل ہوا اور کئی ایک جگہ اکبر کے خلاف تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں اور سلطنت کے مخالفین نے ان جذباتِ مذہبی کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال بھی کیا۔ لیکن اس کے باوجود اکبر کے پاؤں نہ ڈگمگائے اور اس نے سختی سے ان تحریکوں کو کچل دیا۔ اس طرح اس نے اپنی حکومت کے بجائے ہندوستانی حکومت بنانے پر زور دیا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس نے بیرونی اثر سے بھی آزادی حاصل کی اور باہر کے مراکز کی طرف توجہ کرنے کی بجائے دہلی اور آگرہ کو مرکز بنایا، نہیں تو اب تک یہ ہوتا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان حکمران سیاسی طور پر سمرقند، بخارا اور کابل سے متاثر ہوتے رہتے تھے وہاں کی سیاست ہندوستان کی حکومت کی سیاسی پالیسیوں کو متعین کرتی اور یہاں کی دینی پالیسیوں کی باگ ڈور ایران اور قاہرہ کے دینی مراکز میں ہوتی۔ قاہرہ میں رہنے والے خلفاء کا یہاں خطبہ پڑھا جاتا۔ حکومت کی سند وہاں

سے منگوائی جاتی - قاہرہ کے خلیفہ کی بھیجی ہوئی تلوار یہاں کا بادشاہ زیب کمر کرتا - لیکن اکبر نے ان روائتوں کو ختم کر ڈالا اس نے اپنی توجہ باہر کے ممالک سے ہٹا کر اندرون ہند کی مختلف طاقتوں کی طرف کی اور اس نے ہندوستان کے چپے چپے کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا عزم کیا - اور دراصل اکبر ہی پہلا بادشاہ تھا جس نے دکن کو بھی اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے کے لیے کسی نہ کسی حد تک اور کسی نہ کسی طریق سے مجبور کیا۔

آل تیمور کی یہ سلطنت جس کی پائداری وسعت اور استحکام کے لیے اکبر نے ایک نیا مسلک اختیار کیا تھا جس کے لیے راجپوتوں کے ساتھ شادیاں رچائیں - جس کے لیے اس نے مختلف مذاہب کا منصوبہ بنایا کیا تھا وہ حکومت شاہ جہاں کے زمانہ میں اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی - اس وقت تک یہ سلطنت اسلامی بھی تھی اور ہندوستانی بھی - جہانگیر اور شاہ جہاں پکے مسلمان بھی تھے لیکن ساتھ ساتھ ہندو رعایا کی اجنبیت کو بھی دور کرتے رہتے تھے - لیکن اب جس عروج پر یہ سلطنت پہنچ گئی تھی اس کی وجہ سے دو پالیسیاں ٹکرانے کے لیے اندر ہی اندر بے تاب تھیں - ایک پالیسی یہ تھی کہ ہندوستان پر خالصتاً مسلمانوں کی حکومت ہو اور ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں کو اس حکومت میں ملازم کے طور پر شریک کیا جائے تو کیا جائے لیکن اس کی پالیسیوں کی تشکیل میں ان کا کوئی حصہ نہ ہو دوسری پالیسی اور رجحان یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ ہندوستانیت کو اپنایا جائے - غیر مسلم طاقتوں کو اور زیادہ قریب لایا جائے اور ایک قوم کی نشوونما کو شعوری طور پر تیز کیا جائے ان دو رجحانات کا اظہار خود شاہ جہاں کے خاندان میں شدید طور پر ہو رہا تھا۔

دارا شکوہ اور اورنگ زیب

شاہ جہاں کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں اور لطف یہ ہے کہ مغل خاندان جس نے حکومتوں کی پائیداری اور استحکام اور طریق حکومت میں بے مثال کارنامے سرانجام دیے وہ تخت نشینی کا ایک بھی متفقہ ضابطہ مقرر نہ کر پائے تھے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہر باپ کو بیٹے کے ہاتھوں قتل ہونا پڑتا یا قید میں دن گزارنے پڑتے - ہر بھائی دوسرے بھائی کے خون کا پیاسا ہوتا، ہر باپ

اپنے لختِ جگر کو شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھا اور یہ بھی ہوا کہ اپنے ہی لختِ جگر کو قید کر کے اس کی آنکھوں میں سلائیاں پھروادی گئیں بہرحال شاہجہاں کے چار بیٹوں میں دو بیٹے دارا شکوہ اور اورنگ زیب دو مختلف رجحانات کے ہی علمبردار نہ تھے بلکہ وہ مستقبل کے ہندوستان کے متعلق بھی بالکل الگ الگ راہیں متعین کیے ہوئے تھے۔ ان دونوں کے مزاج، سیرت، خیال اور مذاق میں کلی طور پر تضاد پایا جاتا تھا۔ اورنگ زیب خاموش، گہرا، محتاط اور خشک تھا۔ اور دارا شکوہ ملنسار، صاف گو اور سادہ لوح تھا، اورنگ زیب عالم تھا اسے فضیلت حاصل تھی اور سب سے بڑھ کر وہ راسخ العقیدہ متشدد مسلمان تھا۔ جو عقیدۃً وحدۃ الوجود کے فلسفے کا زبردست مخالف تھا اور وحدۃ الشہود کا ماننے والا تھا۔ وہ مجدد الف ثانی کے صاحبزادے حضرت معصوم شاہ کا معتقد تھا اور ان کی دکھائی ہوئی راہ کو اپنے لیے نجات کا باعث سمجھتا تھا۔ اس کے مقابلے میں اس کا بھائی دارا شکوہ وسیع المشرب اور آزاد خیال صوفی تھا۔ دارا شکوہ نے وحدۃ الوجود اور ویدانت کا یکساں طور پر مطالعہ کیا تھا اور وحدۃ الوجود پر اس کا اعتقاد بہت پختہ اور گہرا تھا اسے مسلمان عارفوں، اولیاء اور ہندو سنیاسیوں اور پنڈتوں سے یکساں عقیدت تھی۔ اورنگ زیب جنگ کا رسیا، فن سپہ گری کا ماہر اور فوجی تدبّر اور سیاسی حکمتِ عملی میں کامل تھا لیکن اس کے برعکس دارا شکوہ نہ تو فوجی امور کا کوئی زیادہ ماہر تھا اور نہ سیاسی حکمت عملیوں سے اسے کوئی زیادہ دلچسپی تھی وہ تو شاعری، فلسفے اور تصوّف کا رسیا تھا۔ اس کی زندگی کا تانا بانا انہی خصوصیات سے بنایا گیا تھا۔ اور وہ کتابوں اور علم کے پیچھے مارا مارا پھرتا۔ اسے سلطنت کے امور سے نپٹنے کی فرصت کہاں تھی۔ لیکن وہ شاہ جہاں کا منظورِ نظر تھا اور رعایا میں بے پناہ ہردل عزیز تھا۔ چنانچہ وہ ولی عہد مقرر ہو گیا۔ لیکن مغلوں میں کون ولی عہد تلوار کے استعمال کے بغیر تخت پر بیٹھا ہے۔ چنانچہ ان بھائیوں میں بھی لڑائیاں ہوئیں۔ اور آخر کار اورنگ زیب اپنے راستے کے تمام کانٹوں کو ہٹاتا ہوا تخت نشین ہوا۔ یہ سترہویں صدی کے نصف ۱۶۵۹ء کا واقعہ ہے۔

اورنگ زیب کی سیاست اور اُس کی بُنیادیں

اورنگ زیب جب تخت نشین ہوا تو خزانہ خالی ہو چکا تھا اس لیے کہ شاہ جہاں نے بلخ اور بدخشاں کے لیے جو مہم بھیجی تھی اس میں نہ صرف ناکامی ہوئی تھی۔ بلکہ روپے کا زیاں بھی لاانداز تھا۔ چنانچہ اورنگ زیب جب تخت پر بیٹھا تو اسے خالی تجوریاں ملیں۔ مالیہ کی وجہ سے کاشت کاروں کی حالت بدتر ہو رہی تھی۔ اور عمالِ حکومت کی سخت گیریاں رُو بہ ترقی تھیں عیاشی اور فضول خرچیاں تباہ کر رہی تھیں اور عوام بزدل ہو رہے تھے۔ مسلمانوں میں ذہنی بے حسی اور اخلاقی پستی حد کو پہنچ چکی تھی چنانچہ ان حالات میں اورنگ زیب نے عنانِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لی تو اس نے سب سے پہلے سادی زندگی کا درس دیا۔ کیونکہ اسی ایک صورت سے حکومت کی مالی حالت کو درست کیا جا سکتا تھا۔

اورنگ زیب نے اکبر کے بنائے ہوئے راستے کو ترک کیا اور اس نے اپنے لیے جو طریقِ حکومت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا وہ اگر خالصتاً نہیں تو بہت حد تک مذہبی تھا۔ اس نے اپنی سیاست کی اساس مذہب پر رکھی۔ اس نے ہندوؤں پر جزیہ لگایا۔ خلافِ اسلام بدعنوانیوں کا قلع قمع کیا۔ نماز روزہ کی پابندی پر اصرار کیا۔ بادشاہ کی پرہیزگاری اور کفایت شعاری اور اسلام پسندی نے اسے مسلمانوں میں مقبول بنا دیا۔ یہ مقبولیت صرف ہندوستانی مسلمانوں میں ہی نہیں پھیلی بلکہ باہر کی اسلامی دنیا میں بھی اس کے زہد و تقویٰ کے چرچے ہونے لگے اور اس نے ہندوستان کی اس مغلیہ حکومت کو اسلامی حکومت بنانے کی طرف ایک زبردست قدم اٹھایا اور وہ سنّی فقہ کی تدوین تھی۔ عدالتوں کو شرعی عدالتیں بنانے کی کوشش کی۔ اخلاق عامہ کی نگرانی کے لیے محتسب مقرر کیے، سرکاری ملازموں کی بد دیانتی کے لیے، رشوت خوری، جبر و تعدی اور سوداگروں اور دکانداروں کی بدمعاملگی کو روکنے کے لیے مختلف اقدام کیے۔ مسلمانوں میں جو خلاف شرع عقائد و اعمال جاری ہو گئے تھے ان کا سختی سے احتساب شروع کیا۔

عالمگیر کی شخصیت

اورنگ زیب کی ذاتی زندگی بھی قابلِ رشک تھی۔ اس نے اپنے دربار میں سادگی کو رواج دیا جشن اور تقریبات میں زبردست کمی کردی گئی۔ مصوّروں، موسیقاروں اور شاعروں کو دربار سے الگ کردیا گیا۔ حتیٰ کہ اس نے درباری مورخوں کو بھی موقوف کردیا۔ وہ خود بھی بہت ہی سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ شاہی خزانہ سے وہ اپنے مصارف کے لیے ایک کوڑی بھی نہ لیتا تھا۔ بلکہ ٹوپیاں سی کر اور قرآن حکیم کی کتابت کرکے اپنے لیے روزی کماتا۔ اس نے شراب اور دوسری منشیات پر قطعی پابندی لگادی۔

نئے مندروں کی تعمیر کے متعلق اورنگ زیب کو مطعون کیا جاتا ہے کہ اس نے ان تعمیرات پر پابندی لگادی تھی حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان مندروں کی تعمیر پر تو شاہ جہاں کے زمانے میں ہی پابندی عائد کردی گئی تھی اور یہ الزام بھی مبنی بر صداقت نہیں ہے کہ اورنگ زیب نے اپنی متشدّدانہ پالیسی کی بناء پر مندروں اور دوسری مذہبی تعمیرات کو مسمار کیا تھا۔ مندروں کی بربادی کے متعلق جتنے بھی واقعات رونما ہوئے تھے ان کا عالمگیر کی مذہبی پالیسی سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ اس کے الٹ ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ اس دورِ عالمگیری میں حکومت کی طرف سے مندروں کے مصارف برداشت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ بہر حال عالمگیر نے یہ کوشش ضروری سمجھی کہ اپنی مملکت کو اسلامی اور مذہبی بنایا جائے اور حکومت میں ہندوؤں اور غیر مسلموں کے حصے کو جتنا بھی کم کیا جائے وہ بہتر ہے۔

عالمگیر کی سیاست کے نتائج

اورنگ زیب کا بنیادی نصب العین وہی تھا جو اکبر اور شاہ جہاں کا تھا اور صرف انھیں کا نہیں بلکہ اس دور کے ہر بادشاہ کا جو نصب العین رہ چکا تھا۔ یعنی اٹک سے برہم پترا تک اور ہمالیہ سے راس کماری تک سارے ملکوں کو سرنگوں کرنا۔ اس ملک کی مرکزیت کو عطا کرنا۔ اور

سیاسی وحدت حاصل کرنا تھا۔ اب ان مقاصد اور نصب العین کے لیے اس کی نگاہیں ہندوستان سے بھی باہر اٹھ رہی تھیں۔ اورنگ زیب اپنے باپ کی طرح خیبر پار کے ممالک کو بھی اپنے قبضہ میں کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ حجاز پر بھی اپنا پرچم لہرانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے کو تمام اسلامی دنیا کا رہنما بنانا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ اسلام کی تبلیغ کا ایک ہی ذریعہ سمجھتا تھا اور بقول مولانا عبید اللہ سندھی یہ اس وقت تک ممکن نہ تھا۔ جب تک وہ اپنی مملکت کو اسلامی رنگ نہ دیتا۔ اکبر کی سیاست کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ ان کو رفع نہ کرنا اکبر کا سیاسی مسلک راجپوتوں کو ہموار کرنے کے لیے تھا۔ اورنگ زیب کے پیش نظر ہندوستان کے علاوہ اسلامی دنیا کی قیادت تھی۔ اس لیے ایک کو ہندوستانیت پر زیادہ زور دینا پڑتا تھا اور دوسرے نے اسلامیت کو مقدم جانا۔ یہ اسباب تھے جن کی بناء پر اورنگ زیب کو اکبری نظام کے خلاف جانا پڑا۔ اکبر کی سیاسی اور مذہبی زندگی ابن عربی کے عقیدہ وحدۃ الوجود سے متاثر تھی۔ اورنگ زیب کا سیاسی فکر امام ربّانی کی تعلیمات کا پرتو تھا۔ اکبر مختلف مذاہب اور مختلف قوموں کو ہم آہنگ بنانے کا داعی تھا۔ اورنگ زیب مسلمانوں کی تنظیم کرنا چاہتا تھا۔ اور انھیں ذہنی انتشار، جماعتی پراگندگی اور اخلاقی بے راہ روی سے نکال کر اس قابل بنانے میں کوشاں تھا کہ وہ نہ صرف ہندوستان کی حکومت کو سنبھال سکیں بلکہ بیرونِ ہند کے اسلامی ملکوں کو بھی اپنے اثر میں لیں۔ اس راہ میں امامِ ربانی کی دعوت اس کے لیے مثال ہدایت بنی تھی۔

امامِ ربانی کے طریقہ میں شیعت سے قدرے بُعد تھا اور اکبر کی ہندو نوازی بھی انھیں گوارہ نہ تھی۔ ان کے نزدیک اسلامی جماعت کے استحکام اور ان کی تنظیم میں شیعوں کی بدعات اور ہندوؤں کے اثرات دونوں سدِ راہ تھے۔ اس لیے وہ ان کو بیچ سے ہٹانا ضروری سمجھتے تھے امام ربانی کے ان خیالات کا اثر لامحالہ عالمگیری سیاست پر بھی پڑا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ شیعوں اور ہندوؤں کو عالمگیر کا وہ قرب نہ رہا جو اس سے پیشتر مغل بادشاہوں کے ساتھ ان کو تھا۔

مولانا آگے چل کر لکھتے ہیں کہ الغرض کہ اب تک تو یہ ہوتا تھا کہ خیبر پار کے ملکوں

کے مسلمان طبقے سیاسی تفوق کے لیے ہندوستان کا رخ کرتے۔ وہاں کے مذہبی نظریے یہاں فروغ پاتے ان کی لکھی ہوئی کتابیں ہمارے ہاں مدرسوں کا نصاب بنتیں۔ فکر ان کا، سیاسی نظام ان کا، مذہبی افکار ان کے، ہندوستان کا علم محض ضمیمہ تھا۔ باہر کے اسلامی ملکوں کے علم کا اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کی بدولت ملک کو سیاسی خود اعتمادی نصیب ہوئی تو یہاں بھی اسلامی فکر کی نیو پڑی۔ چنانچہ امام ربانی مجدد الف ثانی ہندوستانی اسلام کے پہلے مفکر ہیں اور دوسری طرف وہ کُل دنیائے اسلام کے لیے مجدّد بھی تھے جس طرح امامِ غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ خاص اپنی قوموں کے مفکر تھے اور کل دنیا کے مسلمان بھی ان کے فکر سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔ یہاں بھی اسلامی ہند کی بین الاقوامی قیادت کی مہم شروع ہوتی ہے اور دہلی بخارا، سمرقند اور ایران وحجاز کے علمی اور سیاسی مرکزوں کو وہ اپنے زیرنگین کرنے کے لیے حرکت میں آتا ہے۔ ایک دفعہ اشوک کے زمانے میں ہندوستان کا فکر بیرونِ ہند پہنچا تھا اور بُدھ مت کے ہندوستانی بھکشو اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے ایران، توران اور مشرق قریب تک گئے کم وبیش اسی طرح عالم گیر کے زمانے میں ہندوستانی مسلمان اپنے طریقہ کو وسطِ ایشیا اور حجاز تک لے جانا چاہتے تھے۔ اکبر کے عہد تک ہندوستان کی اسلامی سلطنت کل دنیائے اسلام کا ایک حصہ تھی۔ یہاں کے حکمران اپنے آپ کو بغداد یا قاہرہ کے خلفا کا مطیع وفرمانبردار سمجھتے تھے۔ اکبر نے اسلامی ہند کو ایک مستقل حیثیت دی اور ایران وروم کی فرمانبرداری سے آزاد کیا۔ جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانے میں ہندوستان کی اس اسلامی سلطنت کی بنیادیں اور محکم ہوئیں۔ اورنگ زیب کا دور آیا تو پھر ہندوستانی مسلمان اردگرد کے اسلامی ملکوں پر اپنا دینی اور سیاسی اقتدار قائم کرنے نکل کھڑا ہوا دوسروں لفظوں میں اشوک سے ہزاروں سال بعد ہندوستانی پھر اس قابل ہوئے کہ وہ دوسروں کی سیاسی اور فکری ترک تازیوں کی آماجگاہ بننے کی بجائے اپنا پیغام باہر کی دنیا کو سنائیں گو اشوک کے زمانے میں یہ پیغام بدھ مت کا تھا۔ اور عالمگیر کے زمانے میں یہ پیغام امام ربانی مجدد الف ثانی کا تجدیدی اسلام تھا۔ اسے بدقسمتی کہیے یا اتفاق کہ جب ہندوستان سیاسی اور مذہبی ارتقاء کی اس منزل پر پہنچ گیا تو وہ ایشیائی ممالک میں بین الاقوامی سیاست کا ایک اہم مرکز بنا تو اس

کے اندر اور باہر نئے نئے فتنے اٹھ کھڑے ہوتے اندرون ملک میں مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں اور روہیلوں نے آفت مچادی اور باہر سے نادر شاہ نے چڑھائی کردی اور سات سمندر پار سے پرتگیز ولندیزی، فرانسیسی اور انگریز آگئے اور ہمارا ملک دوسروں کا غلام ہوگیا۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے عالمگیر کی اس متشددانہ مذہبی پالیسیوں کے جواز میں دلائل دیے ہیں وہ اپنی جگہ کتنے ہی برحق اور معقول کیوں نہ لگیں۔ لیکن اس امر سے کیسے انکار کیا جاسکتا ہے کہ اس برصغیر میں اورنگ زیب کی ان متشددانہ پالیسیوں کا جو ردعمل ہوا اس کے برصغیر کی سماج پر بالعموم اور مسلم معاشرے پر بالخصوص جو مہلک اثرات ہوتے ان سے ہم ابھی تک ایک نہ ایک صورت میں دامن نہیں چھڑا سکے۔ اس لیے ان اثرات کو جاننا ازبس ضروری ہو جاتا ہے۔ اور ان مہلک اور جان لیوا اثرات کا تجزیہ کرنے کی بجائے جب ہمارے مورخ اور تجزیہ نگار یہ کہہ کر آگے گزر جاتے ہیں کہ اورنگ زیب کے جانشینوں کی نااہلی ہی فقط مغل بادشاہت کے زوال کا باعث ہوئی تو یہ حقیقتوں کا حقیر ترین پہلو ہے جس کو ہم اہم ترین حقیقت بنا کر پیش کر کے پوری تاریخ کو مسخ کر رہے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ زوال و انتشار کے بیج خود اورنگ زیب کی پالیسیوں، عدم رواداری اور مذہبی معاملات میں تشدد نے بوئے تھے اور ان سے بھی بڑھ کر اورنگ زیب کو اس برصغیر کے دُور دراز علاقوں کو اپنی مرکزیت کی زنجیروں میں جکڑنے کی خواہش نے بے چین بنا دیا اور اس کے لیے خزانہ پر بلا کا بوجھ پڑا اور اس کے زیادہ سے زیادہ ٹیکسوں اور مالیے نے زرعی بحرانوں کو جنم دیا اور ان بحرانوں نے مزاحمتی تحریکوں کو جنم دیا۔ اور ان تحریکوں کی کوکھ سے سکھ، جاٹ، مرہٹہ، افغان قوم پرستی نے جنم لیا۔ چنانچہ کوئی بھی تجزیہ نگار خوش حال خٹک کی اس نظم کو کیسے فراموش کر سکتا ہے۔

"میں اورنگ زیب کے عدل و انصاف کو جانتا ہوں۔ اس کے دین و مذہب
اور نفس کشی اور روزہ داری سے بھی واقف ہوں۔
کیا اس کے سب بھائی ایک ایک کر کے اس کی تلوار کا شکار نہیں ہوتے؟
کیا اس کے باپ کو شکست کھا کر قید خانہ کی مصیبتیں نہیں جھیلنی پڑیں؟

خواہ کوئی شخص دن میں ہزار بار سجدے کرے اور زمین پر سر مارے اور روزوں کی کثرت سے اس کی ناف ریڑھ کی ہڈی سے مل جائے۔ جب تک اس کے دل میں نیکی نہ ہو۔

اس کی سب عبادتیں اور طہارتیں مکرِ دریا ہیں۔ اورنگ زیب کی زبان کچھ اور کہتی ہے اور اس کا دل کچھ اور ہی سوچتا ہے، خدا کرے کہ اس کے دل اور گردے مجروح ہو جائیں اور وہ تیغ و تفنگ کا شکار ہو۔"

چنانچہ یہ صورتِ حال تھی اور یہ تھیں اورنگ زیب کی پالیسیاں جس کے نتیجے میں زوال کا عمل شروع ہوا۔ کیونکہ اورنگ زیب نے جب دارا شکوہ سے نبرد آزمائی کی تھی تو یہ صرف تخت کے جانشین سے ہی محاذ آرائی نہ تھی اور جب سرمد کو شہید کیا گیا اور جب اس نے یہ اشعار پڑھتے ہوئے۔

شورے شد و از خوابِ عدم دیدہ کشودیم
دیدیم کہ باقی است شب فتنہ غنودیم

گردن تلوار کے نیچے رکھدی تھی تو یہ شہادت، یہ قتل، افراد کی موت نہ تھی۔ بلکہ یہ ایک مسلک کی موت تھی۔ کیونکہ اورنگ زیب اور دارا شکوہ کے دو مسلکوں کے نمائندے تھے۔ جن میں تصادم ہوا۔ جہانبانی کے دو طریقے تھے جو آپس میں گتھم گتھا ہوئے۔ برصغیر کے سماج کی دو راہیں تھیں جو آپس میں متصادم تھیں اور سرمد یا دارا شکوہ کے مذہبی عقائد یا آزاد خیالی یا وحدۃ الوجود پر اعتقاد ایک بہانہ تھا، ایک ظاہر داری تھی، ایک جواز تھا جو ہر دور حاکم تلاش کیا ہی کرتے ہیں۔ چنانچہ سرمد کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے۔

"ایشیا میں ہمیشہ سے پالٹیکس مذہب کی آڑ میں رہا ہے، ہزاروں خونریزیاں جو پولٹیکل اسباب سے ہوئی ہیں ان کو مذہب کی چادر اوڑھا کر چھپا دیا گیا ہے۔"

چنانچہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب زوال و انتشار کا عمل کھل کر سامنے آگیا تو اس رُو بہ زوال اور منتشر ہونے والے معاشرے نے ہی شاہ ولی اللہ کے فکر کو پروان چڑھایا اور ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے شاہ صاحب نے بہت حد تک اپنے فکر کو ترتیب دیا۔ لیکن اس صورت حال کے تجزیے میں سب سے بڑی رکاوٹ خود اورنگ کی مذہب سے لگاوٹ ہے اور اسی تقدس نے ہمیں اس کی غلطیوں کو جاننے نہیں دیا اور جن مسلمان اہلِ علم نے ان غلطیوں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی بھی ہے انھوں نے بھی یہ نشاندہی اشاروں کنایوں میں ہی کی ہے اور جب ہندو اور انگریزوں نے اس طرف کھل کر اشارے کیے تو ان کا موقف اپنی جگہ درست سہی لیکن ہم نے ان کو سرے سے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ہم نے ان کی تحریروں کو اپنے دین پر حملہ تصور کیا اور شمشیر بدست ان کے خلاف میدان میں نکل آئے اور ہم نے اورنگ زیب کو مغل بادشاہ سے زیادہ اسلام کا محافظ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ مغل دور حکومت میں جہانبانی کے جو دو طریقے آپس میں دست و گریبان رہے تھے ان کے اور اورنگ زیب کے دور حکومت میں جو اثرات مرتب ہوتے ان کو ذرا کھل کر بیان کیا جائے کیونکہ میرے نزدیک شاہ ولی اللہ کے فکر کا ایک اہم پہلو اورنگ زیب کی پالیسیوں سے انکار ہے اور اب تک شاہ ولی اللہ کے فکر کے بارے میں اور ان سے متعلق تمام دوسرے افکار کا ذکر بھی اس لیے کیا ہے تا کہ شاہ ولی اللہ کے فکر کے شعوری اور غیر شعوری ماخذوں کا پتہ چلایا جا سکے۔ کیونکہ یہ فکر ابھی تک پاک و ہند کے علماء کے ایک بہت بڑے گروہ کے فکر اور سیاسی لائحہ عمل کی بنیاد بنتا رہا ہے اور اب بھی بہت حد تک ہے کیونکہ شاہ ولی اللہ کو جو دور ملا اور اس کی جو ضرورتیں تھیں وہ ان کے بعد بھی دو صدی تک یہاں کے علماء کو درپیش رہیں اور بہت حد تک ہیں۔

شاہ ولی اللہ کو مرکزی حکومت میسر نہیں آئی تھی۔ مستحکم اور دیانت دار نظام حکومت بھی ناپید تھا۔ امن و امان بھی عنقا تھا۔ اس لیے ان کے لیے بنیادی سوال یہ تھا کہ آخر مسلمانوں کی مرکزی حکومت کیوں تباہ ہوئی اس کی بحالی اور پائیداری کے لیے کون سے طریقے ضروری ہیں

کہ جن کے اپنانے سے دوبارہ ایک مستحکم مرکزی حکومت میسر آسکے۔ انہی دو سوالوں کے حل کے لیے انھوں نے وحدۃ الوجود کو اپنایا جس کو اورنگ زیب نے رد کیا تھا۔ اسی کے حل کے لیے انھوں نے شیعوں اور سنت والجماعت کو قریب لانے کے لیے کتابیں رقم کیں۔ جب کہ مجدد الف ثانی نے شیعوں کی تعلیمات کے رد میں کتابیں رقم کی تھیں اور انہی سوالوں کے حل کے لیے انھوں نے اپنی طرف سے احمد شاہ ابدالی کو جو مکتوب روانہ کیا اس میں ایک منصفانہ نظام عدل اور رعایا کی خوش حالی کیلئے جدوجہد پر اصرار کیا۔ اگر شاہ ولی اللہ کی زندگی میں کوئی ایسا نظام وجود میں آتا جس میں ان کی رائے بھی شامل ہوتی تو وہ یقیناً اورنگ زیب کے جزیہ عائد کرنے کے سلسلے کو بھی ختم کرنے کی رائے دیتے کیونکہ اورنگ زیب کی متشددانہ پالیسیوں نے شدید قباحتیں پیدا کی تھیں۔

اورنگ زیب نے ۱۶۷۹ء میں ہندوؤں پر جزیہ عائد کرنے کے جو احکام صادر کیے اور اور بقول شاہی مورخ کافی خاں۔ اس کا مقصد کافروں اور مسلمانوں میں تمیز کرنا تھا اور یہ تسلیم کرنا تھا کہ یہ مسلمانوں کی حکومت ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دہلی اور اس کے گرد و نواح میں ہزاروں ہندوؤں نے جزیے کے لفاذ کے بعد جب احتجاجی مظاہرے کیے تھے اور یہ بھی تاریخوں میں درج ہے کہ جزیے کے نفاذ کے نفاد جب بادشاہ جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے لیے جا رہا تھا تو مظاہرین نے پورا راستہ روکا ہوا تھا اور وہ جزیہ ہٹانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ چنانچہ بادشاہی احکام کے تحت ہاتھیوں اور گھڑسواروں کو مجمع منتشر کرنے کے احکام صادر کیے گئے اور ہاتھیوں اور گھوڑوں کے نیچے آکر کتنی ایک مظاہرین اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ یہ باتیں شاہی مورخ کافی خاں نے خود رقم کی ہیں۔

اس جزیے کی وصولی پر کافی سختی روا رکھی گئی اور درباری سازشوں میں بھی اس جزیے کی وصولی نے ایک اہم کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ جب کسی اہل کار کو بادشاہ کی نظروں سے گرانا ہوتا تو اس پر الزام عاید کر دیا جاتا کہ وہ جزیہ کی وصولی میں نرمی برت رہا ہے اس پر وہ اہل کار معتوب شاہ قرار پاتا۔ اس عمل نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک خلیج پیدا کی۔ اب ہم لاکھ کہتے رہیں کہ اس

کے عوض میں ہندوؤں کو کئی ایک سہولتیں حاصل تھیں لیکن حقیقت یہ رہی ہے کہ ہندوؤں کو یہ ایک ظالمانہ فعل محسوس ہوتا تھا۔ جب ہندو مسلمانوں سے چھوت چھات برتتے تھے۔ حالانکہ یہ ان کے مذہب کا ایک حصہ تھا تو مسلمانوں پر نفسیاتی طور پر کیا بیتتی تھی اور اس کا ردعمل سیاسی زندگی میں کیا ہوا۔ اسی طرح سے یہ کہدینا کافی نہیں ہوتا کہ اورنگ زیب اپنا مذہبی فریضہ ادا کر رہا تھا دراصل یہ فریضہ اس وقت کے سیاسی تقاضوں کے خلاف تھا۔ کیونکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ اورنگ زیب کے دور میں کئی ایک علاقوں نے مالیہ کی ادائیگی کی رقوم سے بھی انکار کیا اور ان کو جزیہ کی وجہ سے جو اشتعال تھا اس نے بھی زرعی تحریکوں کو جاندار بنادیا۔ چنانچہ کئی ایک تحریکوں اور چھوٹی چھوٹی بغاوتوں کے تذکرے اورنگ زیب کے دور میں ہمیں ملتے ہیں۔

اورنگ زیب کے مذہبی متشددانہ رویے نے مقابلے میں متشددانہ رویوں کو جنم دیا سکھوں کا تشدد، مرہٹوں کی کٹر ہندو پرستی ان سب کو ایک نہ ایک لحاظ سے اورنگ زیب کی پالیسیوں سے ہوا ضرور ملی۔ ویسے ہمارے ہاں مرہٹہ قوم پرستی ہو یا سکھوں کا بطور ایک مذہب اور ایک قوم کے نشوونما پانے کے عمل کو پورے پس منظر میں رکھ کر نہیں جانچا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہم ان تحریکوں کے منفی اور مسلم دشمن پہلوؤں پر نگاہ رکھتے ہیں۔ لیکن ان تحریکوں کے مثبت پہلوؤں کا جائزہ لینے سے گریز کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم ان تحریکوں کو صرف مذہبی متشددانہ تحریکیں سمجھ لیتے ہیں۔ جس طرح مسلمانوں کی ہر تحریک کو ایک متعصب تحریک سمجھ لیتے ہیں اور اس سے ایک گونہ نفرت اور دشمنی پر اصرار کرتے ہیں۔ چنانچہ۔ یہ عمل ہم پچھلی تین صدی میں دیکھتے ہیں۔ جس طرح اس برصغیر کی تاریخ میں ایکتا اور ایک دوسرے کے نزدیک آنے کی تحریکیں اور عمل تاریخ میں جاری وساری رہا ہے اسی طرح سے ہماری تاریخ میں دشمنی اور نفرت کے جذبات بھی قدرے موجزن رہے ہیں۔ اور آج کی تحریکیں بھی ان دو متضاد رجحانات کا کسی نہ کسی حد تک تسلسل ہیں۔ چنانچہ جب اورنگ زیب نے داراشکوہ کو قتل کرنے کے احکام صادر کیے تھے تو اس کی پشت پر جہاں جہانبانی کے تقاضے تھے وہاں ایک متشددانہ مذہبی رویہ بھی تھا۔

اس موقع پر ان تمام تحریکوں کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے ورنہ اس برصغیر کی فکری تحریکوں کی

ایک جامع تاریخ کی اشد ضرورت ہے۔ تاکہ ہمارے اندر کنوئیں کے مینڈک بننے کے جو رجحانات نمایاں رہے ہیں ان کی مزاحمت کی جا سکے اور بتایا جائے کہ کس طرح اس برصغیر میں مختلف نسلوں قوموں، مذہبوں نے ایک دوسرے پر اثر ڈالا اور کیسے اس آمیزش اور آویزش سے ہماری سیاسی اور فکری تحریکوں نے اٹھان حاصل کی چنانچہ اگر اس وسیع پس منظر میں شاہ ولی اللہ اور ان کے بعد ان کے خانوادے کے ارتقار کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں تین اہم پہلو نظر آتے ہیں۔

اولاً وحدۃ الوجود

دوئم، صاحبِ شمشیر کی تلاش جو عادل ہو اور برصغیر کو ایک مرکزی مستحکم حکومت مہیا کر سکے۔

سوئم، مسلمانوں میں شرک، بدعت اور غیر شرعی رسوم کا خاتمہ۔

یہ تین پہلو ہمیں شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز میں مشترک نظر آتے ہیں۔ لیکن سید احمد شہید کی تحریکِ جہاد نے ایک نئے باب کا آغاز کیا کہ اگر کوئی صاحبِ شمشیر حاصل نہ ہو تو پھر خود عالمِ دین تلوار بدست میدان کارزار میں اترے اور قیادت خود سنبھالے۔ اور جب انگریزوں کا تسلط شمالی ہندوستان تک پھیلنا شروع ہوا تو نئے طبقوں کے وجود میں آنے کے ساتھ ساتھ قیادت کا مسئلہ بھی ایک لاینحل مسئلہ بن گیا اور یہ مسئلہ آج بھی ایک دردِ سر ہے اس لیے انگریز کی آمد اور اس کے اثرات نے جو تبدیلیاں پیدا کیں ان کو پوری طرح سمجھے بغیر نہ تو اس مسئلے کو پوری طرح سمجھ سکیں گے اور نہ ہی ہم اپنے علما کی عظمت کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو الگ الگ کر پائیں گے۔

باب ۱۲

خانوادۂ ولی اللہ

اور

محمد بن عبدالوہابؒ کی نجدی تحریک

شاہ ولی اللہ نے جو فکر مرتب کیا اس نے دو باتیں لازم کردیں کہ پیشہ ور فوجیوں کی تلوار اگر مسلمانوں کے تنزل کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تو پھر علماء کو ہی شمشیر بدست میدان کارزار میں قدم رکھنا ہوگا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ پہلے کوشش کی گئی کہ یہ پیشہ ور فوجی اور مختلف نواب اور راجواڑے اور خان جو چھوٹی چھوٹی سلطنتوں اور فوجوں کے مالک تھے انھیں اس طرف متوجہ کیا جائے جب اس میں چنداں کامیابی نہ ہوئی تو پھر ایک جد وجہد کے لیے کمر باندھنی پڑی اور یہ جو فکر کی ترتیب عمل میں آئی ۔ اسی طویل جد وجہد کا نتیجہ تھی۔ کیونکہ طویل جد وجہد کے لیے ضروری ہے کہ عوام کو ایک نئے فکر سے لیس کیا جائے اور اسی فکر کی بنیاد پر ان کو میدان جہاد میں اترنے کے لیے کہا جائے۔

یہ ضرورتیں تھیں جن کے باعث شاہ ولی اللہ کے خانوادے کو علم وفضیلت کی دستار کے ساتھ ساتھ عوامی قیادت کا پرچم خود ہی اپنے ہاتھ میں لینا پڑا ۔ اس ایک قدم نے ہماری سیاست کی سیادت بھی علمائے دین کے سپرد کردی۔ چنانچہ یہی وجہ اور یہی حالات ہیں جن کی وجہ سے ہماری سیاست کی سیادت پر علماء فائز رہے ہیں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کا تو

یہ خاصا رہا ہے کہ اس میں دین کی اصلاح کی تحریک ہو یا دنیا کی بہتری کے لیے جدوجہد، ہر حرکت کی قیادت انہی علماء کے ہاتھ میں رہی۔ جیسے بیسویں صدی میں جو تحریکیں اٹھیں انکی قیادت ڈاکٹروں اور بیرسٹروں کے ہاتھ میں رہی اسی طرح اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے قائدین علمائے دین ہی تھے۔ اس لیے کہ حکومتوں کے زوال کے بعد جب عوام کے بل بوتے پر تحریکیں چلانے کا کام شروع ہوا تو صرف وہی ادارہ اور گروہ تحریک کی قیادت کا اہل ہو سکتا تھا جو عوام کے قریب ہو اور اس کا عوام پر اثر ہو اور عوام ان پر اعتقاد رکھتے ہوں۔ اور یہ طبقہ صرف علماء ہی کا تھا اور جب علماء بھی شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادوں اور خاندان کے افراد کی طرح کے علماء ہوں جنھوں نے اپنی زندگی کو عوام کے اتنا قریب رکھا تھا۔ کہ عوام ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا ضروری سمجھتے تھے۔ تو ظاہر ہے کہ جب یہ جہاد کا نعرہ بلند کریں گے تو اکثر کو یہ نعرہ متاثر کریگا اور جب عوام کی اپنی زندگیاں بھی ناآسودہ ہوں، ان کی زندگی میں چاروں طرف مایوسی اور ناامیدی نے ڈیرے ڈالے ہوں، غربت اور افلاس نے زندگی اجیرن کر رکھی ہو، سلطنت کے الٹ پلٹ نے زندگی کا چین اور سکون حرام کر دیا ہو تو ظاہر ہے ایسے میں زندگی موت سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ اور اگر اس میں مذہب پکار رہا ہو خدا اور رسول کے احکام یاد کرائے جا رہے ہوں تو وہ زیادہ متاثر کریں گے۔ چنانچہ یہی حال اٹھارہویں اور انیسویں صدی کا رہا ہے۔ ویسے ان صدیوں میں علوم و فنون اور مساجد و مکاتب و مدارس کا جو مروجہ نظام تھا اس کے لیے بھی معاشرے میں علماء کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ جب یہ طبقہ میدانِ کارزار کی طرف پکارے تو عوام کا متاثر ہونا قدرتی بات ہے۔

علماء کے کم خانوادے ایسے ہیں جنھوں نے چار پشتوں تک علم کی دنیا میں مسلسل حکمرانی کی ہو اور کم خانوادے ایسے ہیں جنھوں نے ہر نسل میں زہد و تقویٰ میں اپنے بزرگوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہو یہ فخر شاہ ولی اللہ کے خاندان کو میسر آیا۔ لیکن اس کا ایک اور پہلو بھی ہے کہ اس تسلسل نے اس خاندان کے نام لیواؤں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ کیا جس کی وجہ سے ان کے لیے ایک تحریک کی تنظیم ممکن ہو گئی۔ ویسے مولانا عبید اللہ سندھی کا بنیادی دعویٰ تو یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ نے اپنے زمانے میں باقاعدہ ایک تحریک کو متشکل ہی نہیں کیا بلکہ اس تحریک کے دائرے میں اس کی تنظیم اس

کی مجلس عاملہ غرضیکہ ہر تفصیل کو طے کر لیا تھا چنانچہ وہ مولانا محمد عاشق، مولانا محمد امین اور مولانا نور الحق کو حکیم الہند شاہ ولی اللہ کی تحریک کی مرکزی کمیٹی کا خطاب دیتے ہیں اور نجیب آباد کے مدرسے، رائے بریلی کے تکیہ شاہ علم اللہ، ٹھٹھہ میں ملا معین الدین کا مدرسہ، عارف سندھ شاہ عبداللطیف بھٹائی کی خانقاہوں کو اس مرکزی کمیٹی کی شاخیں بناتے ہیں۔ بہر حال ایک بات تو تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ شاہ ولی اللہ نے اپنے فکر کا احاطہ اتنا وسیع رکھا کہ اس کی ترویج کے لیے ایک نئے نظام کی تشکیل لازمی ہو جاتی ہے کیونکہ جس اقتصادی اور معاشی توازن، جس عدل و انصاف کا وہ ذکر کرتے ہیں وہ اس وقت کے مروجہ نظام میں کسی صورت میں پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے ان کو ایک جماعت کی لازماً ضرورت ہو گی اور آیا انھوں نے یہ تمام تفاصیل جن کا ذکر مولانا عبیداللہ نے کیا ہے طے کی تھیں۔ یہ باور کرنا مشکل ہے۔ لیکن خود درس و تدریس رشد و ہدایت کا جو سلسلہ اس زمانے میں ہوتا تھا۔ وہ خود ایک تحریک کا ڈھانچہ اور تنظیم کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ اور اگر کوئی صاحب فکر اس زمانے میں اس ڈھانچے سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ رکھتا ہو تو اس کے امکانات موجود تھے۔ چنانچہ خانوادۂ شاہ ولی اللہ نے اسی درس و تدریس اور رشد و ہدایت کے مروجہ ڈھانچے سے ہی ایک تحریک اٹھائی اور آنے والے جہاد کی بنیاد بنایا۔

یہ خصوصی حالات تھے جنھوں نے قیادت کا تاج اس علماء کے طبقے کے سپرد کر دیا یہ درست ہے کہ علماء کے ایک گروہ نے اس قیادت کے فرائض کی بجا آوری میں گراں بہا قربانیاں دیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، پھانسیاں ان کا مقدر ہوئیں، جائدادیں ضبط ہوئیں۔ غرضیکہ کون سی قربانی تھی جو اس علماء کے ایک گروہ نے نہ دی ہو۔ چنانچہ یہی قربانیاں تھیں جنھوں نے ان کے اثر و رسوخ اور عوامی تائید میں معتد بہ اضافہ کیا چنانچہ جب حکمران طبقے نے ان علماء کو اپنی مخالف صفوں میں دیکھا تو اس نے ان میں سے کئی ایک علماء کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ ان سے امداد و تائید حاصل کی اور اس طرح سے حکمران طبقہ کی حمایت و مخالفت بھی ایک مذہبی سوال بن گیا۔ چنانچہ یہاں پچھلی دو صدیوں میں مذہبی

امور کے متعلق بھی جو مباحثے، مناظرے اور کفر و تکفیر کے اعلانات ہوئے ہیں ان میں بھی اکثر و بیشتر کی بنیادی وجہ سیاسی و معاشی تھیں، اور تو اور جب خانوادۂ شاہ ولی اللہ نے روافض کے خلاف اپنا تحریری جہاد شروع کیا تو اس میں بھی سیاسی مسئلہ درپیش تھا۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک مغلیہ خاندان کی تباہی کی وجوہات میں ایک وجہ سے روافض کی ریشہ دوانیاں بھی شامل ہیں چنانچہ جب اس ملک کے ایک حاکم نے مرہٹوں سے ساز باز کر کے دہلی پر مرہٹوں کی چڑھائی کرادی تو ان کو یقین ہوگیا کہ یہ اسلام کے نام پر اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ ساز باز کی جارہی ہے اس لیے ان پر لازم ہوگیا کہ وہ اپنے افکار کو اس محاذ پر استعمال کریں۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے اور پھر ان کے بڑے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز نے روافض کے عقائد کی تردید میں ایک جامع مبسوط اور مفصل کتاب لکھی اس لحاظ سے اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے علماء کی تحریکوں اور تحریروں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور جب بھی مسلمانوں نے ایک دوسرے کے خلاف قلم اٹھایا تو وہ بھی صرف مذہبی بحث اور مذہبی امور کے متعلق نہ تھا بلکہ قلمی تنازعوں اور علمی جھگڑوں کی پشت پر بھی سیاست کے مختلف نظریات اور حکومت وقت کے متعلق مختلف آراء کام کر رہی تھیں۔

ان دینی تحریکوں اور علمی مباحث کو وسیع پس منظر میں پرکھا جانا چاہیے۔ اس لحاظ سے شاہ ولی اللہ سے بھی زیادہ اہمیت ان کے بڑے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز کو حاصل ہوئی ہے اس لیے کہ گو انھوں نے براہ راست کسی بادشاہ کو خطاب نہیں کیا۔ نہ ہی انھوں نے سماجی عدل و انصاف کے قیام کے لیے اپنے باوا کے فکر سے ہٹ کر کوئی نئی راہ تجویز کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی اہمیت ان سے ایک لحاظ سے بڑھ جاتی ہے اس لیے کہ ان کی زندگی میں اس برصغیر کی صورت حال بہت حد تک واضح ہوگئی تھی اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ اب برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقابلے میں دوسری طاقتیں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکیں گی۔ یہ درست ہے کہ آپ کی شروع زندگی میں افراتفری کا وہی عالم تھا جو شاہ ولی اللہ کے دور میں تھا۔ جب شاہ صاحب فوت ہوئے تو ان کے

بڑے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز کی عمر سترہ برس تھی اور وہ اسی عمر میں درس و تدریس اور رشد و ہدایت کے کام کی طرف متوجہ ہو گئے۔ شاہ عبدالعزیز کی سیاسی تحریک میں حصہ اور اس کی رہنمائی کی۔ تفصیلات میں جانے سے پہلے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز کا اپنے زمانے میں علمی استطاعت اور قابلیت کا کیا عالم تھا۔ اور کس طرح دانشور اور اہل علم کشاں کشاں شاہ عبدالعزیز کی طرف کھنچے چلے آتے تھے اور یہی کشش تھی جس نے شاہ عبدالعزیز کی شخصیت کو ایک نئے نظام کے لیے تحریک کا محور اور رہنما بنا دیا۔

علمی حیثیت

اس دور کے علماء کی علمی حیثیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز خود فرمایا کرتے تھے کہ جو علوم میں نے مطالعہ کیے ہیں، اور اپنی استعداد کے مطابق مجھے یاد بھی ہیں ان کی تعداد ایک سو پچاس ہے۔ ان میں سے نصف کے قریب ایسے علوم تھے جو امتِ اسلامی کی تخلیق تھے اور باقی نصف دوسری امتوں کے اور تو اور آپ فن موسیقی کے بھی ماہر تھے اور اس کے مختلف پہلوؤں سے پوری طرح آشنا تھے۔ مختلف گانوں اور راگوں کو پہچانتے تھے، یہی نہیں کہ امور مذہبی، حدیث و تفسیر اور فقہ میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتے تھے بلکہ ادب و شاعری میں بھی آپ کا درجہ بہت بلند تھا اور ادب کے نقاد آپ کو استاد تسلیم کرتے تھے اور یہ تو مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں بھی درج کیا ہے کہ شاہ نصیر دہلوی نے ذوق کی غزل درست کرنے سے انکار کر دیا تو ذوق دہلی کے سب اساتذہ کو چھوڑ کر آپ ہی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور جب آپ نے اس کی غزل کے متعلق تسلی کر دی تو ذوق نے کسی سے اصلاح لیے بغیر بے دھڑک اس غزل کو مشاعرے میں پڑھ ڈالا۔

اس سے بھی بڑھ کر ایک واقعہ کا ذکر سید ناصر نذیر "لال قلعہ کی ایک جھلک" میں بیان کرتے ہیں۔

کون نہیں جانتا کہ حضرت شاہ نصیر صاحب دہلوی اکبر شاہ ثانی اور

ابوظفر بہادر شاہ اور شیخ ابراہیم ذوق کے استاد تھے۔ جب شاہ نصیر صاحب کا ذوق سے دل کھٹا ہو گیا اور اصلاح موقوف ہوئی تو ذوق ہر جمعہ کو مولانا عبدالعزیز صاحب کے وعظ میں جانے لگے اور وعظ بہت غور سے سننے لگے۔ کسی دوست نے اس کا سبب پوچھا تو ذوق نے کہا استاد مجھ گنہگار سے ناخوش ہو گئے ہیں۔ شعر و سخن میں اصلاح ملتی نہیں اس کا بدل میں نے یہ نکالا ہے۔ کیونکہ شاہ عبدالعزیز صاحب اردو زبان دانی میں شاہ نصیر سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کے بیان اور گفتگو کو سنتا ہوں اور اردو کے محاورے روزمرہ یاد کرتا ہوں اس لیے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب اپنے والد ماجد کے حکم کے بموجب اردو زبان سیکھنے کے لیے خواجہ میر درد صاحب کی خدمت میں چھٹپن سے حاضر ہوتے تھے۔ اور چپ چاپ بیٹھے ہوئے ان کی تقریر سنا کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ اپنے بچوں سے کہا کرتے تھے کہ جس طرح اصولِ فقہ اور اصولِ حدیث فن ہے اسی طرح اصول زبان بھی فن ہے اور اردو زبان کے موجد اور مجتہد خواجہ میر درد ہیں۔ آپ کی صحبت کو اس فن کے واسطے غنیمت سمجھو کیونکہ خواجہ صاحب پکے پان ہیں۔ چنانچہ شاہ عبدالقادر تو خاص طور پر خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔"

اب جس خانوادے کی یہ حالت ہو کہ وہ ان لوگوں کو بھی متاثر کرے جو مذہب سے زیادہ شیفتگی نہ رکھتے ہوں تو ظاہر ہے کہ جب ایسے لوگ کوئی پیغام لیکر اٹھتے ہیں تو اس تحریک کا اثر کسی خاص حلقے تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس تحریک کی باتیں چار دانگ عالم میں مشہور ہوتی ہیں۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ کے خانوادے کی چلائی ہوئی تحریک کی کامیابی اور مقبولیت میں اس خانوادے کے علم و فضل کا بھی بہت بڑا حصہ تھا۔

اٹھارہویں صدی کے اس پرآشوب زمانے میں جب اس برصغیر میں قیامت بپا تھی اور بے یقینی اور بے سکونی نے عوام کو توہم پرستی، شرک اور بدعات کی انتہاء گہرائیوں میں اتار دیا تھا۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے نے سیاسی اور دینی تنزل دونوں کے خلاف آواز بلند کی اور ایک نئے فکر کی ترتیب میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ اس وقت دنیائے

اسلام کے دوسرے خطوں میں بھی حالات کچھ بہتر نہ تھے۔ دنیائے اسلام کے دوسرے گوشے بھی دورِ ابتلاء میں مبتلا تھے۔ سیاسی اور سماجی تنزل کے اثرات ان خطوں میں بھی نمایاں تھے چنانچہ اسی تنزل نے نجد میں محمد بن عبدالوہاب کو پیدا کیا۔ انھوں نے نجد اور خطے کے لوگوں کو ایک نیا فکر دیا۔ یہ وہی محمد بن عبدالوہاب ہیں جن کے فکر اور تعلیمات کو بدنام کرنے کے لیے برطانوی شہنشاہیت نے وہابیت کا نام ایجاد کیا اور ہر مسلمان کو جو برطانوی استعمار کے خلاف اس اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں میدان کارزار میں اترا اس کو وہابی کے نام سے موسوم کیا گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح شاہ ولی اللہ نے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک نیا ولولہ اور جوش اور حرارت پیدا کی۔ انھیں اسلام کی صحیح تعلیمات سے روشناس کرایا اور اسلام کی تعلیمات میں جو کھوٹا عنصر شامل ہوگیا تھا۔ جو توہم سرایت کر گئی تھی، جو بدعات اور مشرکانہ رسوم عوام کی زندگیوں کا معمول بن گئی تھیں ان کے خلاف فکری اور قلمی جہاد کا علم بلند کیا اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس وقت کے امراء اور بادشاہوں کو بھی راہ ہدایت دکھانے کے لیے اپنے افکار اور عوام کو اسلام کی طرف صحیح تعلیمات کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ بعینہ محمد بن عبدالوہاب نے نجد میں اعلائے کلمۃ الحق کے لیے اپنی زندگی وقف کی۔

محمد بن عبدالوہاب کا سن پیدائش بھی قریب قریب وہی ہے جو شاہ ولی اللہ کا ہے محمد بن عبدالوہاب ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ جبکہ شاہ ولی اللہ کا سالِ پیدائش ۱۷۰۴ء ہے ہندوستان کے برصغیر میں اس تحریک کے اثرات براہ راست پہنچے یا نہیں یہ ایک بہت ہی الجھا ہوا مسئلہ ہے۔ شاہ ولی اللہ کے پیروؤں اور ان کے عقیدت مندوں کا ایک گروہ اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ کسی نہ کسی دور میں اس تحریک سے ہندوستان کی تحریک کا واسطہ رہا ہے۔ لیکن دوسرا گروہ ایڑی چوٹی کا زور لگانے میں مصروف ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ احیائے دین جو تحریک اٹھارویں صدی میں جو تحریک نجد کے خطے میں مقبول ہوئی اور جس نے بہت جلد اس خطے کی کایا پلٹ کر رکھ دی اور ایک گوشے میں اپنی حکومت قائم کرلی

اس کا ہندوستان کی تحریک پر کوئی اثر نہیں پڑا اور نہ ہی کوئی رابطہ آپس میں قائم ہوا۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو یہ واقعہ ہے کہ ایک ہی دور میں دو تحریکیں مختلف خطوں میں ایک ہی قسم کی فکر پر استوار ہو رہی تھیں اس لیے اس تحریک کے جسے بعد میں وہابیت کا نام دیا گیا۔ اس کے خد و خال جاننے از بس ضروری ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ مدتوں تک سرکاری دستاویزات اور برطانوی شہنشاہیت کے ہمنواؤں نے ہندوستان کی اس تحریک کو وہابی تحریک کے نام سے پکارا ہے۔

محمد بن عبدالوہاب کا دور

محمد بن عبدالوہاب اٹھارہویں صدی کے پہلے سالوں میں نجد کے ایک مقام عینیہ میں پیدا ہوئے اس اٹھارہویں صدی کا وہ دور جس میں عبدالوہاب کا یہ بیٹا محمد پیدا ہوا تو اس کی حالت کا نقشہ ایک امریکی مصنف جس نے اسلام کی تاریخ پر خاصا کام کیا ہے کھینچا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس صدی میں مذہب بھی دیگر امور کی طرح پستی میں تھا۔ تصوف کے طفلانہ توہمات کی کثرت نے خالص اسلامی توحید کو ڈھک لیا تھا۔ مسجدیں ویران اور سنسان پڑی ہوئی تھیں۔ جاہل عوام ان سے بھاگتے تھے اور تعویذ گنڈے اور مالا کے چکر میں پھنسے ہوئے تھے۔ گندے فقیروں اور دیوانے درویشوں پر اعتقاد رکھتے اور بزرگوں کے مزاروں پر زیارت کو جاتے جن کی پرستش نائب خدا شفیع اور ولی کے طور پر کی جاتی۔ کیونکہ عوام میں یہ عقیدہ عام ہو گیا کہ خدا اتنا برتر ہے کہ اس کی پرستش کے لیے کسی نہ کسی کا واسطہ ہونا لازمی ہے۔ یہ مصنف آگے چل کر لکھتا ہے کہ مقامات مقدسہ مکہ و مدینہ بداعمالیوں کا مرکز بن گئے تھے اور حج جس کو رسول اللہ نے فرائض میں داخل کیا تھا۔ بدعات کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ فی الجملہ اسلام کی جان نکل گئی تھی۔ اگر محمدؐ پھر دنیا میں آتے تو اپنے نام لیواؤں کے ارتداد اور بت پرستی پر بیزاری کا اظہار کرتے۔

اسی زمانے کے متعلق عرب کی سیاسی صورت حال کے متعلق ایک دوسرے مغربی مصنف ہوگرافی لکھتا ہے کہ اٹھارہویں صدی میں مسلمانوں کا جوش سرد ہو چکا تھا۔ نام نہاد خلیفہ کی ساکھ گر چکی تھی اور مقبوضہ ممالک خلیفہ کی اطاعت کو برائے نام ہی تسلیم کرتے تھے یمن ایک صدی پہلے ہی یہ

جُوا اپنی گردن سے اتار چکا تھا۔ مکہ کے اشراف عیسائیوں کی نسبت اپنے سردار کے خلاف زیادہ سرگرم نظر آتے تھے۔ یہ یک جہتی جو آج دکھائی دے رہی ہے یہ اس وقت بالکل موجود نہ تھی اور روحانی مرکز مکہ مادی عیش و آرام کا شکار ہو چکا تھا۔ اور اس روحانی مرکز میں زہد و تقویٰ کے علاوہ ہر خاصیت کی افراط تھی حالانکہ ہندوستان میں عیسائیوں کی فتح نگاہوں کے سامنے تھی اور یورپ میں بھی غیر مسلم طاقتیں ترکوں کا پانسہ پلٹ رہی تھیں۔ لیکن عرب میں ان واقعات کا احساس بہت کم تھا یہ عام غیض و غضب جس کا اظہار بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں کیا جا رہا ہے اس وقت بالکل مفقود تھا۔ غرض کہ اس وقت اسلام کا رخ تنزل کی طرف تھا اور یہ تجدد جس کی لہریں بعد میں افریقہ اور چین تک پہنچیں اس وقت اس کی پیش بندی نہیں کی جا سکتی تھی۔

عرب کی اس صورت میں محمد بن عبدالوہاب کا بچپن گزرا اور اس کا اپنا علاقہ تو اس صورت حال کو مات کر چکا تھا اور یہاں تنزل کی پرچھائیاں اور بھی گہری تھیں اور اہلِ نجد اخلاقی انحطاط میں حد سے گزر چکے تھے مشرکانہ عقیدے صدیوں کے تسلسل سے اس طرح دلوں میں گھر چکے تھے کہ ایک بڑا طبقہ انہی خرافات کو دین کا صحیح نمونہ جانتا تھا اور غلط یا صحیح وہ اپنے آباؤ اجداد کی روش سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ وادیٔ حنیفہ کے مقام جبیلہ میں زید بن خطاب کی قبر کی پرستش ہوتی تھی۔ درعیہ میں بھی بعض صحابہؓ کے نام سے منسوب قبریں اور قبے عوام کی جاہلانہ عقیدت کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ وادیٔ نجبرہ میں ضرار بن زور کا قبہ بدعتوں کی نمائش گاہ بنا ہوا تھا۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بلیدۃ الفدا میں ایک پرانا درخت تھا مایوس اور نامراد عورتیں اپنی مرادوں کے حصول اور تمنائے اولاد میں اس درخت سے ہمکنار ہوتیں۔ اسی طرح درعیہ کے ایک غار میں شرمناک افعال کا ارتکاب ہوتا۔

یہ مذہبی اور دینی حالات تھے لیکن اس کے ساتھ قبائلی خانہ جنگی نے پورے نجد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کبھی امن و سلامتی پھر نہیں لوٹے گی۔ اس فضا میں محمد بن عبدالوہاب جوان ہوئے۔ چنانچہ ابھی شباب کی آمد آمد تھی کہ انھوں نے ان بدعات کے خلاف آواز بلند کرنی شروع کی اور اسی زمانے میں محمد بن عبدالوہاب نے اپنے دل سے پکا عہد

کرلیا تھا کہ وہ اپنی پوری زندگی بدعات کی روک تھام اور توحید و اخلاق کی تعلیم عام کرنے میں گزار دیں گے انھوں نے اپنی تعلیم کی بنیاد توحید کی پاکیزگی پر رکھی اور عبادت کسی قسم کی ہو صرف اللہ کی ذات کے ساتھ مخصوص کرنے پر زور دیا۔

محمد بن عبدالوہاب کی تعلیمات

شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تعلیمات اور ہندوستان کے علماء نے جو تحریک شروع کی ان میں بہت گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ محمد بن عبدالوہاب نے رسول اللہ کی سنت پر عمل پیرا ہونے اور خدا کی وحدانیت اور توحید پر اصرار کیا۔ انھوں نے لوگوں کو غیراللہ کے سامنے سرخم کرنے سے روکا۔ قبروں کے سامنے سر جھکانے اور سجدہ کرنے پر ٹوکا ولیوں سے مرادیں مانگنے کے سلسلے کو خلاف شرع ٹھہرایا اور بقول مسعود عالم ندوی کے قبروں کی زیارت میں مسنون طریقہ کے خلاف جو بدعتیں رائج ہوگئی تھیں۔ ان کو مٹانے کے لیے جب عملی قدم اٹھایا تو بس کیا تھا۔ مخالفت کا ایک سیلاب امڈ آیا۔ اعزہ واقرباء درپے آزار ہو گئے۔ خود باپ کو بھی یہ ادا پسند نہ آئی شیخ نے باپ کے ادب اور استاد کی عزت کا پورا لحاظ رکھا۔ پر جو قدم آگے بڑھ چکا تھا وہ پیچھے نہ ہٹا۔ ایذارسانی حد سے بڑھ گئی پر صبر و عزیمت کا کوہ وقار اپنی جگہ سے نہ ٹل سکا۔ تمام رکاوٹوں کے باوجود انھوں نے اپنی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا اور عارض کے تمام قصبات حریملا، عینیہ، رعیہ، ریاض وغیرہ میں ان کی شہرت پھیل گئی۔

۱۷۴۰ء میں جب محمد عبدالوہاب کی عمر صرف ۲۷ برس تھی تو والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس وفات نے شیخ کے راستے سے مخالفت کی ایک بڑی دیوار ہٹا دی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی دعوت اور تبلیغ کی رفتار تیز کر دی اور اسی دوران میں انھوں نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف التوحید تصنیف کی۔ لیکن شیخ نے محسوس کیا کہ اگر علاقے میں خانہ جنگی اور لڑائیاں رہتی ہیں تو اس وقت تک احیائے دین کی تمام کوششیں ناکام ہو جائیں گی۔ چنانچہ انھوں نے پورے نجد کو ایک امیر اور ایک پرچم کے نیچے متحد کرنے کا ارادہ کر لیا اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے وہ سیاست کی وادی

خانزار میں قدم رکھنے پر مجبور ہوئے ہیں اور یہ اقدام بھی شاہ ولی اللہ کے اقدام سے کس قدر مماثلت رکھتا ہے اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ جس طرح شاہ ولی اللہؒ نے مختلف امیروں نوابوں اور بادشاہوں کے نام خطوط لکھے۔ بالکل اسی طرح محمد بن عبدالوہاب نے خطوط لکھے اور ان کو اسلامی تعلیمات کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دی کیونکہ وہ شاہ ولی اللہ کی مانند یہ سمجھتے تھے کہ کسی امیر یا حاکم کی مرضی حاصل کیے بغیر اپنی تعلیم کو دور، نزدیک پھیلانا آسان نہ ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے عینیہ کے امیر عثمان کے نام مکتوب لکھا کہ اگر تم لا الہ الا اللہ کی امداد کو آمادہ ہوجاؤ تو میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تمھیں غالب کرے گا اور نجد اور اہلِ نجد کی باگ تمھارے ہاتھوں میں ہوگی۔ اس مکتوب کا اثر ہوا اور عثمان بن محمد نے شیخ کی تعلیم کو قبول کیا اور پوری امداد کا وعدہ کیا۔ چنانچہ شیخ نے اس علاقے میں بدعات کے تمام اڈوں کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس علاقے میں بعض درختوں کو مقدس گردانا جاتا تھا ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا وہاں زید بن خطاب کی قبر پر ایک قبہ تھا اس کو بھی گرایا گیا۔ ابن بشر اس قبہ کے گرانے کے واقعہ کی تفصیل دیتے ہوئے لکھتا ہے۔

شیخ نے عثمان سے کہا آؤ اب، اس قبہ کو منہدم کردیں جس کی بنیاد باطل پر رکھی گئی ہے اور جس کی وجہ سے لوگ راہ ہدایت سے بھٹک جاتے ہیں۔ عثمان نے کہا کہ آپ ہی اسے گرادیں۔ شیخ نے کہا کہ ہمیں اہل جبیلہ سے خطرہ ہے کہیں وہ ہمارے درپے آزار نہ ہوجائیں آپ کی موجودگی کے بغیر نہیں گرا سکتے۔ اس پر عثمان چھ سو سپاہیوں کو لے کر شیخ کے ہمراہ گیا۔ جب قبر کے قریب پہنچے تو اہل جبیلہ نے انھیں روکنے کی کوشش کی عثمان کی فوج کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ یہاں پہنچ کر عثمان نے کہا کہ شیخ آپ ہی اس قبہ کو گرائیں۔ چنانچہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نے اپنے ہاتھ سے پتھر اٹھایا اور اس قبہ کو گرادیا۔ جبیلہ کے عوام کا خیال تھا کہ جس نے بھی اس قبہ کو ہاتھ لگایا وہ کسی نہ کسی آفت کا شکار ہوجائے گا۔ اور اس انتظار میں تھے کہ یہ شیخ محمد بن عبدالوہاب بھی کسی نہ کسی آسمانی آفت کا شکار ہوگا۔ لیکن رات گزر گئی اور شیخ پر کوئی آفت نہ آئی۔

مخالفت اور اخراج

عینیہ میں شیخ کو جو کامیابیاں ہوئیں اور جس مقبولیت نے قدم چومے اس سے ایک حلقے میں بغض و عناد کی چنگاریاں سلگ اٹھیں چنانچہ ایک واقعہ ایسا رونما ہوا جس نے اس علاقہ میں تہلکہ مچا دیا اور اس علاقہ میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک شادی شدہ عورت گناہ کی مرتکب ہوگئی۔ جب اس کو شیخ کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے اپنے گناہ کا اقرار کر لیا۔ چنانچہ شیخ نے اسے سنگسار کرنے کے احکام جاری کر دیے اور سب سے پہلا پتھر خود امیر عثمان نے اس عورت پر پھینکا۔ اس سزا نے پورے علاقہ میں کہرام مچا دیا اور لوگوں نے سلیمان بن محمد کے دربار میں شکایت پہنچائی کہ اس طرح سختی کی جا رہی ہے سلیمان بن محمد خود ایک ایک رنگین مزاج بادشاہ تھا۔ چنانچہ اسے خطرہ پیدا ہو گیا کہ اگر محمد بن عبدالوہاب کی پابندیٔ شریعت کا یہی عالم رہا تو وہ دن دُور نہیں جب احتساب کا ہاتھ اس کے گریبان تک بھی پہنچنے لگے گا۔ چنانچہ اس نے عثمان امیر عینیہ کو کہلا بھیجا۔

"یہ مولوی جو تمھارے ہاں مقیم ہے اس نے ایسے ایسے کام کیے ہیں کہ اس کا قتل لازمی ہو گیا ہے۔ اس کو فوراً قتل کیا جائے ورنہ ہمارے سے جو کچھ ملتا ہے سب روک دیا جائے گا۔"

دربار کے ان احکام نے امیر عثمان کو پریشان کر دیا اور اس کو وہ بارہ سو دینار جو اس کو دربار سے ملتے تھے بہت اہم محسوس ہونے لگے۔ چنانچہ اس نے شیخ کو پیغام بھیجا کہ وہ عینیہ چھوڑ دیں۔ لیکن شیخ نے جواب بھیجا کہ میں جو پیغام لے کر کھڑا ہوں اور جس کی دعوت دے رہا ہوں وہ ارکان اسلام اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی دعوت ہے اگر تم اس کو مضبوط پکڑ لو اور اس کی مدد کرو تو اللہ تعالےٰ تمھیں تمھارے دشمنوں پر غالب کرے گا اور تمھیں سلیمان کے احکام سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔

لیکن امیر عثمان ہمت ہار چکا تھا۔ اس پر سلیمان کا رعب طاری ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس نے

ایک سپاہی فرید الظفیری کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ سلیمان نے ہمیں آپ کو قتل کا حکم دیا ہے اور ہم میں آپ کے حکم سے سرتابی کرنے کی جرأت نہیں۔ نیز یہ ہماری مروت سے بعید ہے کہ آپ کو اپنے گھر میں تہہ تیغ کر دیں اس لیے آپ آزاد ہیں۔ علاقہ ہمارا چھوڑ دیں چنانچہ شیخ نے عینیہ کو خیرباد کہا اور درعیہ کی راہ لی اور یہاں ہی شیخ اور خاندان سعود میں رفاقت کا سلسلہ شروع ہوا اور مدت تک قائم رہا۔ اس رفاقت نے نئے نجد کو ہی نہیں بلکہ نئے عرب کو جنم دیا اور ایک ایسی تحریک پروان چڑھی جس کے خلاف الزام واتہام کے لیے کئی ایک طاقتوں نے متحد ہو کر منصوبہ بندی کی اور وہابیت کا لفظ بطور گالی کے اختراع کیا گیا۔

سیدھی سادی اسلامی تعلیمات حکمرانوں کے غیض وغضب کی وجہ کیوں بنتی رہیں یہی نہیں بلکہ اٹھارہویں صدی میں جتنی بھی عوامی تحریکیں منظم ہوئیں اور جنھوں نے بھی مسلم عوام کو متاثر کیا ان تحریکوں کی اساس اسلامی تعلیمات کی سادگی ہی بنی اور صرف یہی نہیں بلکہ ان تحریکوں نے خدا کی توحید کے حق میں اور مشرکانہ رسوم کے خلاف آواز بلند کی اور لوگوں کو سادہ زندگی بسر کرنے کی تلقین کی اب یہ سیدھی باتیں کہ خدا ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں، اس کے رسول ؐ کی سُنت اور احکام کا تتبع ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اللہ تک پہنچنے کے لیے انسان کے عمل کام آتے ہیں۔ اب یہ سیدھی سادی تعلیمات کیوں پریشانی کا باعث بنتی رہی ہیں۔ اس کا جواب فقط ایک ہے کہ یہ تعلیمات ایک مخصوص سیاسی پس منظر میں پورے معاشرے میں انقلاب کی بنیاد بن جاتی تھیں جب ایک مزارع صرف خدا کی عبادت کرتا ہے اس کے دل میں یہ جاگزیں ہو جاتا ہے کہ صرف خدائے بزرگ و برتر ہی خالق ہے اور یہ سب زمین و آسمان اس کے تخلیق کردہ ہیں اور اس کے سامنے اس کی تمام مخلوق برابر ہے تو پھر یہ مزارع زمیندار سے کیوں ڈرنے لگا یہ اپنے حاکم کی ناانصافیوں پر کیوں خاموش رہنے لگا۔ یہ اپنے حقوق کیوں غصب ہوتے دیکھنے لگا۔ جب یہ ہر بات کو اسلام کی تعلیمات پر پرکھے گا تو ظاہر ہے پھر تمام بناوٹی پردے جو ان تعلیمات پر ڈالے گئے ہیں وہ اس کے پاؤں کی زنجیر نہیں بن سکیں گے اسی لیے ان تمام حاکم گروہوں

اور طبقوں نے ایسے تمام مفکروں اور ان کی تعلیمات کی مخالفت کی کیونکہ انکی اپنی بنیاد عوام کے استحصال اور توہم پرستی پر تھی جن کا دارومدار استعمار پرستوں کی حمایت پر تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب بعد میں یہاں پر علماء نے برطانوی استعمار کے خلاف جدوجہد کا اعلان کیا گیا تو ان کو وہابی کے نام سے ہی پکارا گیا اور پھر بعد میں وہابیت ایک گالی قرار پائی اور اس سلسلے میں تو سب سے اہم شہادت تو خود ولیم ہنٹر کی ہے جس نے سید احمد شہید کی تحریک کے خلاف بے پناہ غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے اور اس نے ان کے خلاف اپنا تمام غصہ انھیں وہابی کہہ کر نکالا ہے چنانچہ اس نے وہابی تحریک کی جو تاریخ بیان کی ہے اس میں وہ لکھتا ہے۔

ایک سو پچاس برس ہوئے ایک نوجوان عرب حاجی جس کا نام عبدالوہاب تھا اور جو نجد کے ایک معمولی سردار کا بیٹا تھا۔ اپنے ہمراہی حاجیوں کی بدمعاشی اور ریاکاری سے جس سے اماکن مقدسہ کی بے حرمتی کی جارہی تھی۔ سخت دلگیر ہوا۔ وہ تین سال تک دمشق میں ان بدعات پر غور کرتا رہا۔ جو مذہب اسلام میں داخل ہو چکی تھیں اور آخر کار ان بدعات کے انسداد کے لیے میدان عمل میں نکل پڑا۔ لیکن حکومت قسطنطنیہ کے کار پرداز نے اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ کیونکہ اس نے ترکی علماء پر الزام رکھا تھا کہ ان کے اعمال و افعال نے شرعی تعلیم کو بالکل بے کار کر دیا ہے۔ لہذا عبدالوہاب کو شہر بہ شہر سے خارج ہونا پڑا۔ آخرالامر اس نے درعیہ کے سردار محمد بن سعود کے ہاں پناہ لی اور اسے اپنے عقائد اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے بعد سردار مذکور کو اس کے گناہوں پر ملامت کی۔ یوں بہت جلد کئی ایک برائیاں دور کرنا ان کے لیے مقدر بن گئیں۔ اپنے نئے مرید سے مل کر جس کی بیٹی سے عبدالوہاب نے شادی کر لی تھی۔ اس نے ایک مختصر سے علاقہ میں کب مملکت کی بنیاد رکھی اور قسطنطنیہ کی حکومت کی غلط کاریوں کے خلاف احتجاج و بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا۔ اب انھیں فتح پر فتح ہو رہی تھی اور وہ بدوی بھی جنھوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم کو رسولؐ نہ جانا اور قرآن کو خدا کا کلام نہ سمجھا تھا۔ ان کے اصلاحی جھنڈے کے نیچے آ جمع ہوئے۔ نجد کا بہت سا حصہ فتح ہو گیا۔ عبدالوہاب اس کا روحانی پیشوا تھا اور اس کا خسر محمد ابن سعود دنیاوی حاکم۔ انھوں نے مطیع شدہ صوبجات

میں اپنے نائب مقرر کیے اور ان کو سختی کے ساتھ اپنا اطاعت گزار بنائے رکھا۔ سعودی قوم کا جرگہ امن کے زمانہ میں قانونی اور دینی امور سر انجام دیتا لیکن جنگ کے زمانہ میں ایک جنگی کونسل کی حیثیت اختیار کر لیتا۔

تھوڑے ہی عرصہ بعد اس نئی سلطنت نے نہایت دلیری کے ساتھ ترکی سلطنت پر حملہ کر دیا ۱۷۴۸ء میں بغداد کا بادشاہ جو کبھی وزیر اعظم رہ چکا تھا۔ اس تحریک کے خلاف عملی قدم اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔ کیونکہ یہ تحریک آخر کار خلیفوں کے نااہل جانشینوں کو باب عالی سے نکال دیتی اور ایک نئی مسلمان سلطنت کی بنیاد رکھتی ان مصلحین نے اپنے آپ کو سول حکومت میں ہر جگہ ایسا ہی قابل ثابت کیا جیسا کہ لڑائی میں فاتحین کی حیثیت سے کیا۔ انھوں نے خانہ بدوش عربوں کو جن پر ان کی قوت کا دارومدار تھا۔ ایک مستحکم وفاق میں جکڑ دیا۔ زکوٰۃ کا باقاعدہ انتظام کیا جنگ کے زمانہ میں مالِ غنیمت کا ۵/۴ حصہ تو سپاہیوں کو ملتا اور ۵/۱ حصہ بیت المال میں جمع ہوتا۔ مال گزاری جس کو قرآن میں خیرات کہا گیا ہے سختی کے ساتھ وصولی کی جاتی تھی۔ وہ زمین جو بارش یا دریا سے سیراب ہوتی تھی۔ اس پر سالانہ آمدنی پر بیسواں حصہ مقرر ہوا تمام تاجروں کو اپنے اصل سرمایہ کا ڈیڑھ فیصد دینا پڑتا تھا۔ باغی اور تفرقہ انداز شہر اور صوبے بھی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ تھے۔ پہلی بغاوت کی سزا عام لوٹ مار تھی جس کا پانچواں حصہ بیت المال میں جاتا تھا۔ دوسری بغاوت یا ارتداد پر وہ تمام زمین جس پر شہر بسا ہوا ہو اور اس کے اردگرد کی تمام زمین جو اس شہر سے متعلق ہو، وہابی سردار کی ملکیت ہو جاتی۔ چنانچہ مصلحین کی یہ جماعت قدرتاً ایک جنگ جو فرقہ تھا، اور نہایت دلیری سے اپنے عقائد کو تلوار کے ساتھ منواتا تھا۔ اس لیے یہ آمدنی کا نہایت ہی قیمتی ذریعہ تھا جو ہر سال دو یا تین لڑائیوں کے ذریعے حاصل کر لی جاتی۔

وہ عقائد جن کو انھوں نے اس طرح خون کے ساتھ لکھا۔ بذات خود نہایت شریفانہ تھے سب سے پہلے جس چیز کو انھوں نے اہمیت دی وہ اخلاق کی عملی اصلاح تھی۔ ترکوں نے اخلاقی برائیوں کو مقدس شہروں میں بھی پھیلا دیا تھا۔ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے پر بھی قناعت

نہ کرتے وہ حاجیوں کے قافلے میں بداطوار عورتوں کو بھی لے آتے تھے۔ یہی وہ عملی اور ظاہری خرابیاں تھیں جن کے خلاف عبدالوہاب نے سب سے پہلے آواز اٹھائی۔ مگر آہستہ آہستہ یہ ایک دینی فرقہ بن گیا۔ جو وہابیت کے نام سے مشہور ہو گیا۔ ہندوستانی لوگوں کا بھی بڑی حد تک یہی عقیدہ ہے"۔ یہ تفصیلی اقتباس صرف اس لیے دیا گیا ہے کہ انگریزوں کی رائے اس مسلک کے بارے میں ظاہر کر دی جائے اور اس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ یہ استعمار پرست کس طرح مذہبی جذبات اور توہم کو اشتعال دلا کر تحریکوں کو بدنام کرنے کا فریضہ سرانجام دیا کرتے تھے۔

برطانوی استعمار کی محمد بن عبدالوہاب کی تحریک سے مخاصمت خاصی پرانی ہے۔ کیونکہ جیسے ہی آلِ سعود نے نجد اور بعد میں جزیرۃ العرب کو ایک مضبوط اور مستحکم حکومت کے جھنڈے تلے مجتمع کرنے کی مہم شروع کی تو ایک طرف ترکی اور دوسری طرف برطانیہ مشتعل ہو گئے ترکوں کے اشتعال کی وجہ ان کی اپنی سیادت کا خاتمہ تھا اور برطانوی حکومت کے غیض و غضب کی وجہ عربوں کا اتحاد تھا۔ کیونکہ اگر جزیرۃ العرب میں کوئی پائدار اور مستحکم حکومت قائم ہو جاتی ہے تو ان حالات میں برطانیہ کی ریشہ دوانیوں کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ محمد بن عبدالوہاب کی تعلیمات نے امیر سعود بن عبدالعزیز کو ایک ایسا فرمانروا بنا دیا جس کو سیادت، اور جنگ دونوں میں فتح حاصل ہو رہی تھی۔ اس کی فرمانروائی کے متعلق خود انگریز مصنف برٹ ہاورٹ لکھتا ہے کہ "غالباً پیغمبر اسلام کے بعد پہلی بار ملک میں ایسا امن و امان قائم ہوا کہ بدوؤں کو اپنے مال و متاع اور اپنے مویشیوں کی طرف سے بے فکر ہو کر آرام سے سونے کا موقع ملا۔ اور اس کے رعب کا یہ عالم تھا کہ ایک معمولی حبشی ملازم بڑے بڑے قبیلے کے سرداروں کو یکہ و تنہا گرفتار کر کے درعیہ لے آتا تھا۔

اس پائدار حکومت کے خاتمہ کے لیے ایک طرف مصر کا محمد علی پاشا مورچے قائم کر رہا تھا تو دوسری طرف انگریز اس کو امداد دینے کے لیے ہر امکانی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ ایک طرف محمد علی پاشا کے حکم پر جون ۱۸۱۹ء کو درعیہ جو اس وقت سعود کی نجدی حکومت کا

دارالحکومت تھا کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ مصری فوج نے سارا شہر کھود کر پھینک دیا۔ تمام باغ جڑ سے کاٹ ڈالے۔ بوڑھے، بچے، مزدور، اور بیمار سب یکساں عذاب کا شکار ہوئے، گھروں میں آگ لگادی گئی اور چند روز میں لہلہاتا ہوا باغ جل کر خاک ہو گیا۔

برطانوی امداد کی پیش کش

برطانیہ کی شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک اور اس کے نام لیواؤں اور پیروؤں سے دشمنی کی کی داستان بھی اسی زمانے سے شروع ہوتی ہے جب سعود بن عبدالعزیز ایک مستحکم حکومت قائم کرنے کے لیے میدان کارزار میں مصروف جہاد تھا۔ چنانچہ مصریوں نے سعود کے بیٹے عبداللہ کو شکست دی اور درعیہ کو تباہ و برباد کر دیا۔ تو مصری حاکم محمد علی پاشا کے بیٹے ابراہیم کو جس کے ہاتھوں درعیہ تباہ و برباد ہوا تھا، مبارکباد دینے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا ایک خاص وفد روانہ کیا۔ اس وفد کی قیادت کپتان فارسٹر سیڈلیئر کر رہا تھا۔ یہ مبارک باد کیوں؟ یہ راز بھی بعد میں خاصا آشکارا ہو گیا تھا اور اس کی تہہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مفادات کام کر رہے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو کافی دنوں سے خلیج فارس کے ساحلوں پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی خواہش پریشان کر رہی تھی اور جب اس نے محمد بن عبدالوہاب کی تعلیمات کے زیر اثر نجدی حکومت کو مستحکم ہوتے دیکھا تو کمپنی کو سخت پریشانی لاحق ہوئی۔ کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی محسوس کر رہی تھی کہ اس کے تجارتی جہاز اب محفوظ نہیں رہیں گے ان کی آمد و رفت نجدی حکومت کے رحم و کرم پر ہو گی۔ چنانچہ اس کپتان سیڈلیئر کے وفد کی کارگزاری کے متعلق عرب میں مغربی شہنشاہیت کے عمل دخل کا ایک مورخ لکھتا ہے

"مصریوں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی طرح کا مشورہ کیے بغیر بمبئی سے ۱۸۱۹ء کے موسم گرما میں ایک برطانوی جنگی جہاز خلیج فارس کی طرف بھیجا گیا۔ اس پر سرکار کی سینتالیسویں بٹالین کا ج ف سیڈلیئر ایک خاص قاصد کی حیثیت سے ساتھ تھا۔ اس کپتان فارسٹر کی مہم کا مقصد ابراہیم پاشا کو درعیہ کے زیر کرنے پر مبارک دینا اور اس سے مل کر وہابی تحریک کے استیصال کا مناسب انتظام کرنا تھا۔ اس افسر کے ہدایت نامے کے مزید فقرے یہ ہیں۔ "اگر جیسا کہ غالباً صورت حال ہو۔ پاشا برطانوی حکومت کی

امداد سے فائدہ اٹھانا چاہے تو ایک مکمل اور مضبوط بحری فوجی طاقت جلد از جلد بھیجی جائے گی اور ترکوں کو راس الخیمہ کا قبضہ دیا جائے گا۔ لیکن تاریخ میں بہت کم ایسے خفیہ مشن ناکام رہے ہوں گے جیسا کہ یہ سیڈلیئر مشن ناکام رہا۔ اب اس تحریک کے خلاف جھوٹ اور افترا پردازی کا ایک طومار کھڑا کیا گیا ہے اور ظاہر ہے جو بھی تحریک کسی استعماری طاقت کے خلاف کھڑی ہوگی۔ اس کے خلاف استعماری طاقتیں اپنی مشنری حرکت میں لے آئیں گی اور اس پروپیگنڈے میں لاتعداد لوگ پھنس جاتے ہیں چنانچہ یہی اس تحریک کے ساتھ ہوا۔ کیونکہ اس تحریک سے بالآخر ترکوں اور مصریوں کی سیاست پر چوٹ پڑتی تھی۔ اس لیے ترکوں نے دنیائے اسلام میں جی کھول کر پروپیگنڈا کیا اور اس پروپیگنڈے کی اساس مذہب کو بنایا اور اسی پروپیگنڈہ کو برطانوی حکومت نے ہندوستان میں شاہ ولی اللہ کے خانوادے کی چلائی ہوئی تحریک کے خلاف استعمال کیا مقصد یہی تھا کہ اس تحریک کو اجتماعی مقاصد سے ہٹا کر محدود فقہی مسائل میں الجھا دیا جائے اور مسلمان عوام بجائے اس کے کہ بیرونی طاقتوں کے خلاف جہاد کی باتوں کی طرف دھیان دیں۔ ان کو رفع یدین اور آمین بالجہر کے جھگڑوں میں الجھا دیا جائے اور تحریک سے غلط باتیں منسوب کر کے ان کو دائرہ اسلام سے خارج کروایا جائے تاکہ اس کے بعد ان کے جہاد کے پیغام کی طرف کوئی کان دھرنے کے لیے ہی تیار نہ ہو۔ چنانچہ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک کے متعلق جو غلط بیانیاں پھیلائی گئیں اس کے متعلق ایک انگریز مصنف برانجس نے لکھا ہے۔ ترکوں کے باب عالی نے مشہور کیا کہ سعود بن عبدالعزیز نے زائرین کو مدینہ منورہ کی زیارت سے روک دیا۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس نے صرف روضہ مطہرہ کے سامنے مشرکانہ اعمال کے ارتکاب سے منع کیا جیسا کہ دوسرے ولیوں اور صحابہؓ کی قبروں پر عبادت کی بندش کر چکا ہے۔ بعض جاہل انھیں کافر سمجھتے ہیں۔ انہی افواہوں پر ترکوں نے اعتماد کیا۔ مکہ کے امراء نے بھی ان افواہوں کو ہوا دی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ قرآن و حدیث پر پوری طرح عامل ہیں۔

برک ہارٹ نے صحیح لکھا ہے کہ یہ سب غلط فہمیوں کا نتیجہ ہے اور دراصل میں محمد بن عبدالوہاب کی تحریک اسلام کے اندر ایک قسم کی تطہیر کی تحریک تھی۔ ایک بے وقوف فرانسیسی نے ۱۸۰۸ء میں لکھا تھا کہ یہ محمد بن عبدالوہاب کوئی نیا مذہب ایجاد کر رہے ہیں نیز وہ سعود کے خاص آدمی

کے حوالہ سے حج کی منسوخی کا بھی ذکر تا ہے لیکن حقیقت میں یہ سب جھوٹ تھا۔ وہاں قرآن کی طرح حدیث کو بھی بنیادی حیثیت دی جاتی اور ان میں بیان کردہ احکام کی بھی اطاعت لازم قرار دی جاتی البتہ اولیاء اور انبیاء کو انسان تسلیم کرنے پر اصرار کیا جاتا اس کے علاوہ منشیات کے خلاف بھی مہم چلائی جاتی۔ امام مالک کے ہاں تمباکو نوشی کی ممانعت ہے چنانچہ محمد بن عبدالوہاب نے بھی اسے ممنوع قرار دیا۔ البتہ قہوہ کے امتناع کے بارے میں ترکوں نے جو پروپیگنڈہ کیا وہ غلط تھا اور صرف لوگوں کو بدظن کرنے کے لیے عام کیا گیا اسی طرح سے جس طرح بے وقوف فرانسیسی مؤرخ نے حج کے تعطل کا ذکر کیا ہے اسے جاننا چاہیئے تھا کہ سعود نے حج سے متعلق بعض رسُوم کو روکا تھا۔ مکّہ میں داخلہ کے بعد اس نے جو پہلا کام کیا وہ طواف و عمرہ کی ادائیگی تھی۔"

یہ باتیں کسی وہابی اور سعودی نے نہیں لکھیں بلکہ یہ ایک انگریز مصنف نے لکھی ہیں لیکن ان سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ کس طرح مختلف تحریکوں کو بدنام کرنے کے لیے حاکم طبقہ کیا کیا حربے استعمال کرتا ہے اور یہی حربے پاک و ہند کے برصغیر میں کل بھی استعمال کیے جاتے تھے اور آج بھی کیے جاتے ہیں لیکن ایک بات ہمیشہ ذہن میں رہنی چاہیے کہ پراپیگنڈہ کے تیروں کے استعمال میں صرف حاکم طبقہ ہی پیش پیش نہیں ہوتا بلکہ دوسرے بہت سے گروہ بھی اس پروپیگنڈے کی مہم میں شریک ہو جاتے ہیں ان میں شامل حالی موالیوں کا وہ گروہ بھی شامل ہوتا ہے جن کی زندگی اور موت کا دارومدار ہی حکمران طبقہ کی خوشنودی خوشامد اور چاپلوسی میں ہوتا ہے صرف یہی نہیں بلکہ اس مہم میں وہ گروہ بھی پیش پیش ہوتے ہیں جن کے مفادات پر ان نئی تحریکوں سے چوٹ پڑتی ہے اور اس مہم میں اکثر خود سادہ لوح عوام بھی شریک ہوتے ہیں جو دیانتداری سے اس پراپیگنڈہ کو درست اور صحیح تسلیم کر لیتے ہیں اور اس سے شدید طور پر متاثر ہونے لگتے ہیں اور اس طرح سے وہ غیر شعوری طور پر حاکم طبقہ کے فریب کا ایک فعال حصہ بن جاتے ہیں۔

باب ۱۳

برطانوی تسلّط اور

شاہ عبدالعزیزؒ

انگریز اور کفّار کی عملداری میں آنے والا ملک دارالحرب ہے

——— شاہ عبدالعزیز

وہابی تحریک یا محمد بن عبدالوہاب کی تعلیمات اور جد وجہد نے یقینی طور پر اس دور کے علماؔ اور شاہ ولی اللہ کے خانوادے کو متاثر کیا تھا اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ محمد بن عبدالوہاب کو اپنی دینی تحریک کو عملاً سیاسی رنگ دینا پڑا تھا۔ کیونکہ اس تحریک اور ایک آزاد و متحد نجدی حکومت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اور مزاحمت برطانوی استعمار کی طرف سے ہی پیش آرہی تھی۔ چنانچہ یہ قدر مشترک تھی جو اس برصغیر کے علماء اور محمد بن عبدالوہاب کو بہ امرِ مجبوری اپنانی پڑی کیونکہ یہی وہ دور تھا جب اس برصغیر کے شمالی حصّے میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط تیزی سے بڑھ اور پھیل رہا تھا۔ چنانچہ جو عمل بنگال اور مدراس میں نصف صدی پہلے شروع ہوگیا تھا اس کا سایہ اب شمالی ہند میں پڑنا شروع ہوگیا تھا۔ چنانچہ یہ نئے حالات تھے جن میں شاہ ولی اللہ کے بڑے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز کو نئی راہیں تلاش کرنی پڑیں اور شمالی ہند میں انھوں نے نہ صرف ایک نئی راہ کی طرف اشارہ کیا بلکہ ایک نیا نعرہ دیا۔ یہی نعرہ ڈیڑھ صدی تک پاک و ہند کے مسلمانوں کو متاثر نہیں بلکہ متحرک کرتا رہا اسی نعرہ نے یہاں بعض عظیم الشان قومی تحریکوں کو جنم دیا اور درآصل یہی نعرہ تھا جس کے گرد مسلمانوں

کی فکری تحریکوں کا تانا بانا بنا۔ اگر اس ڈیڑھ صدی کے مسلمانوں کے افکار کا بغور مطالعہ کیا جاتے تو بالآخر یہی ایک نعرہ ایک قوت محرکہ کی صُورت میں سامنے آئے گا۔ مُسلم مفکرین نے اس نعرے کی حمایت میں اپنا فکر ترتیب دیا یا پھر اس کی مخالفت میں، لیکن ایسا فکر شاذ ہی ہو گا جو اس صدی، ڈیڑھ صدی میں ابھرا، اور وہ اس نعرے سے مُتاثر نہ ہوا یا اس نے اس نعرے سے بے نیازی برتی ہو۔

شاہ عبدالعزیز نے اپنے بچپن سے ہی برطانوی شہنشاہیت کے بڑھتے ہوتے قدموں کی چاپ سننی شروع کر دی تھی اور جیسے جیسے وہ جوانی کی دہلیز پر پہنچتے گئے ویسے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے نفرت انگیز اور انسانیت سوز مظالم کے قصے اور وحشت و بربریت کی طویل کہانیاں زبان زد عام و خاص ہونے لگی تھیں۔ شروع شروع میں ایک موہوم امید ضرور تھی کہ بادشاہ اور صُوبہ جات کے نواب و روساء وغیرہ ان بدیسی تاجروں کا قلع قمع کر دیں گے اور شاید ان میں سے کوئی مستحکم حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن پلاسی اور پھر بکسر کی جنگوں نے پانسہ بالکل پلٹ دیا۔ امیدوں کے ٹمٹماتے چراغ بجھنے لگے اور ایک ایک کر کے مختلف علاقے نوابوں کے ہاتھوں سے نکلنے شروع ہو گئے۔ بالآخر ۱۸۰۳ء میں اعلان ہو گیا کہ :-

"خلق خدا کی، مُلک بادشاہ سلامت کا، حُکم کمپنی بہادر کا۔"

یہ نئی صُورتِ حال تھی جس کا سامنا خانوادہ شاہ ولی اللہ کو کرنا پڑا۔ اب کوئی احمد شاہ ابدالی نہ تھا جو اس تاریک فضا میں امید کی شمع روشن کرتا، کوئی ایسا ذی نفس نہ تھا جس کی کمر سے ایسی تلوار بندھی ہوتی جو دشمنوں کے نشیمنوں پر بجلی بن کر گرتا۔ اس وقت خود اس خانوادے کو میدان میں نکلنا پڑا۔ اور ایک تحریک منظم کرنا پڑی۔ جس کی قیادت کسی صاحبِ شمشیر کے ہاتھ میں نہ دی جا سکتی تھی بلکہ اس کی قیادت خود اسی خانوادے کو سنبھالنا پڑی اور یہ طے تھا کہ آئندہ سے ان کی اپنی قیادت اور ان کا اپنا فکر اور عوام کی تائید و حمایت ہی ایک تحریک کو جنم دے سکیں گے انیسویں صدی کا سورج طلوع ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی آلِ تیمور کا آفتاب غروب ہونے کو تھا۔ شاہ عالم ثانی تختِ دہلی پر متمکن تھا۔ لیکن اس کی حیثیت کاٹھ کی

پتلی کی تھی جس کی ڈوری ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں تھی اور ہندوستان کے اکثر علاقوں پر ان کی عمل داری تھی۔

دار الحرب ہونے کا اعلان

یہ دور تھا جب خانوادہ شاہ ولی اللہ کے مسند نشین شاہ عبدالعزیز نے اپنی جسمانی کمزوری اور ضعف بینائی کے باوجود اعلان کیا کہ یہ سرزمین دار الحرب ہے انھوں نے فتویٰ دے دیا۔

"اس شہر میں امام المسلمین کا حکم قطعاً جاری نہیں۔ روسائے نصاریٰ کا حکم بلا دغدغہ اور بے دھڑک جاری ہے اور نافذ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ملک داری، انتظامات رعیت، خراج، باج، عشر، مال گزاری، اموال، تجارت، ڈاکوؤں اور چوروں کے انتظامات سندات، کا تصیفہ جرائم کی سزا وغیرہ میں کافر بطور خود حاکم ہوں۔

ہاں اگر اسلام کے چند احکام جیسے جمعہ، عیدین، اذان، ذبح گاؤ وغیرہ میں تعرض نہ کریں تو اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا دار الحرب بدستور باقی رہتا ہے۔ لیکن ان چیزوں کا اصل اصول ان کافروں کے نزدیک بے کار اور قطعاً بے حقیقت ہے کیونکہ مساجد کو بلا تکلف شہید کرتے ہیں اور کوئی مسلمان یا کافر رعایا ذمی ان سے امن اور اجازت حاصل کیے بغیر اس شہر اور اس کے نواح میں نہیں آسکتا۔ اپنے نفع کے واسطے آنے والوں اور مسافروں اور تاجروں سے مخالفت نہیں کرتے دوسرے حکام جیسے شجاع الملک، یا ولایتی بیگم ان نصاریٰ کے حکم بغیر ان شہروں میں داخل نہیں ہو سکتے، اس شہر سے کلکتہ تک نصاریٰ کی حکومت پھیلی ہوئی ہے۔"

ایک دوسرے فتویٰ میں اعلان کرتے ہیں۔

تحریر کیا گیا ہے کہ انگریز اور ان جیسی دوسری اقوام کی عملداری دار الحرب ہوتی ہے یا نہیں تو جاننا چاہیے کہ یہ قول تو ضعیف اور کمزور ہے کہ دار السلام کبھی دار الحرب ہوتا ہی نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ دار السلام دار الحرب ہو جاتا ہے۔ ہاں اس میں اختلاف

ہے کہ کب ہوتا ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے اگر شعائر اسلام میں کوئی ایک چیز بھی ممنوع ہو جائے مثلاً اذان، ختنہ وغیرہ تو دارالحرب ہو جاتا ہے ایک جماعت کا قول ہے کہ دارالسلام کے دارالحرب ہونے کا مدار شعائر اسلام کے محو ہو جانے اور مٹنے پر نہیں بلکہ جب بھی کفر کے طریقے بے دغدغے اعلان کے ساتھ رواج پکڑ جائیں دارالحرب ہو جاتا ہے اگرچہ اسلامی شعائر تمام کے تمام برقرار رہیں۔ تیسری جماعت نے اس سے بھی ترقی کی اس کا قول ہے کہ دارالحرب کی حد یہ ہے کہ اس میں کوئی مسلمان یا غیر مسلم سابق ذمی امن کے باعث مامون نہ رہے بلکہ نیا عہد حکومت کسی غیر مسلم سے کرنا پڑے۔ خواہ کچھ اسلامی شعائر باقی چھوڑے گئے ہوں یا نہ چھوڑے گئے ہوں۔ خواہ شعائر اسلام کا اعلان کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو اس صورت میں جن شہروں میں انگریزوں اور ان جیسے کفار کی عملداری ہے بلاشبہ وہ دارالحرب ہے۔"

شاہ عبدالعزیز کے مسلک کے دوسرے پہلو

ان فتوؤں نے گومگو کی پوزیشن ختم کر دی، اب خود علماء پر لازم آگیا کہ وہ جب ایک دارالحرب میں رہ رہے ہیں تو اُسے دارالسلام بنانے میں ہر وقت مصروف رہیں اور جدوجہد کا آغاز کریں اس پہلو سے ان فتاوی کو دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ یہ فتاویٰ اس برصغیر کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی ایک نئی جدوجہد کا اعلان تھا۔ آج نشر و اشاعت کی فراوانیوں تحقیق کی سہولتوں اور حکومت کی سرپرستی نے مؤرخوں اور تحقیق کرنے والوں کی ایک کھیپ پیدا کر دی ہے جو اس آزادی کی تاریخ میں مسلمانوں کے حصے کو مذہبی اور دینی تحریکیں کہہ کر گزر جاتے ہیں لیکن پاکستان میں بھی اس سلسلے میں مربوط کوشش نہیں ہو رہی اور جو تھوڑی بہت ہوتی ہے تو اس کو بعض حلقے پنپنے نہیں دیتے اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ خود ہم بھی علماء کی تحریکوں کو صرف دینی تحریکیں ہی تصور کرتے ہیں اور آگے گزر جاتے ہیں یہ اندازہ ہی نہیں کرتے کہ مولوی کا یہ فتویٰ کتنے اہم سیاسی نتائج مرتب کرنے کا باعث ہوا۔ کتنے اہم سماجی انقلاب کی انھوں نے نیو رکھی

اور کس طرح مسلسل اور مربوط منظم تحریک کی داغ بیل ڈالی۔ اس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ نہ تو ہم اپنی ہی آزادی کی جدوجہد کو پوری طرح ایک سلسلہ کی حیثیت سے دیکھ پاتے ہیں اور نہ ہی ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ برصغیر کے بسنے والے دوسرے طبقوں اور مذہبوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور تحریکوں نے ہم پر کوئی اثر ڈالا اور ہم نے ان پر کیا اثر ڈالا اور کس طرح یہ تحریکیں ایک بحر بیکراں بنی ہیں۔ جس میں مختلف اطراف کی ندیاں اور نالے آکر گرتے رہے ہیں اور بہت دفعہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ کون سی ندی اور کون سے نالے نے اس بحر بے کنار میں طلاطم پیدا کیا ہے بظاہر ایک تنکا اس طوفان کا موجب بن جاتا ہے۔ لیکن اصل میں اس تنکے کی پشت پر پانی کے بے پناہ ریلے ہوتے ہیں۔

اسی طرح شاہ عبدالعزیز کا یہ فتویٰ بالکل بے آواز اور بے اثر معلوم ہوتا ہے اور آج اسلامی فکر کی اکثر کتابوں میں تو اس کا ذکر تک نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیڑھ دو صدی پہلے ان فتاویٰ نے جو قیامت بپا کی ہوگی اس کا ہمیں علم نہیں ہوتا لیکن خود انگریز مورخ اور یادداشتوں کو قلم بند کرنے والے ان فتاویٰ کی اہمیت سے پوری طرح آشنا تھے اور انھوں نے نہ صرف ان کے نتائج قلم بند کیے ہیں بلکہ ان فتاویٰ کی وجوہات بھی اپنے اندازے کے مطابق ضبط تحریر میں لاتے ہیں۔ چنانچہ اس زمانے کی تحریکوں کے متعلق خود ولیم ہنٹر لکھتا ہے۔ ہمارے لیے اگرچہ اپنی مسلم رعایا سے پرجوش وفاداری کی توقع رکھنا عبث ہوگا۔ لیکن ان سے یہ امید رکھنا بھی غیر معقول نہیں کہ جب تک ہم پابندی کے ساتھ ان کے حقوق پورے کرتے رہیں گے وہ بھی ایمانداری کے ساتھ اس صورت حالات میں اپنے فرائض انجام دیتے رہیں گے جس میں اللہ تعالےٰ نے انھیں ہمارے زیر نگیں کر دیا ہے۔ علماء میں سے جو لوگ زیادہ زیرک تھے انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی حیثیت میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور تغیرات کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا یہ تبدیلیاں اور تغیرات ایک حقیقت بن چکے ہیں وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے فتوؤں سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مآل اندیشانہ رویے کے باوجود حکومت کا انقلاب ایک نامعلوم طریقے پر جاری تھا۔ چنانچہ ان میں سے ایک فتوے

میں صاف صاف اعلان کیا گیا ہے کہ ہندوستان اس وقت تک دارالسلام رہ سکتا ہے جب تک مسلمان مفتی جن کو آگے چل کر ہم نے برطرف کر دیا تھا قانونی فیصلے کرتے رہیں۔ ان میں سے دو فتوے یعنی ایک تو شمس الہند مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب اور دوسرا ان کے بھتیجے مولوی عبدالحیٔ صاحب کا سب سے زیادہ اہم ہے جب ہم نے نظامِ حکومت کو بتدریج اپنے ہاتھوں میں لے لیا تو اس وقت دیندار مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہوا کہ ہمارے ساتھ ان کے تعلقات کیا ہونے چاہئیں۔ لہذا انھوں نے ہندوستان کے سب سے زیادہ مستند علماء سے رجوع کیا اور اُوپر کے دونوں مشہور اور معرُوف علماء نے ان کے جواب میں فتوے صادر فرمائے جو حرف بہ حرف مندرجہ ذیل ہیں۔

شاہ عبدالعزیز تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"جب کافر کسی اسلامی ملک پر قابض ہو جائیں اور اس ملک اور ملحقہ اضلاع کے لیے یہ ناممکن ہو کہ وہ ان کو اس ملک اور اضلاع سے باہر نکال سکیں یا ان کو باہر نکالنے کی کوئی امید باقی نہ رہے اور کافروں کی طاقت میں یہاں تک اضافہ ہو جائے کہ وہ اپنی مرضی سے اسلامی قوانین کو جائز یا ناجائز قرار دیں اور کوئی انسان اتنا طاقتور نہ ہو جو کافروں کی مرضی کے بغیر ملک کی مالگزاری پر قبضہ کر سکے اور مسلمان باشندے اس امن و امان سے زندگی بسر نہ کر سکیں جیسا کہ وہ پہلے کرتے تھے تو یہ ملک سیاسی اعتبار سے دارالحرب ہو جائے گا۔"

جوُں جوں ہماری طاقت مضبوط ہوتی گئی۔ علماء کے فتوؤں میں ہندوستان کا دارالحرب ہونا زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔ مولوی عبدالحیٔ صاحب جو مولانا شاہ عبدالعزیز کے بعد مستند نشین ہوتے صاف طور پر حکم لگاتے ہیں۔

"عیسائیوں کی پوری سلطنت کلکتہ سے لے کر دہلی اور ہندوستان سے ملحق ممالک یعنی شمال مغربی سرحدی صوبے تک سب کی سب دارالحرب ہیں کیونکہ کفر اور شرک ہر جگہ رواج پا چکا ہے اور ہمارے شرعی قوانین کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی جس ملک میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں وہ دارالحرب ہے یعنی ان شرائط کا بیان کرنا طوالت کا باعث ہوگا جن کے ماتحت جملہ فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ کلکتہ اور اس کے ملحقہ

علاقے دارالحرب ہیں"۔

ولیم ہنٹر لکھتے ہیں کہ ان فتووں سے جو نتائج مرتب ہوتے وہ یہی تھے کہ اس وقت کے حکام یعنی انگریزوں کے خلاف جہاد فرض قرار دیا گیا۔

دُوسرے مسائل کے متعلق نقطہ نظر

ایک طرف یہ علمائے حق ہندوستان کو دارالحرب قرار دے رہے تھے اور اس سے واضح طور پر یہ نتائج مرتب کیے جا رہے تھے کہ ہندوستان میں عوام کی طرف سے ان حاکموں کے خلاف تحریک چلائی جائے۔ یہ تحریک اس زمانے کے اسلوب اور مروجہ طریقوں کے مطابق ہی ہوسکتی تھی۔ چنانچہ ایک طرف علماء نے اس تحریک جہاد کے لیے فضا ہموار کرنے کی تیاری شروع کی اور دوسری معاشرتی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں ان کی بھی چھان پھٹک کی اور ان میں خیر و شر الگ کرنے کا اہتمام کیا۔

عام طور پر علماء پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے انگریز حاکموں کے خلاف جو نفرت تھی اس کے پیش نظر انگریزی تعلیم تک کا مقاطعہ کیا اور اس طرح سے مسلمانوں کو تعلیمی پس ماندگی کا شکار ہونے دیا۔ یہ الزام ایک حد تک درست بھی ہے اور ایک حد تک غلط بھی ہے۔ جب تحریک کے ابتدائی ایام تھے اور جب ابھی ہندوستانی مسلمان کسی قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہوئے تھے اور نہ انھیں بیرونی زبانوں اور علوم سے خوف پیدا ہوا تھا تو اس وقت انھوں نے ان تمام علوم کو خوش آمدید کہا تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اس سلسلے میں بھی سہرا اسی خانوادۂ شاہ ولی اللہ کے سر بندھتا ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز نے بھی سب سے پہلے انگریزی تعلیم کے جواز کے متعلق احکام صادر فرمائے اور فتویٰ دیا کیونکہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی کالج قائم کیا اور لوگ وہاں انگریزی اور دوسرے علوم حاصل کرنے سے گریز کرنے لگے تو شاہ عبدالعزیز نے ان سب لوگوں کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا اور انھیں ان عُلوم کی تحصیل کی ہدایت کی بلکہ بقول شیخ اکرام کے شاہ عبدالعزیز نے علی گڑھ کالج سے ۵۰ برس پہلے

پہلے انگریزی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کا فتویٰ دیا۔ اسی طرح کئی اور معرکتہ الآرا فتوے ہیں جن میں انگریزی ہی نہیں بلکہ تمام غیر مسلموں کی مناسب نوکری اور دارالحرب میں حربی کافروں سے سود لینے کے جواز کے فتویٰ ہیں۔

دُوسرے مذاہب کے متعلق موقف

خانوادہ شاہ ولی اللہ نے ہندوؤں کی تعلیمات کے متعلق اظہار رائے اور اس دور میں دوسرے صاحبِ علم حضرات نے بھی اس سلسلے میں تفصیلی آرا قلم بند کی ہیں۔ اس سلسلے میں بہت ہی اہم رائے مرزا مظہر جان جاناں کی ہے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کو ہم صرف ایک شاعر کی حیثیت سے ہی جانتے تھے۔ لیکن ان کا درجہ ایک صاحب علم کی حیثیت سے بہت بلند ہے۔ ان کا نام خود اورنگ زیب نے رکھا تھا اور وہ شاہ ولی اللہ کے ہم عمر تھے اور ان کی علمیت، مذاقِ سلیم اور انصاف پسندی کے متعلق شاہ صاحب نے جگہ جگہ تعریف کی ہے۔ مرزا جانِ جاناں سلسلہ نقشبندی سے متعلق ہیں اور انھوں نے اس ضمن میں کئی ایک کتابیں بھی تصنیف کی ہیں لیکن ان کے مکتوبات سب سے زیادہ غور و فکر کے مستحق ہیں۔ ایک طویل خط میں ہندوؤں کے آئینِ مذہب کے متعلق اپنی رائے لکھی ہے۔ اس رائے کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ جب پتہ چلتا ہے کہ خود خانوادہ شاہ ولی اللہ بھی اسی رائے اور مسلک کے حامی اور موئد بنے۔ چنانچہ اس مکتوب میں مرزا جان جاناں لکھتے ہیں۔" آپ نے پوچھا تھا کہ ہند کے کافر عربوں کے مشرکوں کی طرح بے اصل دین رکھتے ہیں یا اس دین کی کوئی اصل تھی اور اب منسوخ ہوگیا ہے؟ دیگر ان لوگوں کے بزرگوں کے حق میں کیا اعتقاد رکھنا چاہیے"۔ اس کا جواب دیتے ہوئے مرزا صاحب لکھتے ہیں"۔ واضح رہے کہ اہلِ ہند کی قدیم کتابوں سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ نوعِ انسانی کے پیدائش کے شروع میں رحمتِ الٰہیہ نے ان لوگوں کی معاد و معاش کی اصلاح کے لیے ایک کتاب مسمی بر ولد جس میں چار دفتر ہیں اور امر و نہی کے احکام اور ماضی و مستقبل کے واقعات ہیں ایک فرشتے پر برہما نام کے نام وسیلے سے جو ایجاد عالم کا واسطہ

ہے نازل کی اس زمانے کے مجتہدین نے اس کتاب سے چھ مذاہب استخراج کیے اور اصول عقائد کی بنا۔ ان پر قائم کی اس کو فن دھرم شاستر کہتے ہیں۔ یعنی فن ایمانیات جس سے علمِ کلام مراد ہے اسی طرح مجتہدین نے نوع کے چار فرقے بنائے اور ہر فرقے کے لیے ایک ملک مقرر کیا اور فروعِ اعمال کی بنا اس پر قائم کی اس فن کا نام کرم شاستر رکھا یعنی فن عملیات جسے علم فقہ کہتے ہیں۔ یہ لوگ فسخ احکام کے منکر ہیں۔ لیکن چونکہ وقت اور طبیعتوں کے مطابق مناسب تغیر اعمال بھی ضروری ہے اسلیے دنیا کی ساری مدت کو چار حصوں میں تقسیم کر کے ہر ایک حصے کا نام جگ رکھا ہے۔ ہر ایک جگ کی علامتیں انہی چار دفتروں سے اخذ کی ہیں جو کچھ متاخرین نے ان میں اپنے تصرفات کیے ہیں۔ وہ قابل اعتبار نہیں۔

ان کے تمام فرقے توحید الٰہی کے بارے میں متفق ہیں عالم کو مخلوق جانتے ہیں۔ فنائے عالم نیک و بد کی سزا حشر و نشر جسمانی حساب کتاب کے قائل ہیں، علومِ عقلی و نقلی، ریاضت مجاہدات تحقیق و معارف اور مکاشفات میں ید طولےٰ رکھتے ہیں۔ ان کی بت پرستی شرک کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے دوسرے اسباب ہیں۔ ان کے علماء نے انسانی عمر کے چار حصے کیے ہیں پہلا تحصیل علم کے لیے دوسرا معاش اور اولاد کی غرض سے، تیسرا درستی اعمال اور تہذیبِ نفس کے لیے چوتھا تجرد اور تنہائی کی مشق کے لیے جو کمال انسانی کا انتہائی درجہ ہے اور نجات کبریٰ جسے مہاکت کہتے ہیں اس پر موقوف ہے اعلیٰ درجے کا نظم و نسق ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دین باقاعدہ مرتب ہوا تھا۔ لیکن پھر منسوخ ہو گیا۔ ہماری شرح میں یہود و نصاریٰ کے دین کے فسخ کے سوا۔ اور کسی دین کے فسخ کا ذکر نہیں، حالانکہ ان کے علاوہ بہت سے دین منسوخ ہوئے، اور کئی دین صفحہ ہستی سے نابود ہو گئے۔ نیز واضح رہے کہ ان آیات کے مطابق کہ ہر ایک گروہ کا نبی گزرا ہے اور ہر ایک امت کا رسول ہوتا ہے۔ سرزمین ہندوستان میں بھی نبی اور رسول بھیجے گئے جن کے احوال ان کتابوں میں مندرج ہیں۔ ان کے اخیار و ایثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ کمال

تھے۔ رحمتِ عامہ الٰہی نے اس سرزمین کو فروگزاشت نہیں کیا۔ پیغمبر آخر الزماں کی بعثت سے پہلے ہر ایک قوم میں پیغمبر مبعوث ہوتا رہا ہے جس کی اطاعت و فرمانبرداری اس قوم کے لیے لازم تھی اور دوسری قوم کے نبی سے ان کی غرض نہ ہوتی لیکن جب سے ہمارے پیغمبر خاتم المرسلین مبعوث ہوئے ہیں تب سے لے کر جب تک دنیا باقی ہے کوئی اور نبی نہ ہوگا مشرق سے لے مغرب تک دنیا کو آنحضرتؐ کی ہی تابعداری اور فرمانبرداری لازم ہے اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے مقابل، باقی تمام دین منسوخ ہیں آغاز بعثت سے آج تک ایک ہزار ایک سو اسی سال ہوتے ہیں جو اس دین کی طرف مائل نہیں ہوا وہ کافر ہے نہ کہ وہ لوگ جو اس سے پہلے گزر چکے تھے۔ نیز جیسے تصریح کی گئی ہے کہ "ان میں سے بعض کا حال تمہارے روبرو بیان کیا اور بعض کا نہیں کیا"۔ جب ہماری شریعت بہت سے انبیائے ملل میں ساکت ہے تو ہم کو بھی ہندوستان کے انبیاء کے حق میں خاموشی بہتر ہے۔ نہ ہم کو مقلدین کے کفر و الحاد پر ایمان واجب ہے اور نہ ان کی نجات کا اعتقاد لازم ہے لیکن اگر تعصب نہ ہو نیک گمان ضرور کرنا چاہیے۔ اہلِ فارس بلکہ تمام امم ماضیہ کے حق میں۔ جو خاتم النبیینؐ کے ظہور سے پہلے گزر چکے ہیں اور جن کے شرح نسبت میں کچھ بیان نہیں کیا گیا اور جن کے احکام و آثار راہِ استدلال کے مناسب و موافق ہیں اسی قسم کا عقیدہ رکھنا بہتر ہے۔ کسی کو بغیر قطعی دلیل کے کافر نہیں کہہ دینا چاہیے۔ ان اہلِ ہند کی بت پرستی کی حقیقت یہ ہے کہ بعض فرشتے۔ جو حکمِ الٰہی سے عالمِ کون و فساد میں دخل رکھتے ہیں یا بعض کاملین کی روحیں جنھیں جسم سے الگ ہو کر اس دنیا میں کچھ تصرف حاصل ہے یا بعض زندہ آدمی جیسا کہ ان کے زعم میں حضرت خضر علیہ السلام تا ابد زندہ رہیں گے یہ لوگ ان کی مورتیں اور تصویریں بنا کر ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس توجہ کے سبب ایک مدت کے بعد صاحبِ صورت سے مناسبت پیدا کر لیتے ہیں اور اسی نسبت سے حوائج معاش و معاد کو پورا کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل ذکر رابطہ سے مشابہت رکھتا ہے جو اسلامی صوفیاء میں عام ہے اور جس میں صورتِ شیخ کا تصور کیا جاتا ہے اور فیض حاصل کیے جاتے ہیں۔ ہاں

صرف اس قدر فرق ہے کہ صوفیاء شیخ کی ظاہری تصویر نہیں بناتے لیکن یہ بات کفار عرب کے عقیدے سے مناسبت نہیں رکھتی کیونکہ وہ بتوں کو متصرف اور موثر بالذات مانتے تھے نہ کہ تصرف الٰہی کا ذریعہ اور انہی کو زمین کا خدا مانتے تھے اور اللہ تعالےٰ کو آسمان کا خدا۔ مگر یہ شرک ہے ان اہلِ ہند کا سجدہ، سجدہ عبودیت نہیں بلکہ سجدہ تحیت ہے جو کہ ان کے طریقے میں ماں باپ، پیر و استاد کے سلام کے لیے بھی عام ہے اور جسے ڈھنڈوت کہتے ہیں۔

اسی خیال کو بھی خود شاہ عبدالعزیز نے بھی ایک فتویٰ میں بیان کیا تھا۔ جب ان سے شری کرشن کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ بہتر تو یہ ہے کہ ان کے حق میں چپ رہا جائے لیکن بھگوت گیتا سے جو ہندوؤں کی ایک معتبر کتاب ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کنہیا جی (شری کرشن) اولیاء میں سے تھے۔

یہ تمام پہلو ایک نئی تحریک کو سمجھنے کے لیے نہایت ضروری اور لازمی ہیں کیونکہ یہ صرف دین کے مخصوص شعبوں اور پہلوؤں سے ہی متعلق نہ تھے بلکہ اس وقت کی معاشرتی اور سماجی ڈھانچے اور اس میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر بھی اثر انداز ہو رہے تھے۔

باب ۱۴

دارالحرب کے نئے تقاضے

اب جب برصغیر دارالحرب ٹھہرا تو اس دارالحرب کو دارالسلام میں تبدیل کرنے کے فرائض بھی عاید ہوتے ہیں اور اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ شاہ عبدالعزیزؒ ہوں یا مرزا جان جاناں انھوں نے ہنود کے مذہب کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا اس سے ان کے اذہان کا پتہ چلتا ہے کہ وہ ان مذاہب کے ماننے والوں کے خلاف جہاد کا اعلان نہیں کر رہے تھے اور اس سلسلے میں دیوبند کے جید عالم اور "علمائے ہند کا شاندار ماضی" کے مصنف لکھتے ہیں

فتویٰ کی زبان مذہبی کہ "دارالحرب" کا اصطلاحی لفظ استعمال کیا گیا ہے، مگر روح سیاسی اور مطلب[1] یہ ہے کہ چونکہ:

---

[1] دورِ حاضر کے مشہور رہنما عالم حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی صدر جمعیۃ علمأ ہند اس فتویٰ کے مضمرات پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب نے انگریزوں کے خلاف جو ظلم و ستم کی شکایت کی ہے اس میں مسلمانوں

۱:- قانون سازی کے جملہ اختیارات عیسائیوں کے ہاتھ میں ہیں۔
۲:- مذہب کا احترام ختم ہے۔
۳:- اور شہری آزادی سلب کر لی گئی ہے۔

لہذا ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس اجنبی طاقت سے اعلانِ جنگ کر دے اور جب تک اس کو ملک بدر نہ کر دے اس ملک میں زندہ رہنا اپنے لیے حرام جانے۔

اس موقع پر یہ حقیقت نظر انداز نہ ہونی چاہیے کہ نجف علی خاں کی وفات (۱۷۸۲ء) کے بعد سے تقریباً بیس سال سے اقتدار مرہٹوں کے ہاتھ میں تھا۔ مرہٹوں کا پیشوا (مادھو نرائن پھر باجی راؤ) امیر الامراء تھا اور مادھوجی سیندھیا نائب امیر الامراء اور جس طرح آج یہ اعلان ہو رہا تھا کہ "حکم کمپنی بہادر کا"۔ بیس سال پہلے سے دنیا دیکھ رہی تھی کہ جو کچھ حکم تھا وہ پیشوا یا سیندھیا کا تھا۔ یعنی پایۂ تخت اور اس کے گرد و نواح میں ایک غیر مسلم طاقت یعنی مرہٹوں کا تسلط تھا

کے ساتھ ہندوؤں کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ دونوں شہر دہلی اور اس کے نواح میں امن کا پروانہ لیے بغیر نہیں آ سکتے تھے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب انگریزوں کے مظالم سے صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندوؤں کی بھی گلو خلاصی چاہتے تھے۔

(۲) شاہ صاحب کسی ملک کے دار السلام ہونے کیلیے اس میں محض مسلمانوں کی آبادی کافی نہیں سمجھتے بلکہ اس کے لیے وہ یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلمان با عزت طریقہ پر رہیں اور ان کے شعائرِ مذہبی کا احترام کیا جاتے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کسی ملک میں سیاسی اقتدار اعلیٰ کسی غیر مسلم جماعت کے ہاتھ میں ہو لیکن مسلمان بھی بہر حال اس اقتدار میں شریک ہوں اور ان کے مذہبی دینی شعائر کا احترام کیا جاتا ہو تو وہ ملک حضرت شاہ صاحب کے نزدیک بے شبہ دار السلام ہوگا اور از روئے شرع مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ اس ملک کو اپنا ملک سمجھ کر اس کیلئے ہر نوع کی خیر خواہی اور خیر اندیشی کا معاملہ کریں۔ (نقش حیات جلد دوم ص۱۱) (صفحہ نمبر ۲۲۷ دیکھیے)

شاہ عبدالعزیز صاحب اور ان کی پوری پارٹی دہلی میں موجود تھی ان کے سامنے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ ان کے منہ میں زبان تھی اور ہاتھ میں قلم تھا۔ چنانچہ جن باتوں میں وہ مرہٹوں کے نظامِ حکومت کے خلاف تھے ان پر سخت سے سخت تنقید کی تھی آج بھی وہ عربی اور فارسی کے اشعار موجود ہیں جن میں مرہٹوں پر گہری تنقید ہے لیکن بایں ہمہ ان بیس سالوں میں نہ تو وطن عزیز کو دارالحرب قرار دیا اور نہ ہندوستانیوں کے "آزادی ورنہ ترک وطن" کا فتویٰ صادر کیا۔ بلکہ اس کے برعکس مسلمانوں کا جنگ جو طبقہ جو شاہ عبدالعزیز سے گہری عقیدت رکھتا تھا۔ یعنی روہیلہ پٹھان، ان کے تعلقات مرہٹوں سے اور زیادہ مضبوط ہو گئے۔ یہ بھی فراموش نہ ہونا چاہیے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کو اذیتیں پہنچانے کی جو روائتیں نقل کی جاتی ہیں ان میں جس کا نام لیا جاتا ہے وہ نجف علی خاں ہے جو انگریزوں کا پرانا وظیفہ خوار اور ان کا لایا ہوا وزیر تھا۔

فتوے کا اثر

عام مسلمان جو انگریزوں کے تیز رفتار اقتدار سے حیرت میں رہ گئے تھے اور اپنے اندر ایسی

لہ ۲۶ اپریل ۱۷۸۲ء کو مرزا نجف خاں نے انتقال کیا (تاریخ ہندوستان صد ۲۲۸ ج ۹) اس کے مرنے کے بعد دو شخص اس کے منصب کی وراثت کے لیے کھڑے ہوئے ۱: افراسیاب جس کو مرزا نجف علی خاں اور اس کی بہن نے پالا تھا۔ ۲: مرزا شفیع جو نجف علی کا رشتہ دار تھا۔ کافی ہنگامہ بازی کے بعد مرزا محمد شفیع نے امیرالامرائی کا عہدہ سنبھالا۔ چند روز بعد اس کو محمد بیگ نامی ایک سردار نے جو اس ہنگامہ بازی کا ایک ہیرو تھا، قتل کر دیا۔ اب افراسیاب خاں امیرالامراء ہوا۔ چند روز بعد مرزا محمد شفیع کے بھائی زین العابدین نے افراسیاب کو بھی قتل کر دیا۔ اس کمینہ خانہ جنگی سے بادشاہ اس قدر تنگ ہو چکا تھا کہ اس نے آس پاس کے تمام امراء کو نظر انداز کر کے مرہٹوں کی طرف دستِ تعاون بڑھایا۔ جس کو مرہٹوں نے خوش آمدید کہا۔ اب پیشوا کو عہدۂ امیرالامرائی سپرد ہوا۔ اور مادھوجی سیندھیا نائب امیرالامراء قرار پایا۔ پینسٹھ ہزار روپیہ ماہانہ بادشاہ کا نذرانہ مقرر ہوا (تاریخ ہندوستان از صد ۲۲۲ تا صد ۲۳۱ ج ۹)

صلاحیت نہیں رکھتے تھے کہ مذہب کی روشنی میں فیصلہ کر سکیں کہ اس اقتدار کے مقابلہ میں ان کا طرزِ عمل کیا ہو ان کے لیے ایک راستہ کھل گیا جس کا فوری اثر یہ ہوا کہ باہمت جنگجو طبقہ جابجا اس طاقت سے وابستہ ہو گیا جو اس وقت انگریزوں سے برسرپیکار تھی۔ یہ طاقت اس وقت صرف مرہٹوں کی تھی۔

چنانچہ اس دور میں مسلمانوں اور مرہٹوں کی پرانی جنگ ختم ہو گئی اور صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ مرہٹے علاقوں کے مسلمان مرہٹوں کی فوج میں شامل ہو کر آخر تک انگریزوں سے لڑتے رہے بلکہ شمالی ہند کے بھی بہت سے مسلمان ان علاقوں میں پہنچے اور مرہٹوں کے ساتھ انگریزوں کی جنگ میں جنگ شریک۔ خود حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنے خاص معتقد اور مرید سید احمد صاحب کو امیر علی خاں سنبھلی کے پاس بھیجا جو جسونت راؤ ہلکر کے ساتھ ایک عرصہ سے انگریزی طاقت پر شب خون مار رہے تھے۔

یہ موقف جو قریب قریب پوری ایک صدی سے مابہ النزاع بنا ہوا ہے اور اس کی تہہ تک پہنچنے کیلئے اور آج کے علماء کے اندر کے فکری تضاد کو جاننے کے لیے یہ پورا تاریخی پس منظر دیا جا رہا ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ خود علماء اپنے اس تضاد کو پورے پس منظر میں جاننے اور سمجھنے سے گریزاں ہیں اور یہی۔۔۔ گریزانی کو آج بیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں رجعت پسندی کی دلدل میں پھنسا دیتا ہے بہر حال اس امر کا تذکرہ نہایت تفصیل سے کتاب کے دوسرے حصے میں آئے گا لیکن فی الحال اس پس منظر میں سید احمد شہید کی تحریک کو جاننا چاہیے کیونکہ جب سید احمد شہید کا خانوادۂ ولی اللہ سے رشتہ استوار ہوا وہ وہی زمانہ تھا جب شاہ عبدالعزیز اس برصغیر کو دارالحرب قرار دے چکے تھے کیونکہ اس حقیقت کو بہر حال تسلیم کرنا پڑے گا کہ دارالحرب کے متعلق فتوے کا کوئی سیاسی اور معاشی پس منظر ہوگا۔ وگرنہ جہاں تک انگریز اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی بالادستی کا تعلق تھا تو وہ پلاسی کی لڑائی ہو یا بکسر کی جنگ اس میں حاصل ہو گیا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب خود شاہ ولی اللہ زندہ تھے لیکن اس وقت اس برصغیر کو دارالحرب قرار نہیں دیا گیا۔ آخر اس کی وجہ کیا تھی؟ میرے نزدیک یہ شمالی ہند

کے خطوں اور جنوب اور مغربی ہند کا تفاوت تھا۔ وہاں کے تفاوتوں کا شمالی ہند کے علماء کو پوری شدت سے احساس ہی نہ تھا۔ اسی لیے جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی یلغار شمالی ہند اور دہلی تک پہنچی اور یہاں کے امراء اور جاگیردار، درباری اور مصاحبین آہستہ آہستہ متاثر ہونے شروع ہوئے تو اس تبدیلی کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ کیونکہ اب ایسٹ انڈیا کمپنی کو برصغیر میں اپنے اثر و رسوخ اور تسلط کو پھیلاتے ہوئے پون صدی ہونے لگی تھی اس تسلط نے ایک طرف ہندوستان کو زبردست تبدیلیوں سے ہم کنار کیا تو دوسری طرف تجارتی لوٹ کھسوٹ، یہاں کا مال و زر اور دولت انگلستان میں تبدیلیوں کا باعث بنے اور ان کے ساتھ ساتھ خود ہندوستان کا یہ وسیع و عریض خطہ زبردست افراتفری اور انتشار کا شکار تھا۔ غرضیکہ جس دور میں سید احمد لکھنؤ سے دہلی پہنچے وہ بڑے کرب اور بے چینی کا زمانہ تھا اور یہ کرب چاروں طرف اپنے اثرات چھوڑ رہا تھا۔ کمپنی کے مظالم اور ان کے مہلک نتائج برآمد ہو رہے تھے۔ پرانی سلطنتیں مٹ رہی تھیں اور کمپنی کی حکومت آہستہ آہستہ پورے برصغیر پر مستحکم ہو رہی تھی اور اس کے استحکام کے ساتھ ساتھ سماج کے پرانے طبقے مٹنا شروع ہو گئے تھے ان طبقوں کا عالمِ نزع ایک عجیب و غریب قسم کا اضطراب پیدا کر رہا تھا۔ کمپنی کی حکومت کے استحکام کے ساتھ ساتھ عیسائی مشنریوں کا حملہ بھی شد و مد سے شروع ہو رہا تھا۔ غرضیکہ ہر وہ قدر، مسلک اور روایت جو لوگوں کے رگ و پے میں رچی ہوئی تھی فنا ہو رہی تھی اس سے ذہنی پریشانی اور جذباتی ہیجان لازمی امر تھا۔ اسی جذباتی ہیجان اور ذہنی کرب کو شاہ عبدالعزیز اپنے وعظ میں بیان کرتے تھے اور ایک بار وہ لوگوں کو ان تبدیلیوں سے آنکھیں چار کرنے کے لیے تیار کرنے کی دھن میں مصروف تھے۔

اخلاقی اقدار کا زوال

اس افراتفری، تباہی و بربادی اور سیاسی زوال نے اخلاقی اقدار کو جو ٹھیس پہنچائی وہ بھی اپنی جگہ ایک اہم پہلو تھا۔ کیونکہ جس قیادت کو بھی مسلمان عوام کو بیدار کرنا تھا اسے اخلاقی بے راہ روی

اور ذہنی وجسمانی عیاشیوں کی طرف بھی متوجہ ضرور ہونا تھا۔ کیونکہ ان کے خلاف جہاد کیے بغیر کوئی میدان کارزار ترتیب نہیں پا سکتا تھا۔ اسی لیے تو اس دور کی تمام تحریکوں کو سب سے پہلے اخلاقی اور دینی اقدار کی اصلاح کی طرف توجہ کرنا پڑی۔ اس زمانے کے رسم ورواج اور عادات قبیحہ کا تذکرہ سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم نے بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

پہلے اس اخلاقی زوال کی گونج سن لیجیے جسے قوموں کے سیاسی زوال کا نقیب کہا گیا ہے اخلاقی بیماری کا یہ مطلب نہ تھا کہ قوم کے اکابر موت کے خوف سے یا عیش وطرب کے شوق میں سپہ گری چھوڑ بیٹھے تھے۔ حربی فنون کی تعلیم آخر تک ان کی تربیت کا جزو رہی لیکن آرام کی عادات اور تن پروری کے اسباب نے جسم کو محنت وزحمت اٹھانے کے قابل نہ رہنے دیا۔ سپہ سالار پالکیوں میں بیٹھ کر فوجیں لڑانے جاتے تھے۔ سواروں کے ساز وسامان دیکھ کر لشکر پر بارات کا گمان ہوتا تھا۔ کئی فرنگی سیاحوں نے اس زمانے کے سفرنامے لکھے ہیں، مقامی تاریخوں سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ ”بادشاہی اردو“ ایک متحرک شہر معلوم ہوتا تھا اور اس کے بازاروں میں ہر قسم کا سامانِ راحت جس کی شہری اقامت میں دولت مندوں کو تلاش رہتی ہے مہیا کیا جاتا تھا اس اعتبار سے وہ آج کل کے بڑے جہازوں سے جن میں مسافروں کی عیش وتفریح کے لوازم فراہم کیے جاتے ہیں معنوی مماثلت رکھتا ہے جو قوم زمانۂ جنگ وسفر میں یہ آسائش ڈھونڈتی ہو، حالت امن واقامت میں ان کی جس قدر خوگرفتہ اور پابستہ ہو گی وہ ظاہر ہے۔ ان تعیشات میں زیادہ زور خواب گاہ اور دستر خوانوں کی وسعت پر دیا جاتا بہتر سے بہتر باورچی ہنرمندی کے کمال دکھاتے اور نئی نئی قسم کے کھانے پکاتے تھے، طرح طرح کے مصالحوں سے ان کو بامزہ بناتے، اطباء کی مدد سے یہ غذائیں نہایت مقوی تیار کی جاتی تھیں، اور عیاشی کی لاگ سے بہت سی ادویہ اور منشیات امیروں کی خوراک کا حصہ بن گئی تھیں۔ عالمگیری دور کو چھوڑ کر مغلیہ درباروں میں شراب کا دور خاصی طرح عام تھا۔ نسوانی جذبات کو زیادہ مشتعل کرنے کی غرض

سے ارباب نشاط کی بارہویں صدی ہجری اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں ایسی افراط پائی جاتی ہے کہ رنڈیوں کی ایک پوری قوم پرورش پاگئی تھی، بڑے شہروں میں ان کے محلے کے محلے آباد تھے اور مشکل سے شمالی ہند کا کوئی قصبہ ایسا ہوگا جہاں ان کے اڈے نہ بن گئے ہوں۔ ان کے جلو میں سازندوں، ڈوموں، وقالیوں کی فوج کی فوج اپنی زندگی خراب کرتی اور دوسروں میں گندگی پھیلاتی پھرتی تھی۔ یہ لوگ اخلاق کے حق میں مسمّی جراثیم تھے جو عموماً مسلمان ہوجاتے اور آہستہ آہستہ ملت کی رگ و پے میں ٹھہر جاتے تھے۔ صدی کا وسطی ثلث یعنی محمد شاہ اور احمد شاہ کا عہد ان بے اعتدالیوں کا انتہائی عروج کا زمانہ ہے جس کے بعد قضا و قدر کے محتسب نے پوری قوم کو مواخذے کے شکنجے میں کھینچا اور گناہ گار ملوک و امراء پر ایسے دُرّے برسائے کہ سارا جاہ و حشم خاک میں مل گیا۔ خاندان کے خاندان بے نشان ہوگئے ہزاروں اہلِ دول دریوزہ گری کرنے لگے۔"

عیش و عشرت کے افسانے

اس دور کے کارناموں اور سیاہ مستیوں کے قصے الف لیلیٰ کی داستانوں سے کم دکھائی نہیں دیتے اور بہت سی عادات قبیحہ اسی دور کی یادگار بتائی جاتی ہیں۔ امرد پرستی بطور پیشہ اور فن اسی زمانے میں مقبول عام ہوئی۔ ہیجڑوں کو پسندیدگی کی نظر سے اسی زمانے میں دیکھا جانے لگا۔ اس ضمن میں عجیب و غریب کہانیاں تاریخ کے اوراق میں بکھری نظر آتی ہیں۔ ایک سیاح درگاہ قلی خاں، دہلی اسی زمانے میں پہنچا تو اس نے یہاں اہل علم اور شعر و شاعری کرنے والوں سے کہیں زیادہ اہل ارباب نشاط کو دیکھا

رقص و سرود کی محفلیں روزمرہ کا معمول دکھائی دیتی تھیں اور سب سے زیادہ مال دار گویے، ڈوم، رنڈیاں، مراثی نظر آئے تھے، مزاروں پر اور عرسوں میں رونق کا بھی اسی نے ذکر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید عرسوں میں شرکت کرنے اور مزاروں پر سجدہ ریزی کے علاوہ دلی والوں

کو کوئی کام نہیں رہا تھا۔ اس نے شاہ عالم بہادر شاہ اول کے عرس کا ذکر کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ فارسی ہی تھی جس نے بہ رنگ اپنے اندر چھپالیا۔ اس نے لکھا ہے۔

"برج ہائے روشنی بہ بروج آسمانی پیام انوار می فرستند وبنگلہ ہائے تجلّی آگین در ہر گوشہ وکنار طرح وادی ایمن می کنند۔ معاشران با محبوبان خود در ہر گوشہ وکنار دست در بغل، وعیاشیاں در ہر کوچہ وبازار بہول مشتہیات نفسانی در رقص حمل، مے خوراں بے اندیشۂ محتسب در تلاش سید مستی وشہوت طلبان بے واہمہ مزاحمت سرگرم شاہد پرستی، ہجوم امارد نوخطان توبہ شکن زہاد وآہو پسران بعشق بے مثال برہم زن بنیاد صلاح وسداد تانگاہ پرواز کند مائل روے ست وتا چشم واشود حلقہ فتراک گیسوئے سامان فواحش بہ مشابہ کہ یک عالم فساق بہ کام دل می رسند واسباب خباثت بدرجہ کہ یک جہان فجار کسب تمتع می نمائند تا کسے بحال خود وارسد امردے چشمک می زند تا چشم چراغ روشن کند، زانکہ پیام می فرستد، کوچہ وبازار از نواب خوانین لبریز وگوشہ وکنار از امیر وفقیر شور انگیز، مطرب وقوال از مگس زیادہ نزد محتاج وسائل از اندیشہ افزوں تر، قصہ مختصر باین ترتیب وضیع وشریف ایں دیار ہواجش نفسانی ترتیب می دہند وبہ مستلذات جسمانی فائز می شوند درچنیں ہنگامہ چشم بستن ہا عین مصلحت وبصر نکشودن محض بصیرت۔"

دینی عقائد

سیاسی زوال نے صرف اخلاقی اقدار ہی کو مجروح نہیں کیا تھا بلکہ اس نے دینی عقائد کو بھی بری طرح مسخ کیا تھا۔ غیر اللہ کی عبادت معمول بن گیا تھا اور پیروں کے عرسوں کا سلسلہ عام تھا۔ میلاد اور گیارہویں شریف اور اس قسم کی مجالس وتقریبات کے زور شور کا بھی یہی زمانہ تھا۔

ان رسوم اور تقریبات کے متعلق ایک گروہ جواز کا فتویٰ دیتا تھا ان کو مقدس اور جائز

بلکہ ضروری تصور کرتا تھا۔ اس زمانے میں انہی رسوم پر اکتفا نہ تھا بلکہ بے شمار دوسری رسومات بھی اسلام کا جزو قرار پائیں۔ حالانکہ اسلام اور اس کی تعلیمات میں ان کا کہیں بھی ذکر نہ تھا لیکن یہ تمام کی تمام ہندوؤں سے میل جول کے باعث مسلمانوں کی زندگی میں داخل ہو گئیں بہرحال توہم پرستی، جن بھوت اور تعویذ گنڈوں پر اعتقاد عام تھا اور جیسے جیسے وہ قوم کی اپنی خود اعتمادی غائب ہوتی جا رہی تھی، ویسے ہی قبر پرستی اور اولیاء اللہ سے استمداد کا عقیدہ تقویت پکڑتا جا رہا تھا۔ کہیں امام کے آنے کا چرچا ہوتا اور کہیں مہدی کا انتظار ہوتا۔ بہرحال اس قسم کے عقیدے مذہبی طور پر جائز تھے یا نہیں لیکن قومی کردار اور جدوجہد کی صلاحیتوں کی اور عملی قوتوں پر ان کا اثر بہت مہلک ثابت ہو رہا تھا۔

یہ اخلاقی اور دینی حالت پچھلی ایک صدی سے اس برصغیر کا مقدر ہو چکی تھی اس میں آئے دن اضافہ ہو رہا تھا اور کمی کی کوئی سبیل نظر نہیں آ رہی تھی۔ خانوادۂ شاہ ولی اللہ اسی اخلاقی گراوٹ اور دینی انحطاط کی حالت کے خلاف مصروف جہاد تھا۔ سید احمد نے جب دہلی کا رخ کیا تو اخلاقی اور دینی انحطاط کے ساتھ ساتھ سیاسی تنزل بھی اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا اور یہی وہ زمانہ تھا جب ایسٹ انڈیا کمپنی شمالی ہند کی طرف اپنے قدم بڑھا رہی تھی۔

انگلستان میں رونما ہونے والی تبدیلیاں

ہم نے انگریزی فتوحات کو بھی ایک ایسا عمل تصور کیا ہے جو برابر جامد رہا ہے گویا پہلے ہی دن سے اس کے جو مقاصد اور عزائم مرتب ہوئے ان میں مسلسل یکسانیت اور ہم آہنگی رہی ہو۔ لیکن صورت حال یہ نہیں رہی۔ خود برطانوی ملوکیت کے ارتقا میں مختلف تبدیلیاں اور مختلف مراحل آتے ہیں اور انھوں نے ہندوستان کی سیاست اور زندگی کو بھی براہ راست متاثر کیا ہے۔ اس لیے برصغیر کی سیاسی، سماجی، دینی، اخلاقی اور ادبی تحریکوں کو ان تبدیلیوں سے الگ کر کے دیکھا نہیں جا سکتا۔

اٹھارہویں صدی جس کے وسط میں پلاسی کی جنگ لڑی گئی اور جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی

فاتح و کامران رہی۔ گویا اس میں برطانوی راج کی بنیاد اس ملک میں رکھی گئی۔ اس فتح و کامرانی نے نہ صرف ہندوستان کی سیاست میں زبردست تبدیلیوں کو جنم دیا۔ بلکہ خود انگلستان میں اہم تغیر رونما ہوئے۔ اٹھارہویں صدی کے وسط تک انگلستان زیادہ تر ایک زرعی ملک تھا ۱۷۵۰ء تک انگلستان کے زرعی علاقوں میں آبادی کی تعداد صنعتی علاقے سے کہیں زیادہ تھی گلاسٹرشائر جو کلیتہً زرعی علاقہ تھا، وہاں لنکاشائر سے زیادہ آبادی تھی۔ اس وقت تک انگلستان کی سب سے بڑی صنعت اُونی صنعت ہی تھی جو خود زراعت کا حصہ ہوتی ہے یعنی بھیڑ بکریوں کے دم پر اس صنعت کا انحصار ہوتا ہے اور بھیڑ بکریاں زرعی ملک کی خاصیت ہوتی ہیں۔ اس زمانے میں انگلستان سے جو مال برآمد کیا جاتا تھا اس میں ایک تہائی صرف اونی سامان ہوتا تھا۔ جہاں تک سوتی کپڑے کی صنعت کا تعلق ہے تو اس زمانے میں یہاں بھی ہندوستان کی طرح کرگھے استعمال ہوتے تھے۔

ایسٹ انڈیا کے قدم جوں جوں ہندوستان میں جمنے شروع ہوئے، انگلستان کے سیاسی حالات بدلنے شروع ہو گئے اور ان نئے سماجی حالات کے باعث صنعتی سرمایہ داری کے لیے راستہ ہموار ہوتا گیا۔ اب یہاں بڑی بڑی صنعتیں قائم ہو سکتی تھیں سرمایہ دار طبقے کی حکمرانی مضبوط اور مستحکم ہو سکتی تھی۔ سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ چند لوگوں کے پاس بہت بڑی مقدار میں سرمایہ اکٹھا ہو۔ ہندوستان سے انگلستان کی تجارت نے یہ اہم ضرورت پوری کر دی۔ اب انگلستان میں سیٹھوں کا ایسا طبقہ وجود میں آ چکا تھا، جو بڑے بڑے کارخانے لگانے کے لیے اپنی تجوریوں کے منہ کھول سکتا۔ اور روپوں کی بارش کر سکتا تھا۔ پلاسی کی لڑائی سے قبل انگلستان میں ایسا طبقہ وجود میں نہ آیا تھا۔ لیکن پلاسی کی جنگ میں کمپنی کو جو فتح حاصل ہوئی اس سے ایسا نظر آتا ہے کہ سرمائے کے سیلاب اور طوفان کا رُخ انگلستان کی طرف ہو گیا تھا اور ہندوستان کی دولت طوفان و سیلاب کی صورت میں انگلستان پہنچنے لگی تھی۔

ایجادات

انسانی تاریخ بھی بوالعجبیوں، مختلف عوامل کے تسلسل اوران کے نتائج وعواقب کا مجموعہ ہوتی ہے۔ یہی حال انگلستان میں ہوا۔ جیسے ہی سرمایہ چند ہاتھوں میں جمع ہوا تو بڑے بڑے کارخانوں کے منصوبے بننے شروع ہوئے اوراس طرح ایجادات کے لیے فضا سازگار ہوئی یہی وہ زمانہ ہے جب انگلستان میں سب سے اہم ایجادات ظہور میں آئیں۔ یہ ایسی ایجادات تھیں جنھوں نے تاریخ انسانی کے دھارے موڑ دیے اور انگلستان میں صنعتی انقلاب کو جنم دیا۔ ۱۷۶۴ء میں کاتنے کی مشین ایجاد ہوئی، ۱۷۶۵ء میں بھاپ کا انجن ظہور میں آیا، ۱۷۶۹ء سے ۱۷۷۵ء کے درمیانی عرصے میں سوتی کپڑے کی کئی اور مشینیں ایجاد ہوئیں۔ ۱۷۷۵ء میں مشینی کرگھے ایجاد ہوتے اور ۱۷۸۸ء میں بھاپ کی بھٹیاں کام کرنے لگیں۔

ان ایجادات کے متعلق "عہد جدید میں برطانوی صنعت وتجارت" کے مصنف مسٹر کنگھم نے نہایت دل چسپ بات کہی ہے کہ "بعض وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایجادات و انکشافات صرف قسمت سے ہو جاتے ہیں اور بہت سے لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی میں اتنے بڑے پیمانے پر کئی مشینوں کی ایجادیں اسلیے ہوئیں کہ لوگوں کی ایجادی ذہانت یکایک ابھر آئی جس کی کوئی توجیہہ نہیں کی جاسکتی۔ لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ آرک رائٹ اور ڈاٹ خوش قسمت شخص تھے کہ حالات ان کے موافق تھے تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم ان کی ذہانت اوران کے کارناموں کو گھٹا کر دکھانا چاہتے ہیں ولیم لی اور ڈاڈر ڈڈلے جیسے بے شمار ذہین لوگ اور قابل افراد پیدا ہوئے لیکن حالات ان کے لیے سازگار نہیں تھے۔"

جب قیمتی آلات بنائے جاتے ہیں یا ایسے طریقے معلوم کیے جاتے ہیں جن میں لاگت بہت آتی ہے تو ان کے لیے بڑے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی شخص خواہ کتنا

ہی ذہین اور محنتی کیوں نہ ہو، ایسی کسی چیز پر اس وقت تک محنت نہیں کرے گا جب تک اس کو کافی سرمایہ مہیا نہ ہو اور وہ جو چیز بنائے اس کے لیے وسیع منڈی بھی موجود نہ ہو۔ اٹھارہویں صدی میں ان دونوں چیزوں کے نقطۂ نظر سے حالات زیادہ سے زیادہ موافق بنتے رہے تھے بنک آف انگلینڈ اور دوسرے بہت سے بنک قائم ہو چکے تھے اور ان میں بے انداز سرمایہ جمع ہو رہا تھا۔ اب ایک قابل اور ذہین انسان کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ آسان ہو گیا تھا کہ وہ اپنے کاروبار میں قیمتی اور ترقی یافتہ طریقے رائج کر سکے۔

مارکس نے اپنی مشہور عالم کتاب "سرمایہ" میں وضاحت سے بتایا ہے کہ اس جدید دنیا میں سرمایہ ابتداءً کس طرح اکٹھا ہوا، کس طرح وہ صرف چند لوگوں کے پاس جمع ہوا۔ اور کیسے بڑھا۔ اِس نے لکھا ہے کہ

"یہ سرمایہ سب سے زیادہ مقبوضات کی لوٹ کھسوٹ، میکسیکو اور جنوبی امریکہ کی چاندی، غلاموں کی تجارت اور ہندوستان کی لوٹ اور تجارت سے اکٹھا ہوا۔ روپیہ دنیا میں آیا تو اس کے رخ پر انسانی خون کا داغ تھا۔ لیکن جب سرمایہ دنیا میں آیا تو سر سے پاؤں تک اس کی بوٹی بوٹی انسانی خون اور کیچڑ میں لت پت تھی۔"

اس طرح سے ہندوستان کی تجارتی لوٹ کھسوٹ سے جو دولت اور سرمایہ اکٹھا ہوا شعوری طور پر وہ طاقت تھی جس نے انگلستان میں صنعتی انقلاب بپا کیا۔

انگلستان کے نئے تقاضے

انگلستان میں اٹھارہویں صدی کے آخر میں، ایجادات کے زور اور ہندوستان سے کماتے ہوئے سرمائے کے بل پر جب صنعتیں قائم ہوئیں تو ان کی تیار کردہ اشیاء کی کھپت نے نئے نئے تقاضے پیدا کیے۔ اب تک صورت حال یہ تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان

سے تجارت کی اجارہ داری تھی وہ بھی زیادہ تر درآمد کرتی تھی۔ برآمد کا پلڑا گو روز بروز بھاری ہو رہا تھا لیکن اس کے باوجود کمپنی کا مقصد صرف منافع کمانا تھا۔ اسے اس سے غرض نہ تھی کہ یہ منافع برآمد کے ذریعے حاصل ہو یا درآمد کے۔ لیکن اب صنعتوں کے قیام سے صورتحال بدل گئی تھی اب تو کارخانہ داروں کا مفاد اس میں تھا کہ ان اشیا کی باہر کے ممالک اور بالخصوص مقبوضات میں جائیں، وہاں فروخت ہوں، اُن کے مقابلے میں دیسی مصنوعات نہ آئیں۔ مزید براں ایک کارخانہ دار نہیں تھا کئی ایک کارخانہ دار تھے اس لیے آزاد تجارت ضروری تھی۔

آزاد تجارت کے لیے کمپنی کی اجارہ داری کا خاتمہ ضروری تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہو گیا تھا کہ ہندوستان سوتی کپڑا برآمد کرنے والا ملک نہ رہے بلکہ اب انگلستان میں قائم ہونے والے کارخانوں سے تیار شدہ کپڑا درآمد کرے۔

ان مقاصد کا تقاضا تھا کہ ایک طرف کمپنی کی تجارتی اجارہ داری پر چوٹ لگائی جائے، اور دوسری طرف ہندوستانی کی معاشی زندگی میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ اب ظاہر ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں، ڈائریکٹروں، ممبروں اور حالیوں موالیوں کی فوج ظفر موج اپنی اجارہ داری کے خاتمے کے خلاف ہی ہوگی۔ وہ کب چاہے گی کہ اس کے رنگ میں بھنگ پڑ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اٹھارہویں صدی کے آخری سالوں میں انگلستان اور ہندوستان کے انگریز حلقوں میں زبردست جنگ لڑی گئی۔ اس جنگ میں کمپنی کی بادشاہت اور اجارہ داری ختم کر کے نئے سرمایہ دار طبقے کو حکمران بنانا مقصود تھا تاکہ وہ کھلے بندوں ہندوستان پر اپنی تیار کردہ اشیا مسلط کر سکے اور یہاں کی منڈی کو پوری طرح کنٹرول کرے۔ اس کنٹرول کے لیے حکومت کے جو بھی طریقے ضروری ہوں اپنائے جا سکیں۔

کمپنی اور اس کے نوکروں اور اہل کاروں نے جو اندھا دھند لوٹ مچا رکھی تھی وہ ظاہر ہے ان نئے حالات میں نہیں چل سکتی تھی۔ ان تمام کارخانہ داروں نے مل کر کمپنی کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس ظلم کے خلاف مہم میں وہ تاجر بھی شامل ہو گئے جن کو کمپنی کی لوٹ سے کچھ حاصل نہ ہوتا تھا

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان میں مظالم کی جو صحیح تصویر ہم تک پہنچی ہے وہ ان ہی کارخانہ داروں، محروم تاجروں اور ان کے حامیوں کی مرہون منت ہے۔ کمپنی کی لوٹ کھسوٹ قتل و غارت اور جبرہ دستیوں کی جتنی مکمل رُوداد اس دور میں ملتی ہے بعد میں برطانوی سامراج کے متعلق اس سے کم ہی میسر آتی ہے۔ یہی دور ہے جس میں کمپنی اور اس کے کارندوں کے تمام پہلوؤں کو پوری طرح بے نقاب کیا گیا ہے۔

آزاد تجارت، آدم سمتھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی

آدم سمتھ کو صنعتی سرمایہ داری اور آزاد تجارت کا انگلستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں نقیب سمجھا جاتا ہے، کیونکہ اس نے اس وقت اپنے اقتصادی فلسفے کو انگلستان میں پیش کیا جب ایک طاقت ور طبقے کو اس کی شدید ضرورت تھی، غالباً اس کارخانہ دار طبقے کے تمام حملے جو کمپنی اور اس کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف ہو رہے تھے اتنے موثر اور فیصلہ کن ثابت نہیں ہوئے جتنا آدم سمتھ کا ایک وار کارگر ہوا۔ اس نے کمپنی پر حملے کا آغاز اس طرح کیا کہ اپنی کتاب اس وقت شائع کی جب یہ کارخانہ دار طبقہ کمزور و نحیف تھا۔ لیکن آدم سمتھ کی دُوربین نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ مستقبل اسی طبقے کے ہاتھ میں ہے اور کمپنی کے دن اب لدنے والے ہیں۔ اس نے اپنی کتاب "قوموں کی دولت" شائع کی۔ یہ کتاب کارخانہ دار طبقے اور آزاد تجارت کے حامی سیاست دانوں کی انجیل بن گئی۔ اس کتاب کی تدریس کا پرچار کرنے والوں میں خود انگلستان وزیراعظم ولیم پٹ بھی شامل تھا۔ اس کتاب میں آدم سمتھ کمپنی پر براہ راست حملہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"اس قسم کی اجارہ داری کمپنیاں ہر لحاظ سے تکلیف دہ ہیں۔ یہ جن ملکوں میں قائم کی جاتی ہیں وہاں کے لیے ہمیشہ وبال جان بن جاتی ہیں اور ان ملکوں کے لیے جہاں بدقسمتی سے ان کی حکومت قائم ہو جاتی ہے یہ انتہائی تباہ کن ثابت ہوتی ہیں بحیثیت حکمران ایسٹ انڈیا کمپنی کا مفاد اس میں ہے کہ جو ولائتی مال ہندوستان جاتا ہے

وہ جتنا ممکن ہو اتنا سستا لے۔ اور جو مال ہندوستان سے دوسرے ملکوں میں جائے اس کے دام زیادہ آئیں، یا وہ جتنا مہنگا بک سکے بکے لیکن بحیثیت تاجر اس کا مفاد اس کے بالکل برعکس ہے۔ بہ حیثیت حکمراں انکا مفاد وہی ہے جو اس ملک کا ہے جس پر ان کی حکمرانی ہے اور بہ حیثیتِ تاجران کا مفاد اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ یہ اکیلی حکومت ہے جس کے ملازم ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ جلد سے جلد نوکری چھوڑ کر واپس چلے جائیں اور جس قدر جلد ہوسکے اس سے چھٹکارا حاصل کرلیں۔ جس دن وہ اپنی دولت لے کر واپس آجاتے ہیں تو انھیں اس حکومت سے ذرا بھی دل چسپی نہیں رہتی۔ خواہ اس ملک کو زلزلہ ہی کیوں نہ نگل جائے۔"

ہندوستان کے متعلق پارلیمنٹ کا قانون

آدم اسمتھ نے ایسٹ انڈیا کمپنی پر جو حملہ کیا دراصل یہ روبہ ترقی کارخانہ دار طبقے کی آواز تھی یہ طبقہ کمپنی کی اس لیے مخالفت کرتا تھا کہ کمپنی کی اجارہ داری اس کی اپنی ترقی میں سنگ گراں کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس سنگ گراں کو راستے سے ہٹانے کے لیے ایک طرف فلسفی مصنف اقتصادیات کے ماہر دھڑا دھڑ کتابیں، پمفلٹ اور تقریریں اس کی مخالفت میں چھاپ کر رائے عامہ ہموار کر رہے تھے تو دوسری طرف پارلیمنٹ کے اندر اس کارخانہ دار طبقے کے حامی آواز بلند کر رہے تھے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کمپنی کی پرانی بنیادوں پر حملے اور اس میں تبدیلی کا مطالبہ پارلیمنٹ میں اٹھارہویں صدی کے وسط ہی میں ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ۱۷۸۲ء میں انگلستان کے دارالعوام کی مجلس منتخبہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی دھاندلیوں کے خلاف آواز بلند ہوئی۔ اس کے بعد اگلے ہی سال ۱۷۸۳ء میں فاکس نے ہندوستان سے متعلق ایک مسودۂ قانون پیش کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مالکوں اور ڈائرکٹروں کے کورٹ کو ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے پارلیمنٹ کی طرف سے براہ راست کمشنر مقرر کیے

جائیں۔ لیکن ابھی کمپنی کا اثر باقی تھا اور اس کے ہمنوا دار العوام میں بھی اثر در سوخ رکھتے تھے کیونکہ کمپنی کی لوٹ سے اچھا خاصا گروہ مستفید ہو رہا تھا۔ چنانچہ یہ قانون مسترد ہو گیا۔ اور فاکس کی حکومت مستعفی ہو گئی۔ اس کی جگہ ولیم پٹ برسر اقتدار آیا۔ لیکن اب حالات اس قدر تیزی سے بدلنے شروع ہوئے کہ ولیم پٹ کو بھی فاکس کی قسم کا مسودۂ قانون دار العوام میں لانا پڑا۔ اس سے ایک بات ثابت ہوتی ہے کہ انگلستان کی معاشیات اور سیاسیات میں ہندوستان کو کتنی اہمیت حاصل تھی کہ حکومت کا قیام ہندوستان کے مسئلے سے وابستہ ہو چکا تھا۔

ملی جلی حکومت

۱۷۸۴ء میں ولیم پٹ کا مسودۂ قانون پارلیمنٹ نے منظور کر لیا۔ فاکس کے قانون میں جس کو پارلیمنٹ ایک سال پہلے مسترد کر چکی تھی۔ کچھ اقتدار کمپنی کا بھی باقی رکھا گیا تھا۔ لیکن حقیقتاً اسی قانون کی بنیادی باتیں تمام کی تمام پلٹ کے قانون میں موجود تھیں۔ گو موجودہ قانون میں بھونڈی قسم کی دو عملی کو جنم دیا گیا۔ لیکن ایک بات طے پا گئی تھی کہ ہندوستان پر حکومت کرنے کا براہ راست اختیار پارلیمنٹ کو حاصل ہو گیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وارن ہیسٹنگز کی شدید کی شدید مخالفت کے باوجود منظور ہو گیا۔ اس کی منظوری کے فوری بعد لارڈ کارنوالس کو گورنر جنرل بنا کر ہندوستان بھیجا گیا۔ کارنوالس کو یہ عہدہ سونپنے کا مقصد وحید کمپنی کے پرانے طریقوں اور دھاندلیوں پر قابو پانا تھا۔ چنانچہ ایک طرف ہندوستان میں کارنوالس کے ذریعے نظم و نسق میں بدانتظامی اور بددیانتی کے الزامات میں مقدمہ دائر کیا گیا۔ یہ مقدمہ دراصل ایک شخص کے خلاف نہیں تھا

گویا اس کی نوعیت سیاسی تھی جس کا مقصد کمپنی کے مظالم کو بے نقاب کر کے ایسی فضا ہموار کرنا تھا جس میں اسے ہندوستان میں حکومت کرنے کے تمام اختیارات سے محروم کر دیا جائے۔

فرانس کا انقلاب

انگلستان کی سیاست میں ابھی یہ جنگ اقتدار جاری تھی کہ فرانس کے انقلاب نے پوری دنیا کو چوکنا اور بیدار کر دیا۔ مساوات اور بھائی چارے کے جو نعرے پیرس میں بلند ہوتے تھے انھوں نے انگلستان کے کارخانہ دار اور آزاد تجارت کے حامی سیاست دانوں کو بھی پریشان کر دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ کل کے اصلاح پسند، لبرل اور آزادی کے نام لیوا سب سے زیادہ رجعت پسند طبقے کے طور پر سامنے آئے۔ وہی ایڈمنڈ برک جو ہندوستان میں انگریزی کمپنی کی بدانتظامی اور ظلم کے خلاف شدت سے آواز بلند کیا کرتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ فرانسیسی عوام کی آزادی کا مخالف بن گیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان کے اندر جو جنگ جاری تھی اس کا عمل رک گیا اور کمپنی کو اقتدار سے محروم کرنے کا سلسلہ بوجوہ کچھ عرصے کے لیے کھٹائی میں پڑ گیا۔ لیکن اس کا ردعمل ہندوستان میں شروع ہو گیا اور کمپنی کے مقبوضہ علاقے میں توسیع کی رفتار تیز تر ہو گئی۔ اور انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں ہندوستان کا نقشہ عجیب و غریب دکھائی دینے لگا۔

ہندوستان کے اکثر علاقوں میں برطانوی پرچم لہرانے کا سہرا ولزلی کے سر باندھا جاتا ہے اور یہ کسی حد تک درست ہے۔ لیکن اصل میں یہ توسیع مملکت اس پالیسی اور ان ضرورتوں کی مرہونِ منت تھی جنھیں انقلاب فرانس نے اور بعد میں نپولین کے حملوں نے انگلستان میں پیدا کر دیا تھا۔ انگلستان کو اس وقت وسیع ہندوستان اور مستحکم ہندوستان کی اشد ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لارڈ کارنوالس نے تمام مواعید کو پسِ پشت ڈال کر ٹیپو سلطان کو نیچا دکھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ انیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جب ولزلی ہندوستان سے روانہ ہوا تو دکن اور اس کے اردگرد کے تمام علاقے کمپنی کے زیر اثر آ چکے تھے۔ اندور اور گوالیار کو تین طرف سے انگریز گھیرے میں لے چکے مرہٹوں کی طاقت کو کافی حد تک کمزور کیا جا چکا تھا۔ راجپوتانہ، پنجاب اور سندھ وغیرہ پر انگریز

براہِ راست قابض نہیں ہوا تھا۔ لیکن تمام علاقے زبردست انتشار اور خلفشار کا شکار ہو چکے تھے۔ ان میں سے کسی کے اندر اتنا کس بل نہ تھا کہ وہ برطانوی اقتدار کو للکار سکے یا اس کا مقابلہ کر سکے اس لیے انگریز ان سے بے پروا تھے کیونکہ ان سب سے بڑھ کر وہ دہلی جو ایک سلطنت کا نشان ہوا کرتی تھی۔ اس پر ان کا عمل دخل پوری طرح ہو چکا تھا بقول ہاشمی فرید آبادی :-

"اکبر و عالمگیر کا وارث انگریز ریذیڈنٹ کے ہاتھ میں گڈا بن گیا تھا کہ وہ جس کل چاہے اٹھائے بٹھائے اس کے بعد ولزلی مئی ۱۷۹۸ء میں ہندوستان آیا تو اس اکھاڑے میں کئی برابر کے پہلوان زور آزمائیاں کر رہے تھے سات سال بعد وسط ۱۸۰۵ء میں جانے لگا تو سب پچھڑ چکے تھے یا ہانپنے لگے تھے کمپنی بہادر کی ٹکر کا حریف اب کوئی نظر نہ آتا تھا۔"

یہ فضا اور سیاسی صورت حال تھی جس میں شاہ عبدالعزیز کی رہنمائی میں سید احمد کو اصلاحِ دین کی تحریک چلانا تھی۔ لیکن داستان کی ورق گردانی سے قبل اس زمانے کے سکھوں کی حالت پر بھی تفصیلی گفتگو اس لیے ضروری ہے کہ سکھوں نے اس تحریک کو کافی حد تک متاثر کیا ہے۔ گویا ایک طرف ہندوستان کے علاقوں میں انگریزوں کی ریشہ دوانیاں اور فتوحات، دوسری طرف سکھ اور تیسری طرف انگریزی تسلط سے دینی امور پر اثرات نے مل کر سید احمد کو جہاد کی راہ اختیار کرنے پر مجبور کیا ہوگا۔ اصل حقائق کی چھان بین کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ پوری فضا کا جائزہ لیا جائے۔ جہاں تک سید احمد کی تحریک کا تعلق ہے وہ تو اب بہ افراط مل جاتی ہیں۔ لیکن سیاسی اور سماجی حالات کے متعلق ابھی تک زیادہ تفصیلات مہیا نہیں کی گئیں۔ اس لیے ان کا فراہم کرنا ضروری ہے۔

سید احمد شہید نے جب پہلی بار دہلی میں قدم رکھا تو شباب کی آمد آمد تھی، ولولے، جوش اور کچھ کر گزرنے کا دور تھا۔ اسی عالم میں شاہ عبدالعزیز جیسا رہنما میسر آیا۔ یہ جوانی اور شاہ صاحب کی رہنمائی، ظاہر ہے کہ اس نے سید احمد کی زندگی کو شدت کے ساتھ متاثر کیا ہوگا اور خود دہلی میں

جو عالم تھا اس نے بھی ان کی زندگی پر یقینی بات ہے کہ اپنی چھاپ لگائی ہوگی اور یہ چھاپ اس زندگی کے خلاف شدید ردعمل ہو گا۔ جو شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر اور مسجد اکبرآبادی کے باہر نظر آرہی تھی اور جو اس ملک کی سیاسی زندگی کی تصویریں کھینچی جا چکی ہیں۔ عقائد دینیہ کی حالت کا بھی تذکرہ ہو چکا ہے۔ غرضیکہ یہ زندگی تھی، مایوسی اور نا امیدی کی زندگی تھی۔

یہ درست ہے کہ اس نا امیدی اور مایوسی کی زندگی کے خلاف یہ خانوادہ سینہ سپر تھا۔ اور اسی کے ہاں سید احمد پناہ لینے اور رہنمائی حاصل کرنے کے لیے کشاں کشاں آتے تھے۔ لیکن تنزل اور احیاء اس زندگی کا خاصہ بن گیا تھا۔ بقول شیخ اکرام:

"تیرہویں صدی ہجری ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اہم کش مکش کی حامل تھی۔ ان کے سیاسی تنزل کی تکمیل اسی صدی میں ہوئی۔ لیکن ان کے مذہبی احیاء اور معاشرتی اصلاح کے آغاز کا زمانہ بھی یہی تھا۔ اب ہندوستان کا اکثر حصہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ بہت سی معاشرتی اور مذہبی خامیاں جن پر مغلوں کی حکومت کے زمانے میں پردہ پڑا ہوا تھا بے نقاب ہو گئی تھیں۔"

مسلمانوں کے تنزل کی داستان وضاحت سے بیان کی جا چکی ہے اور اس زمانے کی دہلی کا نقشہ بھی کھینچا جا چکا ہے۔ اس دہلی میں سید احمد وارد ہوتے اور شاہ عبدالعزیز کے درس میں پہنچے۔ اس سے پہلے ہونے والے استاد نے نہ تو اپنے ہونے والے شاگرد کا نام سنا تھا اور نہ اسے دیکھا تھا۔ یہی حال اس نوجوان طالب علم کا تھا۔ اس نے بھی پہلی بار اس نادرِ روزگار ہستی کو دیکھا تھا۔ اس نوجوان نے اپنے استاد تک پہنچنے کے لیے نہ تو کسی کو واسطہ بنایا اور نہ ہی کوئی سفارش تلاش کی۔ بے دھڑک شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں جا پہنچا۔

بہ قول مولانا مہر:

شاہ عبدالعزیز نے معمول کے مطابق مصالحت اور معانقت کے بعد پاس بٹھا کر پوچھا۔ کہاں سے آتے ہو؟

سید احمد: رائے بریلی سے۔

شاہ صاحب: "کس قوم سے تعلق رکھتے ہو"؟

سید احمد: "وہاں کے سادات سے منسوب ہوں"۔

شاہ صاحب: "سید ابوسعید اور سید نعمان کو جانتے ہو؟"

سید احمد: سید ابوسعید میرے حقیقی نانا تھے اور سید نعمان حقیقی چچا۔

یہ سنتے ہی شاہ صاحب نے دوبارہ گرم جوشی سے معانقہ فرمایا، کس غرض سے اتنے لمبے سفر کی صعوبت گوارا فرمائی؟

سید صاحب نے عرض کیا کہ آپ کی ذات مقدس کو غنیمت سمجھ کر اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی طلب میں پہنچا ہوں۔

شاہ عبدالعزیز نے فرمایا خدا کا فضل شامل حال ہے تو اپنی پدری اور مادری وراثت حاصل کر لوگے۔ پدری اور مادری وراثت سے اشارہ ذہنی اور رُوحانی تربیت کے ان مدارج عالیہ ہی طرف تھا۔ جو سید ابوسعید اور سید نعمان حاصل کر چکے تھے۔ پھر ایک خادم کو حکم دیا کہ انھیں میرے بھائی مولوی عبدالقادر کے پاس اکبرآبادی مسجد میں پہنچا کر ان سے کہنا کہ اس مہمان عزیز کا مفصل حال میں خود ملاقات کے وقت بیان کروں گا۔ انھیں غنیمت سمجھیں اور ان کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہ کریں۔"

تعلیم و تربیت کے مراحل

سید احمد نے جس تحریک کی قیادت کی اس نے برصغیر کے مسلمانوں کو قریب قریب ایک صدی تک متاثر کیا اور ایک وقت میں پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر لی تھی یاس و ناامیدی کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں فقط یہی ایک امید کی کرن یا درخشاں مستقبل کی شمع بن کر چمک رہی تھی۔ اس تحریک کی روشنی سے کئی اور تحریکوں کے چراغ روشن ہوئے اور جب یہ تحریک ناکامی سے بھی دوچار ہوئی تو اس کی ناکامی نے بھی کئی کامیاب تحریکوں کو جنم

دیا۔ نئے قائدین کو نئے سرے سے کام کرنے پر ابھارا۔ غرضیکہ ایک سلسلہ شروع ہوا جو کسی نہ کسی انداز میں فکری طور پر مسلمانوں کے ایک حصے کو متاثر ضرور کرتا ہے اس لیے اس تحریک کا ذکر تفصیل چاہتا ہے۔ کیونکہ دورِ جدید کی بہت سی تحریکوں کے بارے میں جو ذہنی انتشار پایا جاتا ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ دورِ قدیم اور بالخصوص انیسویں صدی کی ان تحریکوں اور ان کے پس منظر کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

سید احمد کی تحریک سے عام پڑھے لکھے اور جید علمائے کرام دونوں کو روشناس کرانے کا سہرا مولانا غلام رسول مہر کے سر بندھتا ہے۔ اس تحریک پر جس قدر جانفشانی سے انھوں نے کام کیا ہے وہ اب کسی کے مقدر میں نہیں۔ انھوں نے نہ صرف تحریک پر تفصیل سے سیر حاصل بحث کی ہے بلکہ اس کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے۔ مجھے اس سلسلے میں ان تفاصیل کا ذکر نہیں کرنا۔ میرا مقصد اس تحریک کے صرف ان پہلوؤں کا ذکر ہے جس سے اس تحریک کے آئندہ اثرات کی ترتیب کا پتہ چلایا جا سکے۔ اور اس کے لیے ملکی، غیر ملکی اور بین الاقوامی پس منظر میں ان اثرات کا جائزہ لیا جا سکے۔ کیوں کہ ان ہی اثرات سے مسلمانوں کی بعد میں جنم لینے والی تحریکیں متاثر اور مستفید ہوتی رہیں۔ اور تو اور تنظیمی ڈھانچہ بھی تحریکوں کے لیے سید احمد کی اسی تحریک سے کسی حد تک مستعار لیا جاتا رہا تھا۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ جب آئندہ دو فکر پہلو بہ پہلو رائے عامہ کو متاثر کرنے لگے تو اس فکری ٹکراؤ کو سمجھنے کے لیے بھی اس تحریک کے بعض پہلوؤں کو سمجھنا ضروری ہے کیوں کہ سر سید احمد خاں کی تحریک علی گڑھ ہو یا مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تحریک دیوبند، بہر حال یہ دونوں تحریکیں ایک نہ ایک رنگ میں سید احمد شہید ہی کی تحریک سے متاثر ہوئی ہیں۔ اس لیے سید احمد اور ان کے رفقائے کار کی علمی اور عملی کاوشوں کا ذکر لابدی ہو جاتا ہے۔

سید احمد کی ذات بہت سے پہلوؤں سے متنازعہ فیہ بنی رہی ہے۔ ایک گروہ نے انھیں امام تسلیم کیا، ایک نے مہدی قرار دیا۔ ایک نے امام غائب تسلیم کیا اور مدتوں

انتظار میں رہا کہ ان کی شہادت پر یقین نہ کیا بلکہ یہ اعلان کیا کہ امام آنکھوں سے غائب ہوا ہے۔ اس کی واپسی ایک نہ ایک دن ہو گی۔ پھر وہ فتح کے جھنڈے گاڑے گا۔ اس دارالحرب کو دارالسلام بنا دے گا۔ مزید برآں یہ جھگڑا ابھی رہا کہ یہ احمد امی تھے یا عالم، اس لیے ان مسائل کی ذرا تفصیل میں جانا چاہیے۔

سیّد احمد شہیدؒ
اور
صاحبِ شمشیر کی تلاش

بیسویں صدی میں برطانوی شہنشاہیت اوراس کے نوآبادیاتی نظام کو شکست دینے کے لیے عدمِ تعاون ہی کا وقت کا ایک موثر ترین حربہ تسلیم کیا گیا ہے ۔ کیوں ؟ اس لیے کہ برطانوی شہنشاہیت کے خلاف مسلح بغاوت ناممکن تھی ۔اس لیے کسی تحریک کے لیے ایک ہی اسلوب اور طریق کار رہ گیا تھا کہ رائج الوقت حکومت سے ایک طرف عدمِ تعاون کیا جائے اور دوسری طرف اس کے منتخب اداروں کے اندر جاکر اس نظام اوراس کے ملوکانہ عزائم کو بےنقاب کیا جائے ۔ رائے عامہ کو بیدار کیا جائے کیونکہ بیسویں صدی میں منتخب ادارے کسی نہ کسی حد تک وجود میں آچکے تھے اور جب منتخب ادارے وجود میں آئیں تو رائے عامہ کی تنظیم بھی لابدی ہوجاتی ہے اوراس کی اہمیت بھی مسلّم ہوجاتی ہے ۔ اسی لیے ایسے زمانے جو بھی تحریک منظم ہوگی ۔ وہ رائے عامہ کی تنظیم کی بنیادوں پر استوار ہوگی ۔ اس دور میں ووٹ جلوس ، جلسہ ، اور مظاہروں کو اہمیت حاصل ہوگی اور عدمِ تعاون اس تنظیم کی بنیاد ہوگا ۔

ڈیڑھ صدی قبل کے حالات کو سامنے رکھیے ؛ اس وقت تک برطانوی ملوکیت کے

پاؤں پوری طرح جمے نہیں تھے اس لیے منتخب اداروں کے وجود میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس وقت تو ہتھیار اور فوج ہی اور ایک طریق کار تھا جس سے کوئی حکومت بدلی جا سکتی تھی چنانچہ اس وقت اور اس زمانے میں مسلمانوں کی ایسی حکومت دوبارہ ہندوستان میں قائم کرنے کے لیے جس کا کام پورے ملک کو ایک مرکزی حکومت کے ماتحت لانا ہو تاکہ امن بحال ہو سکے، استحکام پیدا ہو سکے، چھوٹی چھوٹی نوابیاں اور نجی فوجیں جو لوٹ مار کو اپنا پیشہ بنائے ہوئے تھیں ختم ہوں۔ بیرونی اثرات سے ملک کو نجات دلائی جا سکے۔ جس قسم کی تحریک وجود میں آسکتی تھی، ظاہر ہے اس کے لیے ہتھیار اور فوج کی ضرورت تھی۔

سید احمد کو اگر تحریک کی قیادت کرنا تھی، خواہ یہ قدرت کی طرف سے انھیں تفویض کی گئی تھی، یا خانوادۂ ولی اللّٰہی نے شعوری طور پر اس وقت کے حالات میں ایک تحریک کو منظم کرنے کا منصوبہ مرتب کیا تھا، بہرحال اس وقت کا تقاضا یہی تھا کہ اسلحہ اور فوج فراہم کی جائے۔ تحریک کی بنیادی ضرورت یہی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سید احمد اس ضرورت کو پورا کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ کسی کو معلوم نہیں کہ یہ سپہ گری کا پیشہ آئندہ تحریک کے لیے اختیار کیا جا رہا تھا۔ بہرحال تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے اسی پیشے کو اپنایا۔ سید صاحب نے جب تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر کے دہلی کی سکونت کو ترک کیا تو ان کی عمر بائیس تیئس برس ہو گی۔ جس وقت آپ دہلی سے رخصت ہوئے تو شاہ عبدالعزیز نے وہ خاندانی عصا بھی آپ کے حوالے کر دیا تھا جو ان کے جدِ امجد شاہ عبدالرحیم کے زمانے میں رائے بریلی سے دہلی آیا تھا کیا یہ اس بات کا اعلان نہ تھا کہ خانوادہ ولی اللّٰہی نے اب سید احمد کو اپنا قائد تسلیم کر کے تمام ظاہری لوازمات سید صاحب کو مہیا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔؟

سپہ گری

سید احمد نے بمشکل دو تین برس اپنے آبائی گاؤں رائے بریلی میں قیام کیا ہو گا کہ وہ روزی کمانے کے لیے وطن سے چل کھڑے ہوئے انھوں نے نواب امیر خاں کے ہاں ملازمت

اختیار کر لی۔ مجموعی طور پر اس ملازمت کی بڑی وجہ غالباً یہی تھی کہ سید احمد کے بڑے بھائی سید ابراہیم پہلے ہی سے نواب امیر خاں کے ایک سپاہی کی حیثیت سے فوج میں داخل ہو چکے تھے۔ لیکن ان کے زہد و تقویٰ نے ان کو فوج کی امامت دلوا دی۔ اسی زہد و تقوےٰ کے چرچے نے سید احمد کے لیے بھی ملازمت حاصل کرنے میں آسانی پیدا کر دی ہو گی۔ لیکن اس ملازمت کے وجوہ اور پس منظر کے بارے میں خاصا اختلاف رائے پایا جاتا ہے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ عام دنیاوی ضرورتوں اور کسب معاش کی ضرورتوں نے سید احمد کو نواب امیر خاں کے لشکر میں پہنچا دیا۔ کیونکہ اس وقت علاقے کے تمام نوجوانوں کے لیے کسبِ معاش کا یہی ایک دروازہ رہ گیا تھا۔ جو بھی اٹھتا اسی دروازے پر دستک دیتا۔ سید صاحب بھی اسی ضرورت و رواج کے مطابق چلے آئے تھے اور ان کو بھی ملازمت مل گئی۔ لیکن دوسرا گروہ اس موقف کو تسلیم نہیں کرتا۔

اس گروہ کا کہنا ہے کہ سید صاحب کو غیبی اشارات ہوئے اور ان کو اپنے دینی مقاصد کی تکمیل کے لیے یہاں آنا پڑا۔ اس گروہ کے امام مولانا غلام رسول مہر ہیں وہ اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ سید صاحب نے نواب کے پاس جانے کا فیصلہ کیوں کیا؟ کیا محض معیشت کی مجبوری انھیں کھینچ کر لے گئی تھی؟ اب تک سید صاحب کے جو حالات بیان کیے جا چکے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسباب معیشت کی ترتیب و فراہمی سے ان کی طبیعت کو کوئی مناسبت نہ تھی اس کی وجہ مولوی محمد جعفر تھانیسری نے جو بعد میں انبالہ سازش کیس میں سب سے اہم ملزم قرار پائے تھے۔ سید احمد کی سوانح میں یوں بیان کی: سید احمد کو واسطے تکمیل اپنے حال کے اس وقت اخفا منظور تھا اور نیز اس جوہر سپہ گری کی بھی جو آپ کے اندر ودیعت تھی مشق کرنی منظور تھی۔"

اب جہاں تک مولانا مہر کا تعلق ہے۔ وہ مولانا محمد جعفر کی اس وجہ سے اختلاف رکھتے

ہیں اوران کا کہنا ہے کہ جہاں تک تکمیل حال اوراخفا کے مدعا کا تعلق، وطن یا دہلی میں بطریق احسن پورا ہوسکتا تھا۔ اس زمانے میں سید احمد، ولی اللہ خاندان کے ہزاروں مریدوں میں سے ایک گمنام اور معمولی مرید تھے۔ وہ جہاں بھی بیٹھ جاتے تکمیل حال اور اخفا کے مقاصد کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔

پیشہ سپہ گری کے مختلف پس منظر

سید صاحب کے امیر محمد خاں کی فوج میں ملازمت کرنے اور سپہ گری کو بطور پیشہ اختیار کرنے کے متعلق مختلف تصریحات ہیں ایک موقف تو یہ ہے جس کا اظہار مولانا محمد جعفر کرتے ہیں کہ:

"سپہ گری کی مشق و مہارت ان کو نواب کی فوج میں کشاں کشاں لے جانے کا باعث ہوئی۔"

لیکن مولانا مہر یہاں بھی اختلاف رکھتے ہیں کہ:

"سپہ گری کی مشق کا وہ پیمانہ سید صاحب کے زمانے میں موجود ہی نہیں تھا جس کے تصور میں ہم لوگ سرمست ہیں۔ عام ہتھیاروں کا استعمال سب لوگ جانتے تھے۔ لڑائیوں کا طریقہ ایسا تھا کہ جواں مردی اور استقامت کو ہی کامیابی کا سب سے بڑا "گر" سمجھا جاتا تھا۔ خود نواب امیر محمد خاں نے کون سی عسکری تربیت گاہ میں سپہ گری کے ہنر سیکھے تھے؟ کہ اس کے لشکر میں شمول جوہر سپہ گری کی مشق کے لیے زیادہ موزوں نظر آیا۔ جب سید صاحب نے خود مستقل فوجی تنظیم کا بندوبست کیا تھا تو ان کے رفیقوں میں سے کتنے تھے جن کے لیے سپہ گری کی باقاعدہ مشق و تربیت کا انتظام کیا گیا تھا۔ شاہ اسمٰعیل شہید سید صاحب کے سپہ سالاروں میں سب سے ممتاز مانے جاتے تھے۔ انھوں نے کب اور کہاں سپہ گری کی مشق کی تھی؟ آخر میں یہ بھی ظاہر ہے کہ سید صاحب نے سات برس نواب

کے لشکر میں گزارے، وہ مختلف لڑائیوں میں شریک بھی ہوئے لیکن جس حد تک میں معلوم کر سکا ہوں، نہ اس کے لشکر میں جنگی فنون کے لیے مشق کی کوئی تربیت گاہ موجود تھی، اور نہ سید صاحب کو کسی تربیت گاہ میں کم یا زیادہ مدت بسر کرنے کا موقع ملا۔"

جہاں تک اس لشکر میں ملازمت حاصل کرنے اور اس کی لڑائیوں میں شرکت کے حقیقی مقاصد کا تعلق ہے اس کے متعلق مولانا مہر کی یہی رائے ہے کہ۔

"سید احمد کو وہی جذبۂ دین کشاں کشاں نواب کے لشکر میں لے گیا تھا جس کی بناء پر انجام کار انھوں نے بطور خود فداکاروں کی ایک جماعت مرتب کی اور حیاتِ طیبہ کے گراں بہا اوقات جان بازی و جانفشانی میں صرف کر دیے یعنی وہ اسلامی حکومت کے احیاء کی خاطر جہاد فی سبیل اللہ کا عزم لے کر نواب کے پاس گئے تھے۔ لیکن حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ امید و آرزو کا یہ چراغ زیادہ دیر روشن نہ رہ سکا۔ یہاں تک کہ سید صاحب کو نواب سے الگ ہو کر خالص اسلامی اصولوں پر ایک جماعت منظم کرنی پڑی۔ اس سلسلے میں خود سید صاحب نے بعض غیبی اشاروں کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اسی غیبی تائید کی بنا پر وہ امیر خاں کے لشکر میں پہنچے تھے، چنانچہ وقائع احمدی میں ایک روایت درج ہے کہ سید صاحب جن دنوں نواب امیر خاں کے لشکر میں تھے تو انھوں نے خود فرمایا:

"قصبۂ رائے بریلی میں مجھ کو جناب الٰہی سے الہام ہوا کہ یہاں سے نواب نامدار امیر الدولہ بہادر کے لشکر میں جا اور وہاں کی خدمت ہم نے تجھ کو دی، وہاں ہم کو تجھ سے کچھ اور کام بھی لینے ہیں۔ یہ مژدۂ غیبی سن کر میں وہاں سے روانہ ہوا۔ چند روز میں آ کر ملازمت نواب صاحب ممدوح سے حاصل کی۔"

اسی طرح سے ایک اور جگہ سید صاحب کے متعلق کہا گیا ہے کہ:

"حضرت امیر المومنین اقامت جہاد کے متعلق غیبی اشاروں کی بناء پر امیر الدولہ نواب

امیر خاں مرحوم کے لشکر ظفر اثر کی جانب روانہ ہوتے۔"

ان شہادتوں سے سوانح نگاروں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نواب امیر خاں کی ملازمت میں غیبی اشارے تھے اور ان اشاروں ہی کی بنا پر سید احمد نے سات برس نواب کی ملازمت میں صرف کر دیے۔

نواب امیر خاں

معاملہ کچھ بھی ہو لیکن ایک بات واضح ہے کہ سید صاحب کے لیے اپنی دینی اور سیاسی تحریک اور اس کی قیادت دونوں کے اعتبار سے یہ نوکری اور یہ پیشہ سود مند ثابت ہوا اس لیے کہ اس دور میں تحریکوں کے لیے خواہ وہ دینی ہوں یا سیاسی، فوجی امداد و تنظیم اور اسلحے کا حصول ضروری تھا۔ لیکن سید احمد نے سات برس نواب کے یہاں جو قیام کیا اس میں مقصد سپہ گری کے ساتھ یہ بھی تھا کہ نواب کو اسلامی سلطنت کے احیاء کا مظہر بنایا جائے اور اس امر کے لیے اسے تیار کیا جائے کہ وہ ہندوستان کو ایک آزاد اور مستحکم صورت دینے کے لیے اپنے ذرائع مجتمع کرے۔ یہ دراصل وہی پرانا نظریہ تھا کہ کسی نواب، کسی راجا اور کسی بادشاہ کی اس قدر تائید حاصل ہو جائے کہ وہ اس فوجی قیادت کا مظہر بن جائے۔ اسی نظریے اور ضرورت کی تکمیل میں شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملے کے لیے اکسایا تھا اور ان ہی مقاصد کے لیے نجیب الدولہ کو متعدد مکتوبات تحریر کیے تھے۔ دراصل یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ انسانی فکر ایک حد تک اپنے طبقاتی اور ارد گرد کے ماحول کا بہت حد تک مقید ہوتا ہے اور اس وقت تک نئے فکر کے لیے راستہ ہموار نہیں ہوتا۔ جب تک نئے طبقے پیدا ہوں جو اس انقلابی فکر کے ایک طرف متقاضی ہوں۔ دوسرے ان میں اس فکر کے اطلاق کا یارا ہو۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ شاہ ولی اللہ کے فکر کے انقلابی ہیئت کے باوجود اس کے اطلاق کے لیے ہمیشہ جاگیر دار طبقہ کا سہارا لیا جاتا رہا اس کی وجہ صاف تھی کہ جاگیر دار طبقے کو ختم کرنے کے جس طبقے کا وجود ضروری تھا وہ پوری شدت

سے وجود میں نہیں آیا تھا اور خود یہ علماء کا طبقہ اپنے انقلابی افکار کے باوجود اسی جاگیر دار طبقے سے اس قدر وابستہ اور منسلک تھا کہ ان کو نئی ضرورتوں اور تبدیلیوں کے لیے ہر پھر کر یہی طبقہ اور اسی کے نواب اور راجاؤں پر نظر پڑتی تھی۔

دراصل یہی مقاصد تھے جن کی تکمیل کے لیے سید صاحب امیر خاں نواب کے ہاں ملازم ہوئے تھے اس سلسلے میں تفصیلات میں جانے سے پہلے ضروری ہے کہ امیر خاں کے حالات پیش نظر ہوں۔ کیوں کہ حالات خود اس امر کی شہادت دیں گے کہ سید احمد اور ان کے رفقا، مشیر ہی نہیں بلکہ ان کے رہنما بھی اس امید میں تھے کہ شاید نواب امیر خاں ان دگرگوں حالات اور روبہ تنزل دور میں انگریز اور دوسری طاقتوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کے لیے تیار کیا جا سکے کیونکہ اس وقت کوئی اور مسلمان نواب اور فرمانروا اتنا باہمت موجود ہی نہ تھا جو اس اہم ذمہ داری کو اٹھانے کا تصور بھی ذہن میں لا سکتا۔

امیر خاں کا دادا طالع خاں سرحد کے علاقے سے آیا تھا۔ طالع خاں سرحد کے قبیلے سالارزئی سے تعلق رکھتا تھا۔ جب یہ ہندوستان میں وارد ہوا تو یہاں محمد شاہ کا دور حکومت تھا۔ طالع خاں اپنے ایک دوست زمان خاں جمعدار کی تحریک پر سنبھل ضلع مرادآباد کے ایک محلہ سرائے میں سکونت اختیار کر لی۔ طالع خاں روہیل کھنڈ کی لڑائیوں میں داد شجاعت دیتا رہا اور سنبھل ہی میں بالآخر فوت ہوا۔ اس کے لڑکے محمد حیات خاں نے بھی اپنے باپ کا پیشہ اختیار کیا اور نواب ڈونڈے خاں کے لشکر میں ملازم ہو گیا۔ لیکن جب روہیلوں کو شجاع الدولہ اور انگریزوں نے مل کر شکست دی اور حافظ رحمت خاں مارا گیا تو اس کی فوج تتر بتر ہو گئی اور محمد حیات خاں نے سپہ گری کو چھوڑ کر زراعت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اسی زمانے میں اس کے ہاں امیر خاں پیدا ہوا۔ اس کا سنِ پیدائش ۱۷۶۸ء بتایا جاتا ہے۔ بیس برس کی عمر تک یہ زراعت میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ لیکن بعد میں ملازمت کے لیے گھر سے نکلا تاکہ کسی جگہ ملازمت اختیار کر سکے۔ اکثر جگہ اسے ناکامی ہوئی۔ دوستوں نے مل کر لوٹ مار شروع کر دی اس طرح سے ہمجولیوں کا ایک مختصر سا لشکر تیار ہو گیا۔ اس زمانے میں افراتفری کا عالم تھا۔ نوابوں اور رئیسوں نے باقاعدہ فوج رکھنے

کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ کیونکہ فوجیوں کو باقاعدگی سے تنخواہیں ادا کرنے کی سکت ہی نہیں رہی تھی جب کوئی مہم درپیش ہوتی تو فوج بھرتی کر لی جاتی اور جب ضرورت رہتی تو یہ فوج بھی منتشر کر دی جاتی۔ چنانچہ امیر خاں نے بھی وسطِ ہند، گجرات و دکن وغیرہ کئی مقامات پر ایسی ہی مہموں میں شرکت کی اور اس سے جو مال حاصل ہوا اپنے دوستوں کو اس سے نہال کر دیا۔ اس طرح اس کے پاس خاص جان نثاروں کا ایک اچھا خاصا حلقہ پیدا ہو گیا۔ آدمی من چلا تھا۔ فراخ حوصلہ تھا روپیہ ہاتھ میں ہوتا تو دوستوں کو نہال کر دیتا۔ نہ ہوتا تو ان کے ساتھ ان ہی کی طرح گزر بسر کر لیتا۔ پھر جب کوئی شکار ہاتھ آجاتا تو یاروں دوستوں سمیت خوب عیش کرتا۔ اس طرح اس نے خاصی جمعیت پیدا کر لی تھی اور نام بھی پیدا ہو گیا تھا۔

مرہٹوں سے تعلق

اس زمانے میں مرہٹوں میں بڑی جوتم پیزار ہو رہی تھی۔ مختلف مرہٹے سردار ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو رہے تھے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ اس باہمی لڑائی سے انگریز فائدہ اٹھا رہے تھے وہ کبھی ایک مرہٹہ سردار کا ساتھ دیتے اور کبھی دوسرے کا۔ اس طرح نہ صرف وہ مرہٹوں کو متحد نہ ہونے دیتے تھے بلکہ کمزور کر رہے تھے اور طاقت کا توازن بھی انگریز کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ جس طرف انگریز اپنا وزن ڈال دیتا پلڑا اُدھر ہی کا بھاری ہو جاتا اور فتح اس کا مقدر ہو جاتی۔ اسی زمانے کی بات ہے کہ ایک مرہٹہ راجکمار جسونت راؤ ہلکر اپنے باپ کی وفات کے بعد دوسرے مرہٹوں کی شہ زوری سے اپنے باپ کی گدی سے محروم ہو گیا اور بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگ سکا اس نے اپنی گدی واپس لینے کے لیے ایک چھوٹی سی جمعیت حاصل کی اور ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اسی زمانے میں امیر خاں کی بہادری اور شہ زوری کے چرچے ہو رہے تھے راؤ کے دوستوں نے مشورہ دیا کہ امیر خاں سے دوستی ہونی چاہیے۔ چنانچہ جسونت راؤ اور امیر خاں میں ملاقات ہوئی۔ دونوں کو ایک دوسرے کے مزاج بہت پسند آئے اور عہد و پیمان ہو گئے کہ ایک دوسرے کا ساتھ کبھی نہ چھوڑیں گے۔ اس زمانے کے مطابق پگڑیاں بدل کر دوستی

کے عہد و پیمان ہوئے اور برادرانہ تعلقات کا اعلان کیا گیا اس کے بعد دونوں نے مل کر مہمیں شروع کیں جو ہاتھ آتا آدھا آدھا بانٹ لیتے۔

مرہٹوں اور انگریزوں کے درمیان جب جنگ کا آغاز ہوا تو جسونت راؤ اور امیر خاں اس جنگ سے الگ رہے۔ انگریز اس وقت جسونت راؤ سے مستقل صلح کر لینا چاہتے تھے۔ لیکن راؤ نے اس قدر کڑی شرطیں پیش کیں کہ انگریز ان کو تسلیم کرنے پر رضامند نہ ہوئے۔ نتیجہ اس صلح و شرائط کا یہ ہوا کہ انگریز اور راؤ و امیر میں اعلان جنگ ہو گیا۔ ان دونوں نے مل کر انگریزوں کو خوب پریشان کیا۔ وہ اسی لڑائی کے دوران پنجاب بھی آئے۔ اس سے انگریزوں کو خوف پیدا ہوا کہ سکھ اگر جسونت و امیر سے مل گئے تو زبردست خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اور انگریزوں نے جسونت سے صلح کی گفتگو شروع کی اور اندور کی ریاست دینے کا وعدہ کیا مگر امیر خاں نے صلح کرنے سے انکار کر دیا اور اعلان کر دیا کہ وہ کابل سے شاہ شجاع کو اپنے ہمراہ لائے گا۔ اگر وہ نہ آیا تو سرحد پار سے اپنے قبائل کی فوج تیار کر کے انگریزوں کا مقابلہ کرے گا۔ امیر خاں کے اس اعلان سے انگریزوں سے زیادہ جسونت راؤ کے حامیوں اور ساتھیوں کو خطرہ پیدا ہو گیا۔ انھوں نے سوچا کہ اگر امیر خاں اپنے افغانوں کی فوج لیکر آیا اور انگریزوں کو شکست دے دی تو امیر خاں بادشاہت کا حقدار ٹھہرے گا اور جسونت راؤ محروم رہے گا۔ اس لیے جسونت راؤ کے ساتھیوں نے اسے اندور کی ریاست لے لینے اور انگریزوں سے صلح کر لینے کا مشورہ دیا۔ لیکن انگریز اس وقت تک صلح کرنے پر تیار نہ تھے جب تک اس صلح پر امیر خاں کے بھی دستخط نہ ہوں۔ جسونت نے امیر خاں کے پاؤں پکڑ لیے اور ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ آج اندور کی ریاست محض آپ کی وجہ سے مل رہی ہے، اسے خدارا مجھے لے لینے دیجیے۔ امیر خاں اس عجز سے بہت متاثر ہوا اس نے اپنی مہر اس کے آگے پھینک دی اور کہا "جاؤ جہاں چاہو اسے ثبت کر لو۔" اس طرح امیر خاں اور جسونت راؤ کا انگریزوں کے خلاف ایک محاذ ختم ہو گیا۔

اس صلح کے باوجود امیر خاں نے انگریزوں کی اطاعت قبول نہ کی اور خود راجپوتانے

کی طرف چلا گیا۔ جہاں سے اس نے اپنی زندگی کا نیا دور شروع کیا۔ اس نئے دور میں سید احمد اس کے ہاں پہنچے تھے اور جب اس نے انگریزوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیے اور سید صاحب کا مقصد پورا نہ ہوا تو اس سے الگ ہو گئے۔

سید احمد نے تقریباً ۱۸۱۸ء میں نواب امیر خاں سے قطع تعلق کیا یہ قطع تعلقی سید احمد کی زندگی میں اور اس تحریک کی تاریخ میں جس کی قیادت آگے چل کر خود سید احمد کو کرنا تھی ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ نواب سے تعلقات کا انقطاع ایک آقا سے ملازم یا غلام کا انقطاع نہ تھا۔ یہ ایک ملازمت کا چھوڑ دینا نہ تھا۔ نہ ہی یہ ایک پیشے سے علیحدگی تھی۔ یہ انقطاع یہ علیحدگی دراصل ایک طریقِ کار سے علیحدگی تھی۔ یہ اعلان تھا ایک طریقِ کار اور داؤ پیچ کی ناکامی کا۔ اور تحریک کی کامیابی کے لیے نئے طریق کار اور نئے داؤ پیچ اپنانے کا۔

اس تحریک کے طریقِ کار اور داؤ پیچ کا تعین دراصل شاہ ولی اللہ نے اپنے فکر کے ساتھ ہی کر دیا تھا۔ اور شاہ صاحب سے لے کر نواب امیر خاں انقطاع تک یہی طریق کار اور داؤ پیچ اپنائے جاتے رہے۔ ان ہی حدود میں کام ہوتا رہا۔ یہ طریق کار اور داؤ پیچ کیا تھے؟ ان کا مقصد کیا تھا۔؟ - تاریخ کی ورق گردانی کرنے سے یہی چیز منظر عام پر آتی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے زوال کو روکنے لیے کسی بادشاہ، کسی حکمران، کسی مسلمان نواب یا رئیس کو ابھارا جائے اور اس کی وساطت سے اس منتشر شیرازے کو ایک لڑی میں پرو دیا جائے، انتشار سے بچایا جائے، تنزل کو روکا جائے، اس نواب یا رئیس کو پوری حمایت و امداد دے کر ایک منصفانہ نظام قائم کرایا جائے جو ہندوستان کے بسنے والے مختلف طبقات اور مذاہب کے لیے ساز گار ماحول پیدا کر سکے۔

شاہ ولی اللہ کے سیاسی نوعیت کے تمام مکتوب اسی نوعیت کی نشاندہی کرتے ہیں انھوں نے احمد شاہ ابدالی کو اِسی طریق کار کے تحت ہندوستان پر حملے کے لیے اکسایا تھا۔ کیوں؟

اس لیے کہ ان کا راسخ اعتقاد یہ تھا کہ اٹھارہویں صدی کی افراتفری میں جو طاقتیں

بروئے کار آئی ہیں ان میں کوئی گروہ بھی اس وقت ایک پائیدار، مستحکم اور مضبوط مرکز والی حکومت عطا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ یہ تمام گروہ افراتفری پھیلانے، لوٹ مار کرنے اور قتل و غارت گری میں مصروف تھے۔ عامۃ الناس تو خود ان کے ہاتھوں پریشان تھے۔ اس لیے یہ کیسے ایک پائیدار حکومت مہیا کر سکتے تھے۔ بلکہ شاہ ولی اللہ نے تو احمد شاہ ابدالی کو دعوت دیتے وقت اشارہ ہی اس افراتفری کی طرف کیا تھا۔ اور مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں اور نادر شاہ کے مظالم کا رونا رویا تھا۔ نجیب الدولہ ہو یا آصف الملک، جس کو بھی انھوں نے جدوجہد کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی اس میں بھی یہی جذبہ کارفرما تھا کہ مسلمانوں کی ایک پائیدار حکومت دوبارہ قائم ہو جائے جو پورے ملک کو امن و امان سے ہمکنار کر دے۔

آج بیسویں صدی کے آخری نصف میں جب تاریخ کا تجزیہ کرنے کے لیے کوئی مؤرخ قلم اٹھاتا ہے تو یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس برصغیر میں خالص مسلمانوں کی حکومت کیسے قائم ہو سکتی تھی اور کیا اس کا مطالبہ جائز اور مبنی بر انصاف تھا یا ملک کو آگے لے جانے اور اس کی ترقی میں مدد دینے کا باعث ہو سکتا تھا؟

ولی اللّٰہی طریق کار

شاہ ولی اللہ نے جب یہ مکتوب لکھے تو یہ اٹھارہویں صدی کا وسطی زمانہ تھا اس دور میں بادشاہت ایک مسلمہ اور مروجہ نظام تھی اور ہمارے معاشرے میں اس نظام کو مقبولیت حاصل تھی۔ دوسرے ہندو بھی اس نظام کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو چکے تھے، البتہ جہاں تک بعض سمتوں میں غربت آ گئی تھی، اس کی دوری اور انصاف اور معاشی ناہمواریوں کو ختم کرنے کے لیے شاہ ولی اللہ برابر اصرار کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ نجیب الدولہ کے نام خط میں لکھتے ہیں۔

"ایک بات اور کہنی ہے، وہ یہ کہ جب افواج شاہیہ کا گزر دہلی واقع ہو تو اس وقت اہتمام کلی کرنا چاہیے کہ دہلی سابق کی طرح ظلم سے پامال نہ ہو جائے

دہلی والے کئی مرتبہ اپنے مالوں کی لوٹ اور اپنی توہین اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ اسی لیے کارہائے مطلوبہ میں تاخیر ہو رہی ہے۔ آخر مظلوموں کی آہ بھی تو اثر رکھتی ہے۔ اگر اس بار آپ چاہتے ہیں کہ کار بستہ جاری ہو جائے تو پوری پوری تاکید کرنی چاہیے کہ کوئی فوجی دہلی کے مسلمانوں اور غیر مسلموں سے جو ذمی کی حیثیت رکھتے ہیں ہرگز تعرض نہ کرے۔"

اسی طرح ایک مکتوب وزیر الملک آصف جاہ کے نام لکھا گیا۔ اس میں لکھتے ہیں کہ:

"آپ کے ذریعے رفع مظالم اور ترویج دین حق، اقامتِ امرِ خیر، اشاعت علم نماز روزہ، یہ سب کچھ عمدہ طریق پر ہوگا۔ اس لیے کہ آپ کے اندر ایک عجیب شان اور سعادت محسوس ہوتی ہے اور آپ کا مزاج بھی صلاحیت، ذکاوت اور رغبت امورِ خیر لیے ہوئے تھا۔ شاید مقتضیات زمانہ کی وجہ سے ابھی تک مذکورہ بالا امورِ خیر میں کسی کا ظہور نہیں ہو سکا۔ خدا کرے کہ اس کے بعد تلافی مافات ہو جائے۔ اس قدر البتہ گزارش ہے کہ فی الحال جس قدر طاقت ہو گرانیِ غلہ دور کرنے میں سعئ بلیغ فرمائیں اور اطرافِ عالم میں جو لوٹ مچ رہی ہے اس کو حتی الامکان ختم کرنا بھی ضروری ہے۔"

اس قسم کے مکتوب خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ ان سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ نے یہی طریق کار اختیار کیا تھا کہ جو بھی حکمران طاقت امن و امان قائم کرنے، گرانی دور کرنے اور ظلم و تعدی کو ملیامیٹ کر کے اس افراتفری کو ختم کرنے کی صلاحیت و اہلیت رکھتی ہو، اس کی پوری امداد و حمایت کی جائے۔ اس کے لیے دعا کی جائے اور اس کو مسلسل صحیح ضروریاتِ زمانہ سے آگاہ کیا جائے۔

یہی عمل شاہ عبدالعزیز نے جاری رکھا۔ اس عمل اور اس طریق کار کے تحت سید احمد نے نواب امیر خاں کی نوکری پر پوری توجہ مرکوز کر دی کہ اس کے ذریعے دورِ تنزل کو

روکنے کا کام لیا جائے جس طرح شاہ عبدالعزیز کے والد (یعنی شاہ ولی اللہ) نے نجیب الدولہ، آصف الملک، نواب مجدالدولہ وغیرہ سے کام لینے کی کوشش کی، اسی طرح بیٹے (یعنی خود شاہ عبدالعزیز) نے نواب امیر خاں سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ طریق کار باپ کا تھا۔ اور شخصیت کا انتخاب اس زمانے کے مطابق تھا۔ اس کام کے لیے مکتوب نہیں لکھا گیا۔ بلکہ اپنے مرید خاص سید احمد کو بہ نفسِ نفیس بھیجا گیا۔

متنازعہ مسئلہ

کیا شاہ ولی اللہ کی تحریک ایک باقاعدہ تحریک تھی؟

کیا اس تحریک کو آج کی زبان میں تحریک کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔؟

کیا حصُولِ مقاصد کے لیے کوئی باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی تھی۔؟

کیا کسی منصوبے اور اس کو بروئے کار لانے کے لیے طریق کار اور داؤ پیچ کا تعین ہوا تھا؟

کیا سید احمد شہید کو شاہ عبدالعزیز نے اسی منصوبے کی تکمیل کے لیے جو طریق کار طے کیا تھا اسی کے تحت نواب امیر خاں کے پاس بھیجا تھا۔ اور جب وہاں سے ناکامی ہوئی تو پھر نیا طریق کار شاہ عبدالعزیز اور ان کے رفقاء کار نے باقاعدہ سوچ سمجھ کر طے کیا تھا؟

یہ اہم سوال ہیں اور پچھلے پچیس تیس برس سے ایک نہ ایک ڈھنگ سے اور کسی نہ طریق سے اس برصغیر کے علماء کی توجہ کا مرکز بنے رہے ہیں۔ بہت سے عالم اور تجزیہ نگار شاہ ولی اللہ کے مختلف اقدامات میں ایک ربط دیکھتے ہیں جن کے پیچھے ان کا مخصوص فکر کام کر رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ شاہ صاحب کے بعض اقدامات سے اختلاف کرتے ہیں اور اختلاف تو اب لازمی اور قدرتی ہے، اس لیے کہ زمانے اور وقت دونوں نے ثابت کر دیا ہے کہ بعض طاقتیں جن کے ذریعے شاہ ولی اللہ اپنے مخصوص نظریات اور افکار کو بروئے کار لانا چاہتے تھے وہ طاقتیں خود اتنی فرسودہ ہو چکی تھیں کہ وہ اب کسی بھی نئے فکر کو بروئے کار لانے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھیں لیکن اس اختلاف کے باوجود

یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں شاہ ولی اللہ کے افکار نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ان کے بعد خود شاہ عبدالعزیز اس تحریک کے مظہر بن گئے تھے۔ اور اس فکر کے شارح کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اس شارح اور خانوادے کا رہنما کا شاگرد اور مریدان کے ایما کے بغیر کیسے کوئی راہ اختیار کر سکتا تھا اور یہ راہ بھی وہی تھی جو اس خانوادے کی اپنی متعین کردہ راہ تھی۔ جیسا کہ شاہ ولی اللہ کے مکتوبات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ ان ہی کا طریق کار تھا کہ صاحبِ شمشیر اور صاحبِ فوج مسلمان کو قیام حکومت کے احیاء کے لیے اکسایا جاتے۔ اس لیے سید احمد بھی جب نواب امیر خاں کے ہاں ملازم ہوتے ہوں گے تو وہ اس خانوادے کی مرضی سے ہوتے ہوں گے اور نواب کو دوسری طاقتوں کے خلاف جہاد آزما ہونے کے لیے مائل کرنے کا مشن بھی اپنے استاد کی ہدایت پر ہی کیا ہوگا۔

مختلف آراء

اس مسئلے میں دو مختلف آراء کا اظہار اس تحریک کے دو سب سے بڑے شارحوں اور مورخوں نے کیا ہے۔ ایک طرف مولانا عبیداللہ سندھی ہیں اور دوسری طرف مولانا غلام رسول مہر ہیں۔ مولانا سندھی سید احمد کو الگ سے کوئی حیثیت نہیں دیتے بلکہ وہ ان کے نزدیک شاہ ولی اللہ کی تحریک کا صرف حصہ تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"۱۸۱۱ء میں امام عبدالعزیز نے سید احمد شہید کو فوجی تربیت دینے کے لیے امیر خاں والی ٹونک کے لشکر میں بھیجا۔ موصوف نواب مرحوم کے لشکر میں چھ سال سے زائد رہے۔ ۱۸۱۶ء میں جب نواب امیر خاں نے انگریزوں سے صلح کر لی تو سید احمد واپس امام عبدالعزیز کی خدمت میں پہنچ گئے۔ نواب امیر خاں سے قطع تعلق کرتے وقت سید احمد شہید نے امام عبدالعزیز کو ایک مکتوب لکھا۔ خاکسار قدم بوسی کو حاضر ہوتا ہے۔ یہاں لشکر کا کارخانہ درہم ہو گیا ہے نواب صاحب انگریزوں سے مل گئے ہیں اب یہاں رہنے کی کوئی صورت نہیں۔"

شیخ اکرام لکھتے ہیں :

"اس کے علاوہ امام الہند شاہ ولی اللہ کا فیض جاری تھا۔ انھوں نے مصلح یا مجدد ہونے کا کوئی بلند بانگ دعویٰ نہ کیا تھا۔ لیکن اصلاح و تجدید کا پورا سامان مہیا کر دیا تھا۔ قوم کی رُوحانی قباحتوں کو انھوں نے اپنی تصانیف میں بے نقاب کیا ملک میں تفہیم قرآن اور درسِ حدیث کے چشمے جاری کر دیے جن کی وجہ سے غیر اسلامی عناصر سب کی آنکھوں میں کھٹکنے لگے اس سے بھی بڑھ کر وہ ایک ایسی صالح جماعت کی بنیاد ڈال گئے تھے جو ان کی اخلاقی تجاویز کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتی تھی حضرت امام الہند کے جانشین شاہ عبد العزیز نے جاری رکھا۔ اس تحریک کا سب سے موثر اظہار سید احمد بریلوی کی زیر قیادت ہوا۔"

مولانا محمد میاں دہلوی بھی اپنی کتاب "عُلمائے ہند کا شاندار ماضی" میں اسی موقف کو تسلیم کرتے ہیں انھوں نے اپنی کتاب کے پہلے ایڈیشن کی تیسری جلد میں لکھا ہے :

"بہر حال اسلامی سیاست یا ولی اللّٰہی فلسفے کی روشنی میں ایک اسکیم تیار کی گئی جس کا اہم جزو یہ تھا کہ ہندوستان کے نیم مردہ مسلمانوں میں جہاد اور آزادی کی رُوح پھونکی جائے۔ ایران، افغانستان، چینی ترکستان اور بخارا وغیرہ کی منتشر مسلم حکومتوں کو ملایا جائے اور ہندوستان کو آزاد کرایا جائے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس سکیم کو نافذ کرنے کا بیڑا کون اٹھائے۔ خود سیدنا حضرت عبد العزیز بوڑھے ہو چکے تھے۔ دائم المرض تھے۔ بینائی اور صحت دونوں رخصت ہو چکی تھیں۔ اس سیاسی تدبیر کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ تعلیمی نظام بھی قائم کر دیا جائے تاکہ اگر سیاسی سکیم کامیاب نہ ہو سکے تو مسلمانوں کی مذہبی تعلیم برباد نہ ہو اور اس کفرستان کے بسنے والے اسلام سے نابلد نہ ہو جائیں۔ چنانچہ دو جماعتیں مرتب فرمائی گئیں اور دونوں کے درمیان باہمی امداد و اعانت کا رابطہ قائم کر دیا گیا۔ ایک جماعت کا فرض قرار دیا گیا کہ وہ پاؤں توڑ کر دہلی میں بیٹھ جائے تشنگان علوم کو

سیراب کر کے دریا بہ دامن کرے اور ہندوستان کو گلشن علم بنا دے۔ سیدنا شاہ اسحاق اس جماعت کے سردار بنائے گئے۔ حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب حضرت مولانا مفتی صدرالدین صاحب جیسے اکابر اس جماعت کے ارکان تھے۔ دہلی میں رہ کر تعلیم و تدریس، افتا، اور اشاعتِ علوم ان کا فرض تھا۔ تزکیۂ نفس اور ارشاد و تلقین ان اکابر کی گھٹی میں پڑا تھا۔ دوسرا فرض یہ تھا کہ دوسری جماعت کی حتی الوسع امداد کرتے رہیں۔ دوسری جماعت سید احمد کی زیر قیادت مرتب کی گئی۔ آپ فن سپہ گری کے ماہر تھے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ نواب امیر خاں بانیِ ریاست ٹونک کے ساتھ کتنے ہی معرکے سر کر چکے تھے۔ سالہا سال فوجی خدمات انجام دی تھیں۔ حضرت مولانا اسماعیل شہید کی فطرت ہی فوجی اور سپاہیانہ واقع ہوئی تھی۔ آپ نے جہاد کی اہم ترین اور مشکل ترین خدمات بجالانے کے لیے اپنے آپ کو ابتدا سے ہموار کر رکھا تھا۔ حضرت مولانا عبدالحیؒ کو بھی اس سلسلے میں خاص مناسبت حاصل تھی بہرحال ان حضرات کی ایک جماعت تیار کی گئی۔ جس سے متعلق دو کام تھے:

(۱) "تمام ہندوستان میں گشت کر کے مذہبی تعلیم کا نظام قائم کرنا"

(۲) "جہاد اور سیاسی اسکیم کے لیے ہندوستان اور بیرون ہندوستان جد و جہد کرنا"

یہ آرا ہیں ان لوگوں کی جو سید احمد شہید کی تحریک کو خود مختار اور آزادانہ چلائی ہوئی تحریک تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ شاہ ولی اللہ کے فکر کی بنیاد پر قائم کی گئی جماعت اور تحریک کو ایک حصہ تصور کرتے ہیں۔ جن کو ان بدلے ہوئے حالات میں شاہ عبدالعزیز اور ان کی وفات کے بعد شاہ اسماعیل شہید، مولانا عبدالحئی اور خورشید احمد نے مشترکہ طور پر پروان چڑھانے کے لیے جد و جہد کی۔

ایک دوسرا مکتبِ خیال بھی ہے جو سید احمد شہید کی تحریک کو بالکل خود مختار اور آزاد تحریک تسلیم کرتا ہے۔ اور اس کی فکری اور تنظیمی صلاحیتوں کا سہرا شاہ ولی اللہ کی تحریک یا جماعت کے سر باندھنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

صاحب شمشیر کی تلاش کا خاتمہ

اور

نئی قیادت اور نیا طریق کار

سید احمد سات برس تک نواب امیر خاں پر تکیہ کیے رہے اور اس امید پر اس لشکر میں رہے کہ امیر خاں بالآخر اپنی طاقت اور صلاحیت کو اس انداز سے بروئے کار لائیگا کہ اس افراتفری کے بادل چھٹ جائیں گے اور پائیدار حکومت معرض وجود آجائے گی کیوں کہ اس وقت سے ہی نہیں بلکہ پوری ایک صدی سے اس برصغیر کے بسنے والوں کو سب سے بڑا مسئلہ یہی درپیش تھا کہ یہ افراتفری ختم ہو، لوٹ مار سے جان چھوٹے اور آئے دن کی حکومتوں کے اتھل پتھل کا سلسلہ رکے۔ اسی لیے شاہ ولی اللہ سے لے کر شاہ عبدالعزیز تک جو بھی جد وجہد کا ذکر کرتے ہیں۔ ملتِ اسلامیہ کے تنزل کا رونا روتے ہیں، اور ملت کے احیاء اور مسلم حکومت کے قیام کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا اصرار اسی بات پر ہوتا ہے کہ لوٹ مار سے جان چھڑائی جائے، گرانی سے نجات ملے اور عامۃ الناس کو آسودگی حاصل ہو۔

یہی حال سید احمد کے زمانے میں بھی تھا اور انہی حالات کو بدل ڈالنے کے لیئے سید احمد نے نواب امیر خاں کی طرف رجوع کیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ رجوع خانوادۂ شاہ

ولی اللہ نے سوچی سمجھی اسکیم یا منصوبہ کے تحت کیا تھا؟ یا سید صاحب نے اپنے طور پر اس راہ کو منتخب کیا تھا؟ اس مکتبِ خیال کا ذکر ہو چکا جو اس موقف کا پُرزور حامی ہے کہ شاہ ولی اللہ کے خاندان نے ان کی فکری تحریک اور اس کے متعلق ان کی معین کردہ راہوں اور طریق کار کے مطابق ہی سید احمد کو نواب امیر خاں کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت کی تھی۔ لیکن ایک دوسرا مکتب خیال بھی موجود ہے۔ جو اتنی ہی شدت سے اس موقف کا مخالف ہے۔

دوسرا نقطۂ نظر

راجشاہی یونیورسٹی کے پروفیسر عزیز الرحمان ملک کا موقف یہ ہے کہ سید احمد نے جہاد کی راہ اپنے طور پر منتخب کی تھی اور اس میں شاہ عبدالعزیز کی قیادت یا ہدایت کا تعلق نہیں سمجھنا چاہئے وہ لکھتے ہیں :

”عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ سید احمد نے اپنی مخصوص تعلیمات اور نقطۂ نظر کو، جو بعد میں جہاد پر منتج ہوا، شاہ عبدالعزیز سے حاصل کیا تھا۔ جہاں تک مذہبی تعلیمات کا تعلق ہے، یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ سید احمد نے شاہ عبدالعزیز سے استفادہ کیا ہو، کیونکہ بہرحال ان کے درمیان پیر و مرشد کا رشتہ تھا۔ لیکن جہاں تک جہاد کی راہ اختیار کرنے کا تعلق ہے اس کے متعلق اس قسم کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ یہ راہ بھی انھوں نے شاہ عبدالعزیز کی ہدایت پر اختیار کی ہو۔ اس قسم کا موقف غالباً اس لیے قابل قبول ہو گیا ہے کہ شاہ عبدالعزیز کے دو بہت ہی قریبی عزیز یعنی شاہ اسمٰعیل شہید اور شاہ عبدالحئی سید احمد کے مریدوں کے حلقے میں شامل ہو گئے تھے۔ اس لیے یہ تاثر عام ہو گیا ہے۔“

اسی موقف کی حمایت مولانا غلام رسول مہر نے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

”سید صاحب مختار تھے یا مامور؟ ہمارے زمانے میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے یہ دعویٰ فرمایا ہے کہ شاہ صاحب کو شاہ عبدالعزیز نے خاص پروگرام

دے کر امیر خاں کے لشکر میں بھیجا ہے وہاں پہنچ کر انھوں نے انقلابی کام شروع کیا۔"

جو کچھ اوپر بیان ہوا اس سے صاف آشکارا ہے کہ شاہ صاحب نے بطور خود یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ۔ شاہ صاحب کے امر و حکم کا اس اقدام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ انھیں رائے بریلی میں غیبی اشارہ ہوا تھا کہ نواب کے پاس جاؤ، چنانچہ وہ چل کھڑے ہوئے اور دہلی جاتے ہوئے راجپوتانہ پہنچ گئے۔

وقائع میں ایک خط کا حوالہ ہے جس میں سید صاحب نے قطع علائق کا ذکر کرتے ہوئے شاہ عبدالعزیز کو لکھا تھا۔

"یہ خاکسار سراپا انکسار حضرت کی قدم بوسی کو عنقریب حاضر ہوتا ہے۔ یہاں لشکر کا کارخانہ درہم برہم ہوگیا ہے نواب صاحب فرنگی سے مل گئے، اب یہاں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

اس خط کو کوئی محولہ بالا دعوے کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح اگر سید صاحب شاہ عبدالعزیز کے فرستادہ نہ ہوتے تو ایسا خط کیوں لکھتے؟ کوئی نیک کام شروع کرتے وقت کسی مقدس و تجربہ کار بزرگ سے مشورہ کر لینا یا اس کے ایما و اشارے کے مطابق قدم اٹھانا موجبِ عیب نہیں بلکہ سرچشمہ برکت ہوتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ سید صاحب شاہ صاحب کے فرستادہ نہ تھے اس لیے کہ:

(۱) انھوں نے خود حسبِ اشارۂ غیبی لشکر میں جانے کا فیصلہ کیا۔

(۲) محولہ خط میں سید صاحب نے نواب کے لشکر سے بے تعلقی کی محض اطلاع دی ہے۔ اگر وہ شاہ صاحب کے فرستادہ ہوتے تو بطور خود لشکر میں رہنے یا نہ رہنے کا فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ بلکہ شاہ صاحب کو سارے حالات کی اطلاع دے کر اجازت منگاتے۔

(۳) اگر شاہ صاحب نے سید صاحب کو بھیجا تھا تو کیا وجہ ہے کہ سات برس تک ایک مرتبہ بھی اپنے پاس بلا کر ممکنات عمل کی کیفیت نہ پوچھی؟ یا جو کام

سید صاحب کر چکے تھے اس کی تفصیل نہ سنی ؟ اگر نواب انگریزوں سے صلح نہ کرتا تو سید صاحب بدستور وہیں رہتے ؟ کیا آمرا اپنے مامورین سے اس طرح کام لیتے ہیں ؟ جس حد تک میں تصدیق کر سکا ہوں ، مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے اس دعوے کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں اور مستند روایات اس دعوے کی تردید کر رہی ہیں۔"

اصل مسئلہ

یہاں میں اس امر کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ اس بحث اور دو مکاتبِ خیال کی مختلف آرا، کا موازنہ کیوں ضروری ہے ! اگر یہ جزئیات کی بحث ہوتی تو یہ میرے موضوع سے باہر ہوتی لیکن یہ جزئیات کی بحث بلکہ بنیادی مسئلہ ہے اسی لیے میں نے ان مختلف آرا، کا اظہار اسی وضاحت سے کیا ہے۔

بنیادی مسئلہ یہ نہیں ہے کہ سید احمد کو شاہ عبد العزیز نے ایک بے جان ، بے شعور کارندے کی حیثیت سے نواب امیر خاں کے لشکر میں ایک مقصد کے لیے بھیجا تھا۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ :

۱ - شاہ ولی اللہ نے اس وقت کے بنیادی مسائل کے متعلق کوئی فکر فراہم کیا تھا ؟

۲ - اس فکر کو بروئے کار لانے کے لیے انھوں نے کوئی تحریک منظم کی تھی اور اس تحریک کے داؤ پیچ اور طریقِ کار کو متعین کیا تھا ؟

۳ - شاہ عبد العزیز اسی فکر کو تسلیم کرتے تھے اور اسی طریقِ کار کو درست سمجھ کر اپنا رہے تھے۔

۴ - سید احمد نے جب خانوادۂ ولی اللہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، شاہ عبد العزیز کے ہاتھ پر بیعت کی تو انھوں نے اس خانوادے کے فکر، اس تحریک اور اس کے داؤ پیچ کو درست تسلیم کیا یا نہیں ؟

ان چاروں سوالوں کا جواب اگر اثبات میں ہے تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سید احمد کی تحریک ، شاہ ولی اللہ کی تحریک ہی کا ایک حصہ تھی ، اسی تحریک کے داؤ پیچ کو تسلیم کرتی تھی

اور امیر محمد خاں کے لشکر میں سید احمد کا جانا اور اس کو فرنگی کے خلاف لڑنے پر آمادہ کرنا، فوجوں میں تبلیغ کرنا، یہ تمام کے تمام داؤ پیچ ولی اللٰہی تحریک کے آزمودہ اور مرغوب داؤ پیچ تھے۔ اس کے متعلق بڑی وضاحت سے لکھا جا چکا ہے۔ اس لیے یہ بات یقینی ہے کہ سید احمد اس تحریک کے قائدین کے، جن میں ان کا اپنا بھی شمار ہوتا تھا، باہمی مشورے سے ہی لشکر میں گئے ہوں گے کیونکہ اس وقت تک اس تحریک نے یہی طریق کار اپنایا تھا کہ کسی نہ کسی نواب یا رئیس کو آگے بڑھایا جائے اس کو نیک مقصد کے لیے لڑوا دیا جائے اور یہ جو سید صاحب کا امیر خاں کے فرنگی سے مل جانے سے متعلق شاہ عبدالعزیز کے نام مکتوب ہے اس کا مطلب واضح ہے کہ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ طریق کار اب کامیابی کا ضامن نہیں، بلکہ یہ دعوت ہے نئے طریق کار کے اپنانے کی اور اس پر بحث کے لیے وہ دہلی میں اپنے استاد کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہونے کے متعلق لکھتے ہیں اس لیے سید احمد کی اس تحریک کا ذکر شاہ ولی اللہ کی تحریک سے الگ ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی کامیابی شاہ ولی اللہ کے فکر کی کامیابی ہے، اور اس کی ناکامی بھی کسی حد تک اسی تحریک کے طریق کار اور داؤ پیچ کی ناکامی کہلائے گی۔

ولی اللٰہی تحریک کا جزو لاینفک

سید احمد کی تحریک کی حقیقتاً کوئی الگ بنیادی حیثیت نہیں ہے بلکہ ایک صدی پہلے شروع ہونے والے دورِ تنزل کو روکنے کے لیے جو تحریک اٹھی تھی۔ اس تحریک کا ایک دور سید احمد کے سامنے ختم ہوا، اور دوسرا دور شروع ہوا، دوسرے دور کی قیادت و امامت اور اس کے آغاز کا سہرا سید احمد کے سر بندھا ہے لیکن حقیقتاً وہ اس تحریک ہی کا حصہ تھا، قیادت اب بھی اسی فکر کے شارحین کے پاس تھی، سید احمد اس کے مظہر تھے، یہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، جہاں تک اس بحث میں خوابوں اور غیبی اشاروں کا تعلق ہے تو بحث کے دونوں طرف اس کا استعمال ہوتا ہے اور دونوں مکاتبِ خیال ان کو اپنی حمایت میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مولانا غلام رسول مہر نے سید احمد کی تحریک کو ایک آزاد حیثیت دینے اور اس

کے تمام داؤ پیچ کا خالق سید احمد کو ثابت کرنے کے لیے غیبی اشارات کا ذکر کیا ہے اور اس کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ سید احمد از خود یہ غیبی اشارہ پاکر امیر خاں کے لشکر میں گئے تھے۔ لیکن خود مہر صاحب نے اپنی کتاب میں شاہ عبدالعزیز کے ایک بہت ہی اہم خواب کا ذکر کیا ہے چنانچہ اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"ایک روایت ہے کہ سید صاحب کے پہنچنے سے ایک ہفتہ پہلے شاہ عبدالعزیز نے ایک خواب دیکھا جس کا مدعا یہ تھا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم جامع مسجد دہلی میں تشریف فرما ہیں۔ بے شمار خلقت ہر گوشے سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار فرحت آثار کے لیے دوڑی چلی آرہی ہے۔ حضور نے سب سے پہلے شاہ صاحب کو دست بوسی کی سعادت سے شرف بخشا۔ پھر ایک عصا مرحمت فرمایا اور ارشاد فرمایا: تو مسجد کے دروازے پر بیٹھ جا۔ ہر کسی کا حال ہمیں سنا، جس کے لیے ہمارے ہاں سے حاضری کی اجازت ملے، اسے اندر آنے دے۔ شاہ عبدالعزیز بیدار ہوئے تو اس خواب کی تعبیر پوچھنے کے لیے شاہ غلام علی کے پاس خانقاہ میں پہنچے۔ انھوں نے کہا سبحان اللہ! یوسفِ وقت مجھ سے تعبیر پوچھتا ہے۔ شاہ صاحب بولے: میں اس خواب کی تعبیر آپ ہی کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ شاہ صاحب کے سخت اصرار پر شاہ غلام علی نے کہا: معلوم ہوتا ہے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض ہدایات کا خاص سلسلہ آپ یا آپ کے کسی مُرید سے جاری ہوگا۔ شاہ صاحب بولے: میرے خیال میں بھی یہی تعبیر تھی۔ جب سید صاحب دہلی پہنچے تو شاہ صاحب کو یقین ہوگیا کہ جس سلسلۂ ہدایت کے اجراء کی بشارت خواب میں دی گئی تھی وہ خدا چاہے تو سید صاحب کے ذریعے سے جاری ہوگا۔"

خواب کی تعبیر

جس شاگرد کی صلاحیت اور اہلیت کا اشارہ خواب میں دیا گیا ہو اور اس کو عصا کے طور پر پیش کیا گیا ہو تو اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خانوادۂ ولی اللہی کے حکم کو بروئے کار لانے کے لیے سید احمد ایک ہتھیار اور ایک عصا تھے اور یہ بات آگے چل کر درست ثابت ہوئی اس لیے کہ خانوادۂ ولی اللہی نے سید صاحب کو صرف تعلیم ہی نہیں دی، فکر بھی دیا، ایک تحریک سے روشناس بھی کرایا اور پھر اس تحریک کی قیادت بھی بخشی۔ اور معاملہ یہاں تک ہی نہیں رہا بلکہ اس قیادت اور امامت کو کامیاب بنانے کے لیے اپنے خاندان کے بہترین افراد بھی مہیا کیے، ایسے افراد جو علم میں بھی یکتا تھے، زُہد میں بھی بے مثل تھے اور تقوے میں بھی مسلمہ تھے۔ جب میدان جنگ میں شجاعت اور بہادری دکھانے کا وقت آیا تو اس وقت بھی اسی شاہ ولی اللہ کے خاندان کے افراد تھے جنھوں نے اس میدان میں بھی اپنی عظمت کے جھنڈے گاڑ دیے۔

ان تمام توضیحات سے یہ قطعاً مراد نہیں اور نہ یہ مقصد ہے کہ سید احمد کے کارناموں کی اہمیت کو گھٹا کر بیان کیا جائے بلکہ قرائن یہ کہتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ نے جس تحریک کی داغ بیل ڈالی تھی، سید احمد اس تحریک کے سپہ سالار بنے۔ اسی تحریک کے نئے دور اور نئے طریق کار اور داؤ پیچ کا سہرا ان ہی کے سر بندھا۔

امیر محمد خاں کی ناکامی

امیر محمد خاں کی اہمیت دراصل تاریخ میں اس لیے بھی ہوگئی ہے کہ سید احمد ان کے لشکر میں سات برس رہے اور ان پر یہ تکیہ کیا جاتا رہا کہ وہ شاید اس تنزل کے سلسلے کو روک نے میں کوئی کارنامہ انجام دے سکیں گے۔ وہ شاید چاروں طرف پھیلی ہوئی اس تاریکی اور گھپ اندھیرے میں شمعِ ظلمت بن کر چمکیں گے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی امید بر نہ آئی۔ اوّل تو

امیر خاں سے اس قسم کی توقع کا تاریخی اور سماجی محرکات کی بنیادوں پر کوئی جواز بن نہیں آتا کیونکہ وسط ہند میں جن مختلف طاقتوں نے خراج اور لوٹ مار کی کیفیت پیدا کی ہوئی تھی، ان میں خود امیر خاں بھی ایک طاقت تھے۔ ورنہ جہاں تک عام آبادی کا تعلق ہے، وہ کسی ایک سے بھی مطمئن اور مسرور نہ تھی اس لیے کہ آئے دن کی لڑائیوں نے بے چارے عوام کا امن و سکون لوٹ لیا تھا۔

مرہٹوں کی یہ حالت تھی کہ جس گاؤں سے ان کا گزر ہوتا، ویران ہو جاتا۔ ایک وقت تو یہ حالت بھی دیکھنے میں آئی کہ جہاں تک ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز جاتی اتنی دور تک آبادیاں ویرانوں میں بدل جاتیں۔ راجپوتانے کے راجہ بھی دست و گریباں رہتے اور اس افراتفری میں پنڈاروں نے بھی لوٹ اور قتل و غارت گری سے خوب ہاتھ رنگے۔ یہ حالات تھے جب انگریزوں نے اپنی توسیعِ مملکت کی مہم شروع کی۔ انھوں نے پنڈاروں کی دہشت اور لوٹ مار کا بہانہ کر کے وسط ہند کی مختلف ریاستوں سے گفت و شنید کی۔ اور آہستہ آہستہ تمام ریاستیں انگریز کے معاہدوں کی کڑی زنجیروں میں جکڑی گئیں۔ چنانچہ جب یہ سلسلہ شروع ہوا، اور جیسے جیسے ریاستوں کے ساتھ معاملہ طے ہوتا گیا۔ انگریزوں کی مشکلات میں کمی ہوتی گئی۔ جودھ پور، کوٹہ، بوندی وغیرہ بھی اس زنجیر میں جکڑے گئے اور مرہٹوں کا سندھیا بھی اس حلقے سے باہر نہ رہ سکا۔

یہ تھے وہ حالات جو امیر خاں کے گرد و پیش رونما ہو رہے تھے۔ لیکن نواب امیر خاں ان حالات سے بے خبر اور بے نیاز بیٹھے تھے۔ چنانچہ اس آخری دور کے متعلق مولانا مہر لکھتے ہیں:

"نواب امیر خاں کو انگریزی تدبیروں کا علم نہ ہو سکا، یا سمجھ لیجیے کہ وہ بہادری اور جواں مردی کے زعم میں ان کے نتائج کا اندازہ نہ کر سکے، پوری بے پروائی سے اپنے اوصاف و اطوار پر قائم رہے۔ یہاں تک کہ ۱۸۱۷ء کے اواخر میں بالکل اکیلے رہ گئے۔ اس اثناء میں انگریزی فوج کی تین شاخوں

نے مختلف تین راستوں سے وسطِ ہند میں پیش قدمی شروع کر دی۔ پیش قدمی کی سکیم عجیب بنائی گئی تھی۔ ایک طرف پنڈاروں، امیر خاں اور سندھیا کے درمیان انگریزی فوج اس طرح بیٹھ گئی کہ تینوں میں باہم گفت و شنید یا میل جول کا کوئی موقع نہ رہا۔ دوسری طرف ایک انگریزی جیش خود امیر خاں کی فوج کے دو حصوں کے درمیان حائل ہو گیا اور ان کے درمیان ہر رشتہ ٹوٹ گیا۔ ساتھ ساتھ امیر خاں کے سرداروں کو انگریزوں نے لالچ دے کر توڑ لیا۔ چنانچہ انگریز فوج کی پیش قدمی کے ساتھ ہی فیض اللہ بنگش اپنا رسالہ لے کر انگریزوں سے مل گیا۔ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ دوسرے سردار امیر خاں کو اچانک گرفتار کر کے انعام کی حرص میں انگریزوں کے حوالے نہ کر دیں۔ یہ حالات بروئے کار آچکے تو انگریزوں نے امیر خاں سے مصالحت کی بات چیت شروع کی۔ دہلی سے مٹکاف صاحب نے منشی نرنجن لال کو عہدنامے کا مسودہ دے کر نواب کے پاس بھیجا۔"

صلح کی شرائط یا شکست

نواب امیر خاں نے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیے اور اپنے معتمد علیہ دانا رام کو جو جے پور میں تھا لکھا کہ انگریزوں سے گفت و شنید کر کے صلحنامہ مرتب کرے۔ چنانچہ ذیل کی شرطوں پر مشتمل صلحنامے پر دستخط ہو گئے۔

۱۔ ہلکو نے جو علاقے نواب کو دیے تھے، وہ سب اس کے قبضے میں رہیں گے ان ہی علاقوں کو ملا کر ریاست ٹونک کی تخلیق ہوئی۔

۲۔ امیر خاں کی تمام فوج منتشر کر دی جائے گی۔ صرف اتنی نفری باقی رکھی جائیگی جو ان علاقوں کے انتظامات کے ضروری ہوگی۔

۳۔ توپ خانہ اور ساز و سامانِ جنگ انگریز معقول معاوضے پر خرید لیں گے۔

۴۔ نواب اس معاوضے سے منتشر ہونے والی فوج کے بقایاجات ادا کرے گا

۵۔ نواب کسی علاقے پر حملہ نہیں کرے گا۔ بلکہ انگریزوں سے مل کر پنڈاروں کو ختم کرے گا۔

جنگی سامان کی خریداری کے سلسلے میں انگریزوں نے پانچ لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا اور ایک لاکھ فوری طور پر ادا کر دیا گیا۔ لیکن بقایا رقم کی ادائیگی کے لیے انگریزوں نے نواب سے ضمانت طلب کی کہ وہ اس امر کی ضمانت دے کہ وہ اس معاہدے پر کاربند رہے گا۔ چنانچہ نواب سے کہا گیا کہ وہ اپنے فرزندِ اکبر وزیر محمد خاں کو انگریزوں کی تحویل میں دیدیں اور جب انگریزوں کو اطمینان ہو جائے گا تو وہ بقایا چار لاکھ ادا کر دیں گے بالآخر نومبر ۱۸۱۷ء کو نواب کے وکیل نے اصل معاہدے پر دستخط کر دیے۔ ۱۶ر نومبر گورنر جنرل نے اس معاہدے کی توثیق کر دی اور ۹ر دسمبر ۱۸۱۷ء کو نواب نے اس معاہدے کی توثیق کر کے اسے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

یہ تھی روئیداد اس نواب کی جس پر خانوادۂ ولی اللہی اور سید احمد نے اپنی تحریک کے سلسلے میں تکیہ کیا تھا اور امید باندھی تھی کہ اس دورِ ابتلا میں اس کی شمشیرِ بے نیام دست گیری اور راہ نمائی کرے گی۔

یہ تحریک جو شاہ ولی اللہ کی تحریک کے نام سے منسوب رہی ہے تقریباً پون صدی تک اس کا طریق کار یہی رہا ہے کہ فکر شاہ صاحب کا ہو مگر اس کو بروئے کار لانے کے لیے کوئی صاحب شمشیر ڈھونڈا جائے۔ چنانچہ پون صدی اسی طریق کار کو اپنایا جاتا رہا اور خود سید احمد نے بھی شروع میں اسی طریق کار کو اپنایا اور امیر خاں کے ذریعے اس فکر کو بروئے کار لانے کی کوشش کی۔ لیکن یہ طریق کار بالآخر ناکام ہوا۔ اور شاہ عبدالعزیز کو اپنی زندگی کے آخری سالوں میں اس تحریک کار کو خود اپنی آنکھوں سے ناکام ہوتے دیکھنا پڑا۔ لیکن اس خاندان کی عظمت اس میں ہے کہ اس نے اس ناکامی سے کسی کو مایوس نہ ہونے دیا اور نہ خود ہی ناامید ہوئے بلکہ فوری طور پر نئے طریق کا اعلان کر دیا۔ یہ طریق کار عوام کو منظم کرنا تھا انھوں

نے اس عوامی تنظیم کے بل پر جہاد کرنے کی ٹھانی تاکہ دشمنوں کو شکست دی جا سکے لیکن بیشتر اس کے اس نئے طریق کار اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی جائے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر اس طریق کار کی ناکامی پر گفتگو کر لی جائے۔

یہ درست ہے کہ اس وقت محدود ذرائع کے مطابق شاہ ولی اللہ نے جو طریق کار اپنایا تھا، وہی ممکن راہ عمل دکھائی دیتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو فکر شاہ ولی اللہ نے دیا اس کو بروئے کار لانے والی طاقتوں کے انتخاب پر ایک بہت بڑا تضاد تھا ایک طرف شاہ صاحب اس زمانے کی خرابیوں، اضطراب اور پریشانیوں کی تفصیلی طور پر نشاندہی کرتے ہیں اور جن طبقوں کو وہ ان کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اسی طبقے سے پھر یہ امید کرتے ہیں کہ اس کے کچھ افراد اپنے اندر اتنی اصلاح کریں گے کہ وہ ایک منصفانہ نظام قائم کرنے کا موجب بنیں گے۔ چنانچہ ڈاکٹر تارا چند، شاہ ولی اللہ کی تحریک کے متعلق لکھتا ہے:

"شاہ ولی اللہ کے فلسفے میں بلا شک، افکار کے ایسے قیمتی عناصر موجود تھے کہ اگر انھیں ٹھیک سے آگے بڑھایا جاتا اور ترقی دی جاتی تو ہندوستانی زندگی کے گنجلک مسائل کو حل کرنے اور ان گتھیوں کو سلجھانے کی اہلیت رکھتے تھے لیکن بد قسمتی سے حالات شدید طور پر ناسازگار تھے اور فلسفی کے ذرائع اور وسائل بھی بہت حد تک محدود تھے۔ شاہ ولی اللہ معاشرے میں اصلاحات کے لیے جن ذرائع پر انحصار کر رہے تھے وہ ذرائع یا تو نااہل تھے یا پھر اتنے عظیم کارنامے کو سرانجام دینے کی صلاحیت ہی سے بہرہ ور نہ ہوئے تھے۔ انھوں نے نجیب الدولہ، نظام الملک اور احمد شاہ ابدالی سے اپیل کی کہ آگے بڑھیں اور اسلام کی رو بہ تنزل عظمت کو سہارا دیں۔ لیکن شاہ ولی اللہ بھول گئے کہ یہ تینوں افراد خود اسی رُو بہ تنزل نظام کے ستون اور محافظ تھے۔ شاہ صاحب یہ محسوس نہ کر پائے کہ یہ تینوں افراد اپنی اہمیت کے باوجود اس عظیم کام کے لیے ناموزوں

ہیں۔ یہ واقعی حیران کن ہے کہ شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی پر بھروسہ کیا جس نے مغل سلطنت کے بہترین اور خوب صورت ترین علاقوں کو تباہ و برباد کر دیا جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو بغیر کسی تمیز کے لوٹا اور برباد کیا۔ اور جو ایک ایسا نوجوان تھا جس کی جڑیں اپنے عوام میں بھی نہ تھیں اور یہ بھی تعجب ہی کی بات ہے کہ انھوں نے یہ خیال کیا کہ جس قسم کے مثالی معاشرے کے وہ خواب دیکھ رہے تھے اس کو وجود میں لانے کے لیے صرف اس قسم کا انصاف ضروری ہے جو مختلف مذاہب اور قوموں سے بالاتر ہو اور ہندوستان کے مختلف عناصر کو احسن طریق سے یک جا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، عام ہندوستانیوں کو برابر سمجھے شاہ ولی اللہ نے بنگال میں رونما ہونے والے واقعات کی اہمیت کو نہیں سمجھا اور وہ یہ معلوم نہ کر سکے کہ بنگال میں رُونما ہونے والے واقعات نے پوری ہندوستانی سیاست کی بنیادیں ہلا ڈالی ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز نے جنھوں نے ۱۸۰۳ء میں دہلی پر انگریزی قبضے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یقینی طور پر محسوس کیا کہ ہندوستان میں اسلام کی بنیادیں تباہ کر دی گئی ہیں کیونکہ آزادیٔ اظہار اور ضمیر کی عظمت ختم ہو گئی ہے شہری آزادیاں مفقود ہیں، یہ ملک دارالحرب میں تبدیل ہو گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود نہ باپ اور نہ بیٹا ان تبدیلیوں کا صحیح اندازہ لگا سکا۔ وہ یہ سمجھ نہ سکے کہ ان نئے خطرات کا مقابلہ پرانے اور فرسودہ ہتھیاروں سے نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی ایک ملت یا قوم تن تنہا ان خطرات سے نبرد آزما ہو سکتی ہے اور دوسروں کو غلام اور بے اطمینان رکھ سکتی ہے۔"

یہ تجزیہ بہت حد تک درست ہے جہاں تک شاہ ولی اللہ کے فکر کا تعلق ہے اور اس دور کی معاشرتی خرابیوں کی وجوہ اور ان کے تجزیے کا بیان ہے اس میں بے پناہ صداقت پوشیدہ ہے۔ شاہ صاحب کو ایک سماجی مفکر کی حیثیت سے جو عظمت حاصل

ہے، اس کی بنیادی وجہ بھی یہی ہے لیکن اس صداقت اور تجزیے کی سچائی کے باوجود اس رو بہ تنزل نظام کو مٹانے اور نیا نظام رائج کرنے کے لیے جہاں ایک طرف صالح فکر کی ضرورت تھی وہاں دوسری طرف اس فکر کو بروئے کار لانے اور اس دنیا نئے رنگ بو میں ٹھوس شکل میں جنم دینے کے لیے ایسے ہتھیاروں کی بھی ضرورت تھی جو اس فکر کی طرح صالح اور نئے ہوں۔ تاریخ میں ایسے مواقع پر جو ناکامیاں ہوئی ہیں ان ہی سے یہ بحث شروع ہوا کرتی ہے کہ فکر و عمل میں کتنا بعد ہوتا ہے اور کتنی یکسانیت۔ اور فکر پہلے وجود میں آتا ہے یا عمل پہلے زمین ہموار کرتا ہے۔ بہرحال شاہ ولی اللہ نے اپنے فکر کو بروئے کار لانے کے لیے نئے ہتھیار، نئے طبقے اور نئے عناصر تلاش نہیں کیے اور یہی ان کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ تھی اور اس ناکامی کا اظہار ان کے لخت جگر اور ان کی امامت کے مسند نشین شاہ عبدالعزیز کی زندگی کے آخر میں ہوا۔ اور جس ناکامی کی ابتدا احمد شاہ ابدالی سے شروع ہوئی تھی، یہ سلسلہ امیر محمد خاں پر جا کر ختم ہوا۔

نیا طریق کار

تحریکوں میں فکر اور اس کی بنیاد پر اقتدار حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اور داؤ پیچ اختیار کیے جاتے ہیں وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر اہم ہوتے ہیں اور کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں دی جا سکتی لیکن جب طریق کار ناکام ہو جائے تو یہ بنیادی حد تک فکر ہی کی ناکامی تصور ہوتی ہے۔ کیونکہ اصولی طور پر تو فکر کو خود ہی ان طبقوں اور گروہوں کی نشان دہی کرنا ہوتی ہے جو اس فکر کو بروئے کار لا سکتے ہیں۔ مگر شاہ ولی اللہ کے فلسفے کی تمام عظمت کے باوجود اس میں اس سمت کوئی اشارہ نہیں کیا گیا۔ چنانچہ پون صدی کے بعد جب ایک مخصوص طریق کار میں ناکامی ہوئی تو فوری طور پر ایک نیا طریق کار سوچا گیا اور یہی وہ طریق کار تھا جو پھر پون صدی تک اس برصغیر میں مسلمانوں کے ایک بہت بڑے گروہ کو متاثر اور متحرک کرتا رہا۔

یہ طریق کار تھا ؟ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟ اس نئے طریق کار کی تفصیلات طے ہوئی تھیں یا نہیں ؟ اگر ہوئی تھیں تو عملی صورت میں یہ تفصیلات کیسے بروئے کار لائی گئیں ؟ اس قسم کے سوالات ہیں جن کا جواب دیے بغیر اس طریق کار کے متعلق بات مکمل نہیں ہو سکتی۔

طریق کار کی ضرورت کا جہاں تک تعلق ہے وہ تو امیر محمد خاں کی شکست اور انگریزوں سے دوستی نے پیدا کر دی۔ سوال یہ تھا کہ اب کس ذریعے سے مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں بحال کی جائے ؟ مسلمان نواب، رجواڑے اور رئیس تو ایک ایک کر کے ختم ہو چکے۔ ان کے جھنڈے تلے جمع ہو کر دشمن پر ہلہ بول دینے کا طریق شکست کھا چکا تھا۔ اب ضروری تھا کہ نئے طریق اپنا لیے جائیں۔ چنانچہ اس ضرورت نے اکبرآبادی مسجد کے مکینوں، وعظ و نصیحت کے شیدائیوں اور منبر پر بیٹھ کر رشد و ہدایت کی راہ دکھانے والوں کو خود ہی شمشیر بکف میدان میں نکلنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ اب یہ طریق کار مروج ہوا کہ عوام کو متحرک کیا جائے اور ان کو شمشیر بدست مسلمانوں سے لڑایا جائے۔

تحریک کا عوامی پہلو

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے عوامی تحریک انیسویں صدی کے پہلے وسط میں ابھری اور پہلی دفعہ عوام اس ملک کی سیاست میں دخیل ہوئے، یہ تحریک سید احمد کی ہی تحریک تھی، یہی وہ تحریک تھی جو شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے فکری پرچم تلے منظم ہوئی۔ جب سید احمد امیر محمد خاں سے قطع تعلق کر کے دہلی آئے تو اسی زمانے میں شاہ عبدالعزیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں نظر آتے ہیں اور ان کو عصا ہاتھ میں تھما دیتے ہیں۔ یہ دراصل تحریک کے نئے طریق کار کا اعلان، یہ اعلان تھا کہ اب عوام کو منظم کیا جائے، ان کی تنظیم کے بل بوتے پر ایک فوج منظم کی جائے، اور وہ فوج وہی کام کرے جس کی توقع احمد شاہ ابدالی سے لے کر امیر محمد خاں کی فوجوں سے کی جاتی رہی ہے، چنانچہ ہندوستان

میں ۱۸۱۸ء کے بعد سے ایک زبردست عوامی تحریک نے جنم لیا۔ یہ ایسی تحریک تھی جس نے پورے ہندوستان کے مسلمانوں کو متاثر اور متحرک کیا۔ اس تحریک کے ابتدائی خدوخال، عقائد کی درستی، رسوم کی اصلاح اور پوری زندگی کو خدا اور رسول کے بتائے ہوتے احکام کا پابند کرنا ہے۔ لیکن جب خدا اور رسول کے احکام پر عمل کرنے کی راہوں میں رکاوٹوں کے پہاڑ کھڑے ہوں تو سب سے پہلے ان رکاوٹوں کو دور کرنا فرض ہو جاتا ہے اور یہی رکاوٹیں تھیں جنہوں نے اس ملک کو دارالحرب بنا دیا تھا اور شاہ عبدالعزیز اس امر کا اعلان کر چکے تھے۔

عوامی تحریک کی تنظیم

سید احمد نواب امیر خاں کے لشکر سے الگ ہو کر سیدھے دہلی پہنچے اور یہاں اجمیری دروازے کے باہر ایک سرائے میں مقیم ہوتے، دوسرے اپنے مُرشد شاہ عبدالعزیز سے ملنے کے لیے گئے۔ ان کی خدمت میں ایک مرید کی حیثیت سے ۲۶ روپے نذرانہ بھی پیش کیے۔ اس موقع پر شاہ صاحب نے اپنے مرید کو حکم دیا کہ وہ سرائے کی سکونت ترک کر کے مسجد اکبر آبادی میں قیام کریں۔ چنانچہ شاہ اسمٰعیل، مولانا عبدالحیؒ، حافظ قطب الدین، شاہ محمد یعقوب، مولوی محمد یوسف پھلتی اور کئی حضرات سید احمد اور ان کے ساتھیوں کا سامان لینے سرائے گئے۔ سید احمد نے جب اکبر آبادی مسجد میں قیام کا قصد کیا تو ان کے لیے اور ان کے ساتھیوں کے لیے پانچ حجرے خالی کرائے گئے۔ سید احمد کے اسی قیامِ مسجد اکبر آبادی کے دوران بیعت و طریقت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اب یہ بات قرائن سے واضح ہے کہ اسی دوران میں شاہ عبدالعزیز اور ان کے رفقا نے اپنی تحریک کے لیے نئے طریقِ کار کا تعین کیا ہوگا۔ اور یہ بیعت و طریقت کا سلسلہ اسی نئے طریق کار ہی کا ایک حصہ ہے چنانچہ مولنا عبیداللہ سندھی تو اس سلسلے کو باقاعدہ ایک تحریک کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"دراصل بات یہ تھی کہ امام عبدالعزیز کے آخری عہد میں ہندوستان کی اسلامی سیاست میں سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنے بعد کام کرنے

کے لیے اپنے لوگوں میں سے کسی میں امامت کی صلاحیت نہ دیکھی کہ اس کو آمر بنایا جائے اس لیے دو بورڈ بنائے گئے عسکری امور کے لیے سید احمد شہید کو امیر اور مولانا عبدالحیٔ اور مولانا اسماعیل شہید کو مشیر مقرر کیا گیا۔ چنانچہ امام عبدالعزیز نے اپنی تمام جماعت کو حکم دیا کہ جس معاملے میں سید احمد شہید مولانا عبدالحیٔ اور شاہ اسماعیل تینوں جمع ہو جائیں اس کو امام عبدالعزیز کا حکم سمجھنا چاہیے۔ تنظیمی امور کے لیے آپ نے مولانا محمد اسحاق کو امیر اور ان ہی کے بھائی مولانا محمد یعقوب کو ان کا مشیر مقرر کیا۔ شاہ عبدالعزیز نے ہر معاملے میں مولانا محمد اسحاق کو اپنے ساتھ رکھ کر لوگوں کو سمجھا دیا کہ ان کا حکم میرا حکم ہے، امام عبدالعزیز کا یہ نکتہ امام ولی اللہ کے اصول پر ٹھیک اترتا ہے۔ یہ طریق کار جس پر چل کر امام عبدالعزیز نے اس طویل عرصے میں بتدریج حزب ولی اللہی کی تنظیم کی چنانچہ جب یہ تمہیدی مراحل طے ہو گئے، ۱۲۳۱ھ میں پہلی مرتبہ سید احمد اور ان کے بورڈ کے ارکان مولانا عبدالحیٔ اور مولانا محمد اسماعیل کو ملک میں بیعت لینے کی غرض سے بھیجا، ۱۲۳۶ھ میں یہ بورڈ دوسری دفعہ جہاد کی بیعت لینے کے لیے نکلا۔ اس کے بعد ان کو سارے قافلے سمیت حج پر جانے کا حکم ملا تاکہ انھیں اپنی قوت کی مزید تنظیم کا تجربہ حاصل ہو سکے۔

دوروں کی اہمیت

سید احمد شہید اور ان کے رفقائے کار کے ان دوروں کی اہمیت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ولی اللہی تحریک کے ایک اصول کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے امام ولی اللہ کے نزدیک جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ اسلام کی مستقل حکومت کا آغاز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی سے شروع ہو چکا ہے

اور آپ کے دعاۃ یعنی دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والے اس مستقل حکومت کے امیر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوہ حسنہ پر حزب ولی اللہؒ کی تنظیم میں بھی اس دعوت و تبلیغ کے سلسلے کو بھی خاص اہمیت حاصل تھی امام عبدالعزیزؒ نے سید احمد، مولانا عبدالحیؒ اور مولانا اسمٰعیل کو دراصل اسی مسئلہ دعوت و تبلیغ کا نظام قائم کرنے کے لیے اطرافِ ملک بھیجا تھا۔ دوسرے لفظوں میں گویا یہ ابتداء تھی اس امر کی کہ حزب ولی اللہ اپنی سیاسی پارٹی کی تشکیل و تنظیم کر کے امامت اور حکومت کی بنیاد رکھنا چاہتی ہے، یعنی یہ لوگ اپنی حکومت بنا لیں گے۔"

بہرحال مولانا عبیداللہ سندھی نے اپنے انداز میں جو توجیہہ کی ہے وہ بہت حد تک درست ہے۔ اس لیے ان کے رفقاء نے ملک کے اندر مسلمانوں میں ایک عوامی تنظیم وجود میں لانے کی ان تھک کوشش کی اور بالکل اسی انداز میں قریہ قریہ اور شہر شہر گھومے جیسے سیاسی جماعتوں کے کارکن اور زعماء گھومتے ہیں۔ ہر مسجد میں اور ہر چوک میں جلسہ کرتے ہیں۔

اس طرح ڈیڑھ صدی قبل ان علماء نے مسلمانوں کو متحرک کیا اور ان کے اضطراب اور بے چینی کو جہاد کی صورت میں بدلنے کی کوشش کی۔

تحریکوں کے محرکات

عوامی تحریک کی تنظیم جان جوکھوں کا کام ہوتی ہے۔ اس کے لیے پتہ پانی کرنا پڑتا ہے۔ لیکن صرف محنت اور جانفشانی ہی تحریکوں کی تنظیم کے لیے کافی نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ عوام کی ضرورتوں، خواہشوں اور مطالبوں کو پیش نظر رکھا جائے اور یہ بتایا جائے کہ ان کے حصول کے لیے ان کو کیا کیا اقدام کرنے ہوں گے اور کن کن راہوں سے گزرنا ہوگا تب جا کر وہ منزل مقصود پر پہنچ پائیں گے۔ جس وقت سید احمد امیر محمد خاں سے انقطاع تعلق کے بعد دہلی پہنچے تو ان کے استاد

اور مُرشد شاہ عبدالعزیز نے انھیں اکبرآبادی مسجد میں قیام کرایا، اس کا مقصد یہی تھا کہ اب نئے طریق کار پر عمل کرنے کے لیے تنظیم اور مساعی کو اس کے مطابق ڈھالا جائے۔ اب تک جو طریق تھا، اس کے لیے کسی خاص قسم کی تنظیم اور جماعت کی ضرورت نہ تھی، نہ ہی خاص مقاصد کی تبلیغ کی ضرورت محسوس کی گئی تھی کیونکہ اس طریق کار کے مطابق تو اقتدار پر قبضے کے لیے کسی صاحبِ شمشیر کی خدمات ضروری قرار پائی تھیں۔

نئے طریق کار کے تحت بھی شمشیر ضروری تھی لیکن کسی صاحبِ شمشیر کی تلاش متروک قرار دی گئی۔ اور خود مسلم عوام کو اس قدر منظم اور متحرک کرنا مقصود تھا کہ یہ اسلامی سلطنت کے قیام کے لیے شمشیر اٹھانے پر مجبور ہو جائیں۔ نئے حالات کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمانوں کے اقتدار کو بحال کرنے کے لیے عوام کو منظم اور متحرک کیا جائے۔ جس وقت تنظیم اور تحریک اتنی مضبوط ہو جائے اور اس میں حملہ کرنے کی جرأت پیدا ہو جائے تو دشمن پر حملہ کر دیا جائے کیونکہ جہاد کی اس تحریک میں کامیابی کے بعد ہی یہ دارالحرب، دارالاسلام میں تبدیل ہو سکتا ہے چنانچہ اکبرآبادی مسجد میں انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جو منصوبہ اور طریق کار طے ہوا، اس وقت سے لے کر بالاکوٹ میں شہادت تک سید احمد اور ان کی تحریک کا ایک ہی مقصد رہا ہے کہ دعوت و تبلیغ سے عوام کو متحرک و منظم کیا جائے اور ان کو جہاد کے لیے تیار کیا جائے۔

دعوت و تبلیغ اور تنظیم

ان مقاصد اور حالات نے شاہ عبدالعزیز اور ان کے رفقاء کو یہ سوچنے پر آمادہ کیا کہ اس تحریک کی قیادت ایسے شخص کے ہاتھ میں ہو جو صرف زہد و تقویٰ کے میدان ہی کا شہ سوار نہ ہو بلکہ اس کو فنِ سپہ گری سے بھی واقفیت ہو تاکہ وہ جہاد کے فرائض احسن طریق پر انجام دے سکے۔

یہ درست ہے کہ علمائے حق کے اپنے خاص طریقے ہوتے ہیں اور ان طریقوں کو بعض دفعہ عام رواج کے مطابق واضح نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی تحریکوں کی وضاحت کی راہ میں مشکلات

اور رکاوٹیں بھی ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان تحریکوں پر عقیدت اور تقدس کی اتنی گہری تہیں چڑھی ہوتی ہیں کہ انھیں ہٹا کر تحریکوں کے پیچھے کام کرنے والے محرکات کو سمجھنا اور سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک بات مسلمہ ہے کہ انیسویں صدی کی یہ سب سے بڑی اجتماعی تحریک تھی۔ یہی نہیں بلکہ نئے دور کی یہ پہلی تحریک تھی جس کی بنیاد جمہور پر رکھی گئی اور جس کا مقصد اپنے ملک کو آزاد کرانا اور اس میں اسلامی حکومت قائم کرنا تھا۔

اسلامی حکومت کا مطلب ہندو دشمن حکومت نہ تھا بلکہ ایک منصفانہ اور پائیدار حکومت مقصود تھی۔ لیکن یہ درست ہے کہ دعوت و تبلیغ اور تنظیم کلیتہً مسلمانوں ہی کی تھی اور خالصتہً مذہبی بنیادوں پر تھی۔ میں یہ بار بار دہرا چکا ہوں کہ انسانی شعور کو ابتدا میں مذہب ہی زبان عطا کرتا ہے۔ اسی کی حدود کے اندر تحریکیں منظم ہوتی ہیں اور مذہبی نعرے ہی عوام کو متوجہ کرتے ہیں۔ لیکن ان نعروں کی وسعتوں اور پہنائیوں میں عام انسانوں کی آس پیاس ہی پوشیدہ ہوتی ہے۔

جس وقت عام مسلمان ایک ایسے نظام حکومت پر سر دھنتا ہے جس میں خلیفہ وقت آدھا راستہ خود اونٹ پر سوار ہوتا ہے اور آدھا راستہ غلام کو اونٹ پر سوار کراتا ہے اور خود اس کے ہمراہ پا پیادہ چلتا ہے، یا خلیفہ وقت سے ایک عام بڑھیا بر سر عام، جبکہ وہ منبر پر خطبہ دے رہا ہے سوال پوچھ سکتی ہے کہ اے عمر! یہ قبا تم نے کس طرح بنوائی اتنا کپڑا تمھیں کیسے حاصل ہوا؟ اور اس خلیفہ کو اسی وقت اس بڑھیا کی تشفی کرنی پڑتی ہے تو ان مثالوں کا مطلب واضح ہوتا ہے کہ وہ خود اس نظام کا خواہاں ہے وگرنہ یہ مولوی، یہ قائد، یہ رہنما یہ مثالیں اسے کیوں سناتا۔ یہ اسے اسی لیے سنائی جاتی ہیں کہ اس کو بتایا جائے کہ اس کا ماضی یہ تھا اور حال یہ ہے۔ اب اگر اسی قسم کا نظام چاہتے ہو تو میدان میں نکلو۔ چنانچہ اب مورخ اور تجزیہ نگار کا یہ فرض ہے کہ مثالوں سے صرف یہ مراد نہ لے کہ یہ مذہبی جذبات کو ابھارنے کے لیے مثالیں دی جا رہی ہیں۔ بلکہ ان کا مقصد سماجی عمل کو تیز کرنا اور مخصوص مقاصد کی بنیاد پر تحریک کو آگے بڑھانا ہے یہ مذہبی مثالیں اس لیے ضروری ہوتی ہیں کہ عوام اس زبان

کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں سمجھتے ان کا شعور ان مثالوں کی حدود میں محصور ہوتا ہے۔ اس لیے اس شعور کو جھنجھوڑنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہی زبان استعمال کی جائے اور وہی اسلوب اختیار کیا جائے جو عوام کو متاثر کرے۔ اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں کہ تحریک منظم کرنے والے جس وقت ان مقاصد کا اعلان کرتے ہیں تو وہ ان کے سلسلے میں دیانتدار نہیں ہوتے بلکہ عملی طور پر ان کا اعتقاد سو فیصد یہی ہوتا ہے لیکن سماجی محرکات، غیر شعوری طور پر اپنے دور کے مخصوص مطالبات کی صورت میں راہ پاتے ہیں۔ وگرنہ یہ تحریکیں عوام کو اتنے شدید طریقے سے متاثر ہی نہ کریں۔

تحریکوں کے مقاصد

اب جب ڈیڑھ صدی قبل جہاد کے لیے پورے ہندوستان کے مختلف گوشوں سے لوگ سر بکف نکلے ہوں گے تو ان کا مقصد ایک اسلامی حکومت ہی ہوگی جو ان کے خوابوں اور خیالوں میں رچی بسی ہوگی۔ وہ یقینی طور پر ایسی ہی ہوگی جس میں اس وقت کے مروجہ مظالم نہیں ہوں گے اس دور کی زیادتیاں ناپید ہوں گی، غربت سے چھٹکارا ملے گا۔ آئے دن کی افراتفری سے گلو خلاصی ہوگی۔ جاٹوں مرہٹوں اور سکھوں کی یلغاروں اور نادرشاہ و ابدالی کے حملوں سے امان ملے گی۔ انگریز سے نجات حاصل ہوگی اور سکھ چین کی زندگی کا دور دورہ ہوگا۔ کیا کسی عام مسلمان کو ایسے مقاصد کے لیے متحرک کیا جا سکتا تھا جو ان کی زندگیوں کو کبھی دکھی بنانے والے ہوں، یقینی طور پر نہیں۔ تو پھر جہاد اور اسلامی حکومت بھی ایک ایسا نعرہ اور ایک ایسا عمل ہوا جو عام انسانوں کی روزمرہ زندگی کو سنوارنے کا موجب ہوگا۔ اس پر جب حکم لگایا جائے گا تو یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ اس تحریک نے کس حد تک لوگوں کی روزمرہ زندگی کو سنوارا؟ کس حد تک ان کی زندگیوں میں انقلاب بپا کیا؟ کس حد تک ان کے شعور کو تیز کیا؟ اور کس حد تک انکی زندگیاں پہلے سے بہتر بنیں؟ اور اگر تحریک ناکام ہوئی ہے تو اس کی وجوہ کیا تھیں؟۔

اس لیے ہر تحریک خواہ وہ کتنی ہی مقدس، کتنی ہی مذہبی اور وقت کی حدود میں مقید ہو اس کی پشت پر کچھ مادی تقاضے اور عوامل ہوتے ہیں جو انسانوں کو اس تحریک کے پرچم تلے منظم ہونے، قید و بند کاٹنے اور سر کٹانے کے لیے اکساتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ مادی تقاضے کبھی بھی واضح شکلوں میں شعور میں داخل نہیں ہوتے بلکہ ایک نامعلوم فضا ہوتی ہے جو شعور کو متاثر کرتی رہتی ہے۔

اس لیے تحریکوں میں شامل ہونے والا عام انسان یہی سمجھتا ہے کہ وہ ایک نامعلوم ان دیکھے مقصد کے لیے لڑ رہا ہے۔

خانوادۂ ولی اللہی کی براہ راست شرکت

اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ تمام تقدس کے باوجود اس تحریک کو اس دنیائے رنگ و بو کی ایک تحریک کی صورت میں دیکھا جائے جس میں انسانوں نے نیک مقصد کے لیے حصہ لیا اور اپنے فہم و ادراک، حالات اور وسائل کے متعلق راہِ عمل اختیار کی۔ اکبر آبادی مسجد میں جب راہِ عمل کی تفصیلات طے ہوئیں تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس تحریک کو محبوب و مقبول بنانے کے لیے خانوادۂ ولی اللہی کھلم کھلا اس میں شرکت کرے کیونکہ اس وقت کے ہندوستان میں سب سے زیادہ منظم اور با اثر خاندان شاہ ولی اللہ ہی کا تھا۔ اس خاندان کے علم و فضل نے پورے ہندوستان کو پچھلی ایک صدی سے مسحور کر رکھا تھا۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی برابر کے شریک تھے۔ اس لیے جب کسی تحریک میں اس خاندان کے افراد شریک ہوتے ہیں تو وہ خود بخود عوام میں مقبولیت کی کئی ایک منزلیں طے کر لیتی ہے دوسرے یہ خاندان پشت ہا پشت سے رشد و ہدایت کا منبع بنا رہا تھا۔ ہندوستان کے لاکھوں مسلمان خاندان اس خانوادے کے حلقہ ارادت میں شامل تھے۔ اب جب مرشد اور پیر کا خاندان کسی تحریک کی قیادت کرتا ہے اور اس میں عملی طور پر شریک ہوتا ہے تو یہ شرکت خود اس امر کا اعلان ہوتی ہے کہ وہ اپنے ارادت مندوں کو اس طرف بلا رہا ہے یہی نہیں بلکہ اس

خانوادے نے تین پشتوں سے درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری کر رکھا تھا۔ اور ہندوستان کے گوشے گوشے میں ایسے علماء موجود تھے جو اس خاندان کے تربیت یافتہ تھے اس لیے شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحیٔ کی ذات کا کسی تحریک میں شامل ہونا اور اس کی قیادت پر ایمان لانا ہندوستان کے مختلف گوشوں میں پھیلے ہوئے علماء کے لیے اشارہ تھا کہ وہ بھی اس تحریک میں ہوں اور جس قیادت پر وہ اپنے اعتقاد کا اظہار کر چکے ہیں، وہ سبھی علماء اس سے اپنی عقیدت کا اظہار کریں۔

ان ہی تنظیمی اور تبلیغی ضرورتوں اور سید احمد کے زہد و تقویٰ نے خانوادۂ شاہ ولی اللہ کے افراد کو سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر اکسایا اور مائل کیا، اس کا سب سے بڑا ثبوت ہی یہ ہے کہ بیعت کا آغاز ہی خود اس خانوادے کے افراد سے ہوا، جو خود رشد و ہدایت کا مرکز تھا۔ اور جن افراد نے آگے سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کی، وہ خود علم و فضل کے میدان میں یگانہ تھے، زہد و تقویٰ میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہ تھے۔ اور تو اور، اپنے عقائد و مسلک کی تبلیغ میں بھی دو دھاری تلوار تھے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کی۔

اس تنظیم کی تشکیل و ترتیب کے متعلق مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:۔

"سید صاحب کا نصب العین اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مسلمانوں کو حقیقی معنوں میں مسلمان بنایا جائے۔ جہاد فی سبیل اللہ کی اس رُوح کو زندہ کیا جائے جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ اور ہندوستان میں خالص اسلامی حکومت کی بنیادیں استوار کی جائیں جو آٹھ سو برس تک مسلمانوں کے زیرِ نگیں رہنے کے بعد تیزی سے اغیار کے قبضے میں جا رہا تھا۔ جب تک نواب امیر خاں آزاد رہا، سید صاحب نے اس کا دامن نہ چھوڑا۔ نواب نے انگریزوں سے معاہدہ کر لیا اور امید کا یہ چراغ گل ہو گیا تو سید صاحب کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ اپنے نصب العین کی خاطر تنظیم کا مستقل بندوبست کریں۔ مجھے یقین ہے کہ دہلی پہنچنے سے قبل ہی وہ

اپنے ذہن میں ایک نقشۂ عظیم بنا چکے تھے جسے جامۂ عمل پہنانے کی غرض سے وہ دہلی ٹھہر گئے۔ اور ایک برس تک وطن کا رخ نہ کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے میرٹھ، مظفر گڑھ، اور سہارن پور وغیرہ کا دورہ کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے سوچے ہوئے نظام کی کامیابی کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرلیں پھر جہاں جائیں اس کے لیے اپنی زندگی کے گراں مایہ اوقات وقف رکھیں۔ وہ نہ کسی خطے کے رئیس تھے، نہ ذخائر زر کے مالک۔ نواب امیر خاں نے جن حالات میں کام شروع کر کے بڑی جمعیت فراہم کرلی تھی۔ وہ باقی نہ رہی تھی، اس لیے کہ انگریز ہندوستان کے بڑے حصے پر قابض ہوچکے تھے۔ سید صاحب کے پاس دینی حمیت، جذبہ جہاد، اسلام اور روحانی دولت کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہی قدسی جوہر تھے جن کے بل پر انھوں نے ارشاد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔ ایک طرف مسلمانوں کے عقائد و اعمال پیش نظر رکھے، دوسری طرف ان کے سینوں میں جہاد فی سبیل اللہ کی حرارت پیدا کی۔ مسلمان اگر سچا مسلمان ہو تو ناممکن ہے کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ کے جذبے سے عاری ہو، ناممکن ہے اس کے بدن کا ہر قطرۂ خون راہِ خدا میں بہنے کو اپنی سب سے بڑی سعادت نہ سمجھے۔ یہی طریقہ تھا جس سے سید صاحب سے چند سال بعد قفقاز کے شہرۂ آفاق مجاہد شیخ شامل نے اختیار کیا اور غازیوں کی ایک ایسی جماعت تیار کرلی جو رُبع صدی تک روس کی جابرانہ طاقت سے ٹکراتی رہی یہی طریقہ تھا جسے سید صاحب سے چالیس برس بعد شیخ محمد احمد سوڈانی نے اپنے وطن میں اختیار کیا اور نہایت قلیل مدت میں بے رُوح سوڈانیوں کو منظم کر کے حمیتِ اسلام اور جوش آزادی کی راہ میں ایک بے پناہ قوت بنا دیا۔“

یہاں تنظیم اور تحریک کی ابتداء کے متعلق مولانا مہر اپنے اسی موقف پر قائم ہیں کہ سید احمد نے تنظیم و تشکیل تحریک کی تمام تفصیلات دہلی پہنچنے سے پہلے طے کرلی تھیں اور اس میں فقط سید احمد کا اپنا ہی فکر کام کر رہا تھا اور ولی اللہی فکر سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن سید احمد

نے اس کے بعد تقریباً ایک سال دہلی میں قیام کیا اسی قیام کے دوران ایک عالم باعمل اور ایک صاحب طریقت کی حیثیت سے ان کا شہرہ ہوا وہ بھی اس وقت جب خانوادۂ ولی اللہی کے بہترین افراد نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ چنانچہ خود مولانا مہر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان اکابر علم کی بیعت نے وقت کے اکثر اصحاب کی توجہ سید صاحب کیطرف پھیر دی۔ دہلی اور آس پاس کے تمام اقطاع و بلاد کی فضا آپ کی شہرت سے معمور ہو گئی۔ دور دور سے لوگ بیعت کے لیے پہنچنے لگے۔ جہاں جہاں یہ صدا پہنچی کہ شاہ اسماعیل، مولانا عبدالحئی اور شاہ اسحاق نے سید احمد کی بیعت کر لی ہے وہاں وہاں کے لوگوں میں طلب و شوق کی بے تابی پیدا ہو گئی ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مختلف مقامات سے دعوت نامے سید صاحب کے پاس پہنچنے لگے کہ سب لوگ حاضر نہیں ہو سکتے، لطفاً خود تشریف لائیں اور فیض توجہ سے مشرف فرمائیں۔ گویا دعوت، اصلاح اور تنظیم جہاد کی جو سکیم سید صاحب نے اپنے ذہن میں سوچ رکھی تھی، اس پر عمل کا ساز گار وقت آ گیا تھا۔ اس لیے انھوں نے وطن جانا ملتوی کر دیا اور اصل کام میں لگ گئے۔

خانوادۂ ولی اللہی کے افراد کی اہمیت کا جب یہ عالم تھا کہ ان کے واسطے سے لوگوں نے انھیں جانا اور ان کی (سید صاحب کی) اہمیت کو تسلیم کیا تو پھر اس سے پہلے اور دہلی میں قیام سے بھی پہلے اس تحریک اور تنظیم کے متعلق اپنے آپ سوچ لینا کہاں تک درست ہو سکتا ہے؟۔

سید صاحب نے اس تحریک کی ایک ایک تفصیل دہلی میں قیام کے دوران خانوادہ ولی اللہی کے مشورہ اور ہدایت کے بعد ہی طے کی ہوگی اور ان ہی تفصیلات میں بیعت اور اس خانوادے کی تحریک میں شرکت بھی ہوگی۔ کیونکہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس خانوادے کی شرکت ہی اس کی مقبولیت کا ایک وسیلہ بنی۔

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

اور اُن کے افکار

تحریکوں کی نشوونما کے لیے عوام کی نفسیات کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے بلکہ بنیادی شرط ہے۔ لیکن تحریکوں کا کام صرف نفسیات سمجھ عوام کی اطاعت اور پیروی کرنا نہیں ہوتا بلکہ تحریکیں عوام کی رہنمائی اور بے چینی اور اضطراب دور کرنے کے لیے وجود میں آتی ہیں، عوام شعوری اور غیر شعوری طور پر ان رہنماؤں کے ہاتھ میں اعتقاد کا ہاتھ دیتے ہیں جو ان کے دلوں میں چھپے ہوئے رہنما کی شبیہہ پر پورے اترتے ہوں۔ اس کی خصوصیات ان میں موجود ہوں اور یہ شبیہہ اپنی گوناگوں خصوصیات کے ساتھ لوگوں کے دلوں میں کیسے جنم لیتی اور کیسے پروان چڑھتی ہے؟ اس کی تخلیق اور پرورش حالات کرتے ہیں، اپنے گرد وپیش کی فضا کرتی ہے۔ اب جب سید احمد کی عوامی تحریک کی ابتدا ہوئی تو اس کے قائدین میں ایسے لوگ تھے جو پہلے سے اپنے علاقوں میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے مختلف گوشوں میں محبوب اور مقبول تھے اور ان کی محبوبیت میں وہ تمام خصوصیات اور ان کی شبیہہ میں وہ تمام خدوخال موجود تھے جو لوگوں کے دلوں میں اپنے قائدین کے لیے چھپے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان قائدین کی فہرست میں سب سے اوپر جو نام آتا ہے، وہ شاہ اسمٰعیل کا ہے۔ اس پوری تحریک میں سب سے نمایاں کردار بھی شاہ اسمٰعیل ہی کا رہا ہے

اب تک کوئی ایسی تحریک وجود میں نہ آئی تھی جس میں عوام نے شرکت کی ہو یا عوام سے کسی خاص سمت چلنے کے لیے کہا گیا ہو، نہ انھیں شمشیر اٹھانے کے لیے آج تک کسی نے دعوت دی تھی کیونکہ اب تک تو شمشیر اٹھانے کا کام پیشہ ور فوجیوں کا تھا۔ عام لوگوں کو واعظ، مولوی اور پیر زیادہ تر عام درجے کی دینداری کی باتیں سنا دیتے اور عوام ان پر کچھ عمل کرتے اور کچھ نہ کرتے۔ غرضیکہ اس وقت نہ تو دین کے بارے میں کوئی تحریک اٹھی تھی اور نہ اسلامی حکومت کے احیا کے لیے اور نہ مسلمانوں کے تنزل کو روکنے کے لیے جمہور کو کسی نے پکارا تھا۔

اکبر آبادی مسجد میں یہ تحریک منظم ہوئی تو اس کے لیے عوام ہی کو منتخب کیا گیا۔ اور عوام کو اس پرچم تلے جمع کرنے کے لیے مختلف ذرائع اختیار کیے گئے۔ ان ذرائع میں سب سے اہم دعوت و تبلیغ تھی۔ دوسرے سید احمد کی ذات کے اردگرد عوام کو جمع کرنے کے لیے ایک مخصوص طریقہ شروع کیا گیا جو محمدیہ کہلایا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ بعض دوسرے طریقوں میں جو بدعات شامل ہو گئی ہیں، ان سے الگ لوگوں کو اپنے مخصوص اسلوب پر مجتمع کیا جائے اس دور میں جماعتیں وجود میں نہ آتی تھیں، نہ ان کی رکنیت کے فارم شائع ہوتے تھے۔ اس زمانے میں رکنیت کا فارم سید احمد کے ہاتھ پر بیعت تھا۔ اور یہ اعلان ہوتا تھا اس جماعت میں شرکت کا۔

جب ابتدائی طور پر تحریک شروع ہوئی تو سب سے بنیادی کام جو کسی تحریک کا ہوتا ہے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہے، اس توجہ کے لیے وعظ و نصیحت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کی بنیاد ہی اسلام کی سادگی ٹھہری جو نجد کے عبدالوہاب سے لے کر بنگال کے شریعت اللہ، تیطو میاں اور سید احمد میں مشترک تھی۔ کیونکہ یہی سادگی تھی جو لوگوں کو بالآخر متاثر کرتی تھی۔ ان کے دل سے ہر قسم کا رعب دور کرتی تھی اور دنیا کو بدلنے کا جذبہ پیدا کرتی تھی۔

سید احمد، شاہ اسمٰعیل اور ان کے تمام رفقاء نے جہاد کی تحریک کا اعلان کرنے تک اپنی تنظیم کے لیے دعوت و تبلیغ کا انحصار اسلام کی دینی تعلیمات پر رکھا۔ اور اس کے لیے یہ پوری جماعت شمشیر بکف رہی اور یہی اپنے عقائد پر سختی سے پابندی تھی جس نے اس جماعت کو باقی مسلمانوں سے نہ صرف ممیز کیا بلکہ اس میں جماعتی طور پر ہم آہنگی اور اخوت پیدا کی

یہی وہ خصوصیات ہوتی ہیں جو جدوجہد کے لیے ضروری قرار پاتی ہیں۔

اس تحریک کی طرف عوام کو متوجہ کرنے والا سب سے پہلا کارنامہ شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحئی کی سید احمد کے ہاتھ پر بیعت تھا۔ شاہ اسماعیل، شاہ ولی اللہ کے پوتے تھے۔ انکے والد شاہ عبدالغنی، حضرت شاہ ولی اللہ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ شاہ اسماعیل کا سن پیدائش ۱۷۷۸ء ہے۔ اس طرح سے یہ اپنے مرشد سید احمد سے بھی عمر میں سات آٹھ برس بڑے ہیں۔ علم میں تو خیر ان کا درجہ بہت بلند ہے۔

شاہ اسماعیل کی سب سے بڑی خوبی یہ رہی ہے کہ انھوں نے اپنی آنے والی مجاہدانہ زندگی کے واسطے عالمِ شباب ہی میں تیاریاں شروع کر دی تھیں، وہ علم اور بہادری میں ابتدا ہی سے یکتا تسلیم کیے جاتے تھے۔ چنانچہ خود شاہ عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے۔

"ہر تعریف اس خدائے پاک کے لیے ہے جس نے بڑھاپے کے عالم میں بھی اسماعیل اور اسحاق عطا کیے۔"

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:

"اسماعیل کا علم کسی خاص شعبے میں محدود نہیں۔ جن لوگوں نے میرا عہدِ شباب دیکھا ہے، وہ اگر اس کا نمونہ دیکھنا چاہیں تو اسماعیل کو دیکھ لیں۔"

شاہ اسماعیل شہید کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب آپ نے مختلف علوم مہارت حاصل کر لی تو ورزش اور جفاکشی کی طرف متوجہ ہوئے۔ پٹا اور گتکا (بنوٹ) کی مشق کے لیے مرزا رحمت اللہ بیگ کی شاگردی اختیار کی۔ اور یہ وہی رحمت اللہ بیگ تھے جن کی شاگردی میں آنے کے لیے مغلیہ خاندان کے شہزادے منتیں مانا کرتے تھے۔ اسی طرح گھوڑا سواری آپ نے میاں رحیم بخش چابک سوار سے سیکھی۔ یہ میاں رحیم بخش اپنے دور کے مشہور چابکسوار تھے، جو اپنے شاگرد سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کے حلقے میں شامل ہو گئے اور ان ہی کے جلو میں سرحد پار پہنچ کر اپنی جان بھی ہارنے سے گریز نہ کیا۔ بالآخر جامِ شہادت نوش کیا

شاہ اسماعیل نے اپنے مکان کے قریب باقاعدہ اکھاڑہ قائم کیا اور دن رات لنگر لنگوٹ

کس کر کسرت کرنے میں مصروف رہے۔ جمنا میں پیراکی کا سلسلہ شروع کیا تو مہینوں یہ مشغلہ جاری رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آپ درس و تدریس کا سلسلہ جاری کر چکے تھے۔ چنانچہ طلباء کو ہدایت تھی کہ وہ کتابیں لے کر جمنا پر پہنچا کریں۔ شاگرد کتابیں لے کر جمنا کے کنارے پہنچ جاتے، استاد تیرتا ہوا آتا۔ سبق دیتا اور پھر پانی میں گم ہو جاتا۔ وہ سانس پر کنٹرول کی مشق کے لیے دہلی سے آگرے تک تیرتے ہوئے جاتے یہ سلسلہ ختم ہوا تو تپتی زمین پر ننگے پاؤں چلنے کی مشق شروع کر دی۔ مئی اور جون کی جھلسا دینے والی دھوپ اور گرمی میں فتح پوری مسجد میں صحن میں ننگے پاؤں کئی کئی گھنٹے چلنے کی مشق کرتے۔ پھر نشانہ باندھنا اور بندوق چلانا شروع کی تو اس میں کمال حاصل کیا۔ خود ہی کہا کرتے تھے کہ

"ناممکن ہے کہ جانور میرے سامنے آئے اور پھر زندہ بچ نکلے"۔ ایک مرتبہ کسی دوست نے کہا اگر اس کی موت ہی نہ آئی ہو تو آپ کیسے مار ڈالیں گے تو بولے۔ "اگر اس کی موت نہ آئی ہوگی تو میرے سامنے آئے گا ہی نہیں"۔

علمی مرتبہ

مولانا شاہ اسمٰعیل کی علمی بصیرت اور دقتِ نظر کے مختلف واقعات زبان زدِ عام ہیں اور کون سا علمی حلقہ ایسا تھا یا ہے جو ان کے علمی تبحر کا معترف نہ ہو۔ ۱۸۵۷ء میں جب مولانا رشید الدین کے صاحبزادے مولانا سدید الدین کا مشہور و معروف کتب خانہ تباہ و برباد ہو گیا تو وہ فرمانے لگے۔ "جو کتابیں ضائع ہو گئیں وہ پھر بھی دستیاب ہو جائیں گی لیکن افسوس تو ان حاشیوں کا ہے جو حضرت شہیدؒ نے مختلف کتابوں پر تحریر فرمائے تھے جن کے فقدان سے بیش بہا علمی نکات معدوم ہو گئے"۔

آپ کے وعظ میں عام باشندوں کے ساتھ خود اہلِ علم بہت بڑی تعداد میں شریک ہوتے۔ سوانح احمدی میں درج ہے کہ ایک مرتبہ ایک رکوع تلاوت کیا۔ مولوی امام بخش صہبائی، مولانا عبداللہ خان اور مفتی صدر الدین بھی اس وعظ میں شریک تھے۔ اس رکوع کی تفسیر

میں ایسے عجیب وغریب نکات بیان فرمائے کہ سب ششدر رہ گئے اور دوبارہ سننے کے متمنی ہوئے۔ لیکن جب دُوسری دفعہ شاہ صاحب نے اسی رکُوع کی تفسیر بیان کی تو اس میں کئی ایسے نکات بیان فرما گئے جو پہلے سے بھی زیادہ عجیب تھے۔

اسی طرح ایک دن کا واقعہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز کوئی فتویٰ تحریر کر رہے تھے اسی دوران اُٹھ کر کسی کام سے اندر جانے کی ضرورت پیش آئی اور یُوں ہی فتویٰ لکھتے لکھتے چھوڑ کر اندر چلے گئے۔ اتنے میں شاہ اسمٰعیل وہاں پہنچے، انھوں نے فتوے پر نگاہ ڈالی اور اس کی بعض فروگزاشتوں کی اصلاح کر دی۔ شاہ عبدالعزیز جب باہر آئے تو انھوں نے فتوے کی اصلاح و ترمیم دیکھی بہت مسرور ہوئے اور فرمایا، ”الحمدللہ! ابھی ہمارے خاندان میں علم باقی ہے۔“

شاہ اسمٰعیل نے سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے بہت پہلے رسوم اور بدعات کے خلاف جہاد شروع کر دیا تھا۔ اس لیے کہ اس وقت مسلمانوں اور ہندوؤں کی زندگی میں توہم پرستی اتنی گھر کر گئی تھی کہ اس نے انسانی خود اعتمادی تک کو مجروح کر رکھا تھا۔ شاہ اسمٰعیل نے اپنی توجہ ان بدعات اور جہالت پر مبنی رسُوم کے خاتمے کے لیے جدوجہد پر مرکوز کیے رکھی۔ سید احمد کے ساتھ جب تحریک میں شریک ہوئے تو اس کی بنیاد بھی انھی بدعات کے خاتمے پر رکھی۔ مدتوں ان کے وعظ دہلی میں ایک متنازعہ مسئلہ بنے رہے۔ کچھ تھے جو ان کے وعظوں پر جان چھڑکتے اور کچھ تھے جو اسماعیل کی جان کے پیاسے ہو رہے تھے۔ یہی زمانہ ہے جس میں آپ کی فضل حق خیر آبادی سے ٹھن گئی تھی۔

وعظوں پر پابندی

ہم نے اپنے زمانے میں بھی دیکھا ہے کہ قیادت کے لیے خطابت ایک اہم خصوصیت رہی ہے۔ اس پہلی تحریک کے اکثر قائدین فنِ خطابت کے میدان کے شہ سوار تھے۔ سید احمد اور اسماعیل شہید دونوں کی خطابت کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ اسماعیل کی

خطابت کی دھاک ان کے پہلے وعظ ہی نے بٹھا دی تھی۔ یہ جمعۃ الوداع کے موقع پر دہلی کی جامع مسجد میں کیا گیا تھا۔ پہلے ہی وعظ میں انھوں نے دہلی کے مسلمانوں کی طرزِ زندگی پر کھلم کھلا حملے کا اعلان کر دیا۔ اور قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی:

"تیرے رب کی قسم! وہ مومن کہلانے کے مستحق نہیں، جب تک اپنے تمام تنازعات میں آپ کو ثالث نہ مان لیں، پھر آپ جو کچھ فیصلہ فرمائیں اس پر اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور پوری طرح سرِ تسلیم خم کر دیں۔"

یہ اصول تھا جس پر شاہ اسماعیل نے اپنی جدوجہد کی بنیاد رکھی اور "جو بھی فعل اور تعلیم شرعی نصوص سے ثابت نہیں ہوتی وہ درست نہیں ہے۔" کی بنیاد پر انھوں نے مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کو پرکھا اور بتایا کہ وہ کس طرح غیر اسلامی طریقے اختیار کیے ہوئے ہیں۔ بہرحال حسنِ خطابت اور عمدگی استدلال سے ایک ایک دل کو جھنجھوڑا۔ ان میں شیفتگی اور وارفتگی کی آگ بھڑکا دی اور یہی وہ آگ تھی جو ان وارفتگان کو کشاں کشاں ان کے وعظوں میں لے جاتی۔ اب دہلی کی زبان پر ان کے جملوں کا رنگ چڑھنے لگا۔ ان کے مُنہ میں شاہ اسمٰعیل کی زبان بولنے لگی۔ عوام کا ہجوم ان کا شیدائی ہو گیا۔ لیکن وہ لوگ جن کی زندگیوں کا دار و مدار ان بدعات اور رسومِ قبیحہ پر تھا وہ ان وعظوں کو کیسے گوارا کر سکتے تھے۔ ان کو اسماعیل کیسے پسند آسکتا تھا یہی نہیں بلکہ وہ عمائدین جو اپنی نام نہاد مقبولیت کے سہارے قربِ سلطانی حاصل کرتے تھے۔ اسماعیل ان کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکنے لگے۔ اسی فضا میں مولانا فضلِ حق خیرآبادی سے بھی ان کی ٹھن گئی۔ مولانا خیرآبادی فلسفہ اور منطق کے ماہر تھے، الیسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے جو ریذیڈنٹ بادشاہ کے دربار میں مقرر تھا، اس کے سررشتہ دار تھے۔ ریذیڈنٹ بجا طور پر مولانا خیرآبادی کا بہت قائل تھا کیونکہ علمیت میں حقیقتہً آپ کا درجہ بہت بلند تھا اور خود بادشاہِ وقت آپ کو بہت عزیز رکھتا تھا، احترام کی نگاہوں سے دیکھتا تھا مولانا اپنے فارغ وقت میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھتے اور طلباء کو فلسفہ اور منطق پڑھاتے تھے۔ لیکن ان کی شاہ اسمٰعیل شہید سے کیوں کر ٹھن گئی۔ اس قضیے کی

تفصیلات بیان کرتے ہوئے مولانا محمد میاں دہلوی لکھتے ہیں۔

" بدقسمتی سے اس جماعت نے جس کے ذاتی مفادات اور لوٹ کھسوٹ پر شاہ اسمٰعیل کے وعظوں اور تقریروں کا تباہ کن اثر پڑا، مولانا فضل حق خیرآبادی کا سہارا ڈھونڈا اور ان کو اپنا امام بنالیا۔ مولانا فضل حق نے خود پسند اور برخود غلط مولویوں کی طرح اول تو طلبا۔ کو لکھا پڑھا کر حضرت مولانا اسمٰعیل کے درس میں بھیجنا شروع کر دیا مگر جب اس کا اثر الٹا پڑا اور طلبا جو خود سخن فہمی کا سلیقہ رکھتے تھے مولانا فضل حق سے جدا ہو کر شاہ اسمٰعیل کے حلقہ عقیدت میں شامل ہونے لگے۔ تو مولانا نے خود شاہ اسمٰعیل کے وعظ، ان کے عقائد اور ان کی تحریروں پر حملے شروع کر دیے اور وہ مسائل جن کا تذکرہ بھی عوام میں شرعاً جائز نہیں، مولانا فضل حق کی منطقی موشگافیوں سے عام مسلمانوں کے جنگ جدل کا موضوع بن گئے۔ مولانا فضل حق کے ان عام حملوں اور نکتہ چینیوں سے بھی شاہ اسمٰعیل کی مقبولیت کے سیلاب کے آگے بند نہ باندھا جاسکا اور وہ نکتہ چینی کے خس و خاشاک کو بہاتا ہوا آگے بڑھتا رہا اس پر باشندگان دہلی کے پندرہ سو دستخطوں سے ایک محضر نامہ مرتب کیا گیا۔ اس کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقرر کردہ ریذیڈنٹ کی بارگاہ میں بھیجا گیا۔ اس محضر نامے میں کہا گیا تھا کہ شاہ اسمٰعیل کے وعظ اور خطبے نقض امن کا باعث بن سکتے ہیں اور مسلمانوں کے ایک کثیر حلقے کی دلآزاری کر رہے ہیں۔ چنانچہ امنِ عامہ کے نام پر زبان بندی کے احکام جاری ہو گئے اور وعظ و نصیحت پر پابندی لگا دی گئی۔ لیکن اس پابندی نے دہلی میں ہیجان بپا کر دیا اور لوگوں میں غم و غصہ پھیلنے لگا۔ چنانچہ خود شاہ اسمٰعیل نے ریذیڈنٹ کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں اس پابندی کے خلاف احتجاج کیا گیا اور اس میں بتایا گیا کہ کس طرح وعظ سے نہیں بلکہ وعظ پر اس طرح پابندی سے نقض امن کا اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مراسلے میں شاہ صاحب نے اس پابندی کے خلاف ایسی وجوہ قلم بند کیں، جن کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

ریذیڈنٹ نے پابندی کے احکام واپس لے لیے۔ لیکن پابندی کی منسوخی کے احکام سررشتہ دار مولانا فضل حق خیرآبادی نے دبا لیے۔ جب شاہ اسمٰعیل کو اپنے مراسلے کا کوئی جواب موصول نہ ہوا تو وہ خود ریذیڈنٹ سے ملے اور گفتگو کی۔ جب ریذیڈنٹ کو معلوم ہوا کہ پابندی کی منسوخی کے احکام دبا لیے گئے ہیں اور سررشتہ دار نے اُن تک پہنچائے ہی نہیں تو سررشتہ دار کو تین ماہ کے لیے معطل کر دیا گیا۔ بالآخر چالیس روز کی پابندی کے بعد وعظوں کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔"

عوامی اجتماعات میں وعظ

شاہ اسمٰعیل نے اپنے وعظوں کو محراب و منبر ہی تک محدود نہ رکھا بلکہ وہ گلی کوچوں میلوں ٹھیلوں اور بازاروں میں پہنچ جاتے وہاں لوگوں کو پند و نصیحت کرتے، جامع مسجد کی سیڑھیاں جہاں روزانہ بازار لگتا تھا وہاں اچھا خاصا ہجوم تھا۔ یہ سیڑھیاں تو مرکزی دارالارشاد کی حیثیت اختیار کر گئی تھیں۔ اسی دارالارشاد کا ایک واقعہ ہے کہ شاہ اسمٰعیل انہی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر وعظ کر رہے تھے کہ ایک ہیجڑے کا ادھر سے گزر ہوا، وہ وعظ سننے کے لیے رک گیا اس کے ہاتھوں میں مہندی لگی تھی، بانہوں میں چوڑیاں، پاؤں میں جھانجن اور سُرخ جوڑا زیب تن کیا ہوا تھا۔ شاہ اسمٰعیل نے جب اُسے دیکھا تو اسے خطاب کر کے وعظ کہنا شروع کر دیا۔ اس ہیجڑے کا یہ عالم ہوا کہ اس نے وہیں کھڑے کھڑے چوڑیاں توڑ ڈالیں، زیور اتار پھینکے اور اور ہاتھوں سے مہندی کی لالی مٹانے کے لیے اس زور سے سیڑھیوں پر ہاتھ رگڑے کہ ہاتھوں سے خون بہنے لگا۔ جب وعظ ختم ہوا تو توبہ کی اور شاہ اسمٰعیل کے حلقے میں شامل ہو گیا۔ یہی ہیجڑا جہاد میں شاہ شہید کے ہمراہ گیا اور شہید ہوا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ بھی عجیب و غریب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مدرسہ رحیمیہ کے دروازے پر آپ کھڑے تھے کہ سامنے سے چند ہوشربا مہ وشیں کھلے منہ بناؤ سنگار کیے بہلیوں میں بیٹھی گزریں۔ معلوم ہوا کہ یہ مسلمان کسبیاں ہیں جو کسی رنڈی کے ہاں کسی تقریب میں جا رہی

ہیں۔ اس پر شاہ شہید نے کہا کہ جب یہ مسلمان ہیں تو ہماری بہنیں ہیں۔ کیا خدا ہم سے نہیں پوچھے گا کہ اس قدر مسلمان عورتیں بدکاری اور زناکاری میں گرفتار تھیں اور تم نے ان کو نصیحت نہیں کی؟ اس واسطے اب تو میں ان کے مکان پر جاکر نصیحت کروں گا۔ دوستوں نے منع کیا کہ یہ وضع داری کے خلاف ہے لیکن شاہ شہید نے رات کو فقیرانہ لباس پہنا اور چل پڑے۔ دروازے پر پہنچ کر آواز دی۔ او اللہ والیو! او اللہ والیو! خادمہ دوڑی ہوئی آئی۔ تم کون ہو؟ فرمایا فقیر ہے صدا سنائے گا اور تماشا دکھاتے گا۔ وہ اپنے ساتھ لے گئی۔ آپ نے مالکہ کو دریافت کیا کہ کہاں ہے تو معلوم ہوا کہ بالاخانے پر مہمانوں کے ساتھ جشن نوروز منا رہی ہے۔ آپ وہیں تشریف لے گئے گو لباس فقیرانہ تھا۔ لیکن دلی کا کون سا فرد تھا جو شاہ اسماعیل کو نہ پہچانتا ہو۔ جب ان رنڈیوں نے شاہ صاحب کو اپنے ہاں دیکھا تو ششدر رہ گئیں۔ ان کو مسند پیش کی اور آپ زمین پر بیٹھ گئیں شاہ صاحب نے ان کو نصیحت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے توبہ کر لی۔

اجتماعی قیادت

اس تحریک میں سید احمد کے رفقاء کا درجہ دراصل اتنا ہی بلند ہے جتنا سید احمد کا اپنا ہے مذہبی طور پر سید احمد کا رتبہ کتنا بلند ہے؟ اس کے متعلق رائے قائم کرنا مقصود نہیں اور نہ ہی تحریک کا تجزیہ اس موقف کے پیش نظر کیا جا رہا ہے بلکہ اس تجزیے کا مقصد اجتماعی محرکات کی تلاش ہے اور یہ کہ ان اجتماعی محرکات کے پس منظر میں یہ تحریک کیسے پروان چڑھی، اس نے اپنے مخصوص فکر کو بروئے کار لانے کے لیے کیا طریق کار اور دائو پیچ اختیار کیے جس وقت ایک ایسی تحریک کے بارے میں بات ہو رہی ہو جو خالصتہً مذہبی و دینی تحریک کے طور پر پیش کی جاتی رہی ہو اور جس پر ڈیڑھ صدی تک اسی انداز سے گفتگو ہوتی رہی ہو تو یہ باتیں ممکن ہیں چونکا دیں۔ لیکن ان سے مقصد صرف اتنا ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ دین انسانوں کے لیے ہوتا ہے۔ اور جب کوئی تحریک ابھرتی ہے تو اس میں عام انسانوں کے مفادات کی غمازی ہوتی ہے۔ ان کے دکھوں اضطراب اور بے چینی کا علاج ہوتا ہے۔ اس لیے ان دینی تحریکوں کو بھی دنیاوی تحریکوں سے

الگ نہیں کیا جا سکتا۔ جب اس تحریک نے عوام کو منظم کرنے اور انہیں متحرک کرنے کا بیڑا اٹھایا تو اس کے لیے لازم ٹھہرا کہ ایسی قیادت کو سامنے لایا جائے جو عوام کی صحیح رہنمائی کر سکے اور اس موقف کے لیے لڑنے مرنے پر تیار کر سکے۔

ان مقاصد کے لیے ایک اجتماعی قیادت کی ضرورت تھی تاکہ علم و فضل، زہد و تقویٰ، تحریر و تقریر اور تنظیمی صلاحیتیں، ان سب خصوصیات کو مجتمع کر کے عوام کو متحرک کرنے کے کام میں لایا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تحریک کے قائدین میں جتنے بھی لوگ شامل تھے ان میں یہ صلاحتیں موجود تھیں۔ اس لحاظ سے یہ اجتماعی قیادت تھی۔ اس اجتماعی قیادت میں سب سے زیادہ کارہائے نمایاں سید احمد کے علاوہ حضرت اسماعیل شہید ہی کے گنوائے جاتے ہیں لیکن خود ان کا کہنا ہے کہ میرا اس سے زیادہ کوئی کمال نہیں کہ میں اپنے دادا کی بات سمجھ کر اسے اپنے موقع پر بٹھا دیتا ہوں اس طرح انھوں نے اس تحریک کا تسلسل قائم رکھا۔ لیکن شاہ اسمٰعیل کو اس کے باوجود اس تحریک کے سلسلے میں خاصا بڑا اعزاز حاصل ہے کیونکہ یہ شاہ شہید اور سید احمد ہی تھے۔ جنھوں نے اس تحریک کو نیا طریق کار مہیا کیا اور اس کو کامیاب بنانے کے لیے جدوجہد کی۔

تحریک کی کامیابی کے لیے مبلغ ہونا اور اپنے مسلک کے لیے جنون کی حد تک لگن کا اظہار بنیادی شرطیں ہیں۔ ان پر سید احمد جیسا پیر اور شاہ اسمٰعیل جیسا مرید دونوں ہی پورے اترتے ہیں۔ لیکن جو سعادت اس مُرید یکتائے روزگار کو حاصل ہوئی وہ بہت کم مریدوں کو حاصل ہوئی ہے۔ بعض دفعہ تو خود مُرشد اس مُرید کی شہرت کے غُبار میں گُم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے تذکرے میں جس شیفتگی اور وارفتگی کے عالم میں امام احمد بن حنبلؒ کا ذکر کیا ہے، اسی انداز میں اور اسی وارفتگی سے شاہ اسمٰعیل کے متعلق راقم ہیں

شاہ اسمٰعیل ابُوالکلام کے "تذکرہ" میں

"اور پھر چند قدم آگے بڑھو، مقام عزیمت و دعوت کی کیسی کامل اور آشکارا مثال سامنے آتی ہے۔ ساری مثالوں سے آنکھیں بند کر لو۔ صرف یہی ایک

مثال زیر بحث حقیقت کے فہم و کشف کے لیے کافی ہے حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام ہر رنگ میں کس درجہ جامع و کامل ہے! بہ ایں ہمہ یہاں جو کچھ ہوا، تجدید و تدوین علوم و معارف اور تعلیم و تربیت اصحاب استعداد تک محدود کر دیا۔ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ فعلاً عمل و نفاذ اور ظہور و شیوع کا پورا کام تو کسی دوسرے ہی مرد میدان کا منتظر تھا اور معلوم ہے کہ توفیق الٰہی نے یہ معاملہ حضرت علامہ و مجدد، شہید رضی اللہ عنہ کے لیے مخصوص کر دیا تھا؟ خود حضرت شاہ صاحب کا بھی اس میں حصہ نہ تھا۔

مے خواست رست خیز عالم برآورد
آں باغباں کہ تربیت ایں نہال کرد

اگر خود شاہ صاحب اس وقت ہوتے تو ان ہی کے جھنڈے کے نیچے نظر آتے حضرت پیر انصاری کا قول ہے:

"من دید خرقانی ام لیکن اگر خرقانی دریں وقت می بود، باوجود پیرپش مریدے کردم۔"

(میں نے خرقانی کو دیکھا ہے لیکن اگر اس وقت خرقانی زندہ ہوتے، اپنی بزرگی کے باوجود مرید ہی ہوتے۔)

شاہ صاحب نے مزاج وقت کے عام تحمل و استبداد سے مجبور ہو کر بہ حکم:

بہ رمز نکتہ ادائے کنم کہ خلوتیاں
سر سبو بکشادند در فرو بستند

دعوت و اصلاح امت کے جو بھید کہ پرانی دہلی کے کھنڈروں اور کوٹلے کے حجروں میں دفن کر دیے گئے تھے اب اس سلطان وقت و سکندر عزم کی بدولت شاہ جہاں آباد کے بازاروں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ان کا ہنگامہ مچ گیا اور ہندوستان کے کناروں سے بھی گزر کر نہیں معلوم کہاں کہاں تک چرچے اور افسانے پھیل گئے۔ جن باتوں کے کہنے کی بڑوں بڑوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ

تھی وہ اب سر بازار کی جا رہی اور ہو رہی تھیں۔ اور خون شہادت کے چھینٹے حرف و حکایت کو نقوش دیوار بنا کر صفحۂ عالم پر ثبت کر رہے تھے۔

آخر کو لائیں گے کوئی آفت فغاں سے ہم
حجت تمام کرتے ہیں، آج آسماں سے ہم

پھر کیا اس وقت ہندوستان علم و فضل سے خالی ہو گیا تھا؟ یا حق پر چلنے والے اور حق کا درد رکھنے والے معدوم ہو گئے تھے؟ کون ہے جو ایسا کہہ سکتا ہے! خود اس خاندان عالی میں کیسے کیسے اکابر و اساتذہ علم و عمل موجود تھے حضرت شاہ عبدالعزیز کے درس و تدریس کی بادشاہت سمرقند و بخارا اور مصر و شام تک پھیلی ہوئی تھی شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے علم و عمل کے آفتاب تھے۔ خاندان سے باہر اگر ان کے تربیت یافتوں کو دیکھا جائے تو کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں ان کا فیضان علم کام نہ کر رہا ہو، بہ ایں ہمہ یہ کیا معاملہ ہے کہ جو وقت کا ایک سب سے بڑا کام تھا اس کے لیے کسی کے قدم کو جنبش نہ ہوئی، سب اور اور کاموں میں رہ گئے، یا حجروں کا کام یا مدرسوں کا، لیکن میلان والا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ وہ گویا خاص پہناوا تھا جو صرف ایک ہی جسم کے لیے تھا اور ایک پر ہی چست آیا۔ دنیا اس کے لیے خلعت، حکمت و عظمت اور تشریف و قبول کاندھے پر ڈالے منتظر کھڑی تھی۔ زمانہ اپنے سارے سامانوں کے ساتھ کب سے اس کی راہ تک رہا تھا۔ امیدواروں پر امیدوار تھے۔ یکے بعد دیگرے گزرتے رہے لیکن اس کا مستحق کوئی نہ نکلا۔

باز غم از عرض ہر کس کہ نمودم
عاجز شدو ایں قرعہ بنامم زسر افتاد

عوامی تحریک اور احکام

شاہ اسمٰعیل شہید کو جو خراج عقیدت و تحسین مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے مخصوص انداز میں

پیش کیا وہ واقعی بہت حد تک درست ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ جمہور کو متحرک کرنے کا سہرا اس خانوادے ہی جو اپنے علم و فن میں یکتا ہے، کسی اور کے سر نہیں بندھتا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ جس زمانے میں شاہ شہیدؒ نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اس وقت تنزل کی رفتار ایک طرف بہت تیز ہو چکی تھی، دوسری طرف برطانوی حکومت کا تسلط ہندوستان کے اکثر علاقوں میں حقیقت بن چکا تھا۔ اس لیے اب یہ امید اٹھ گئی تھی کہ تنزل کے اس سیلاب کو کوئی بادشاہ روکے گا یا کوئی مسلمان حکومت عقائد کو درست کرنے کا بیڑا اٹھائے گی۔ اس لیے اب جیسے سیاسی سطح پر تنزل کو روکنے کے لیے جمہوری تحریک ضروری ٹھہری تھی اس طرح دینی سطح پر عقائد کی درستی اس تحریک کا لازمی حصہ ٹھہرا گویا عقائد کی اصلاح کی مہم بھی اتنی ہی ضروری قرار پائی جتنی کہ تحریک جہاد۔ کیونکہ جہاد خود دینی عقائد کی درستی کا ذریعہ تھا۔ دینی عقائد کی اصلاح و تجدید کے لیے جہاد کی تحریک کو کامیاب بنانے کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ اسماعیل مسلسل عقائد کی درستی کے لیے زور دیتے رہے ہیں تحریک کے سیاسی پہلو پر عوام کو براہ راست متحرک کرنا مشکل ہوتا ہے اس کے لیے یا تو ان کے معاشی مسائل، روٹی روزگار کے مسئلوں پر زور دینا ہوتا ہے اور ان مسائل پر رائے عامہ کو پہلے پہل منظم کیا جاتا ہے لیکن تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ معاشی مسائل اور روٹی روزگار کے جھگڑے اس وقت تک حل نہیں ہو سکتے جب تک کہ سیاسی مسائل حل نہ ہوں یہی وجہ ہے کہ ٹریڈ یونین تحریکیں بالآخر ایک نہ ایک حد تک سیاسی امور میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ خود ٹریڈ یونین کے مسائل بھی بغیر سیاسی اقتدار کے حصول کے حل نہیں ہو سکتے۔ لیکن ڈیڑھ صدی پہلے یہ اسلوب رائج نہ تھا۔ روٹی روزگار کے مسائل کو براہ راست حل کرنے والے ادارے اور مزدور طبقے منظم وجود میں نہ آئے تھے۔ اس وقت مذہبی عقائد کا نام لے کر ہی عوام کو متحرک کیا جا سکتا تھا اور یوں ہی کیا جا سکتا تھا کہ بنیادی طور پر دینی عقائد کی اصلاح کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں ایک اسلامی حکومت قائم ہو۔ اس سے عام ذہنوں میں یہی تصور ہوتا ہے کہ اس میں خدا کی حاکمیت ہو گی اور کوئی انسان کسی دوسرے

انسان پر ظلم نہیں کر سکے گا۔ روزمرہ کی ضروریات کی کفالت اس حکومت کی ذمہ داری ہوگی اور بدحالی اور لوٹ مار اور افراتفری کا دور ختم ہوگا۔

جمہوری تحریک کے اثرات

ڈیڑھ صدی پہلے کے حالات میں جمہور کو دینی عقائد کی اصلاح کے لیے بھی منظم کرنا ایک بہت بڑا قدم تھا۔ چنانچہ جب شاہ شہیدؒ نے "تقویت الایمان" لکھی تو اس نے تہلکہ مچا دیا۔ یہ اس وقت اردو زبان میں لکھی گئی تھی۔ جب یہ زبان گھٹنوں چلنا سیکھ رہی تھی لیکن شاہ اسماعیل نے اس زبان کو اپنایا۔ کیونکہ یہ عوام کی زبان تھی۔ اس زبان میں انھوں نے ایسا اسلوب اپنایا جو اس سے پہلے کسی کو نصیب نہ ہوا تھا۔ صحت مند جمہوری تحریکوں کا یہ طرۂ امتیاز ہوتا ہے کہ وہ صرف عوام میں خود اعتمادی، اپنے حقوق کے لیے لڑنے مرنے کا جذبہ اور صالح اقدار ہی کو جنم نہیں دیتیں بلکہ زبان کو بھی نکھارتی ہیں۔ ادب کو بھی مالا مال کرتی ہیں۔ تحریر و تقریر کو بھی مانجھتیں ہیں۔ شاہ اسماعیل نے تمام دینی مسائل کو جو اب تک صرف علماء اور صاحبان علم کا حصہ سمجھے جاتے تھے اس قدر آسان طریقے سے قلم بند کیا کہ عام لوگ بھی ان پر سر دھننے لگے، ان سے مستفید ہونے لگے۔ شاہ اسماعیل نے کلمہ طیبہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا:

> "ایمان کے دو جزو ہیں، خدا کو جاننا اور رسولؐ کو سمجھنا۔ خدا کو جاننا اس طرح ہوتا ہے کہ اس کے سوا کسی کی راہ نہ پکڑے۔ اس پہلی بات کو توحید کہتے ہیں اور دوسری کو اتباع سنت کہتے ہیں۔ اس کے خلاف کو بدعت۔"

جب اسی بات کی آگے چل کر وضاحت کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس طرح مسلمان عوام کے دلوں سے ہر قسم کا خوف نکالنا چاہتے تھے۔ ہر قسم کی توہم پرستی کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے اور اس کی جگہ صرف خدا کا خوف انسانوں کے دلوں میں ڈالنا چاہتے تھے۔ کیونکہ بغاوت کی غرض سے کسی تحریک کی تنظیم کے لیے انسان کو نڈر ہونا پڑتا ہے

ایک زمانے میں پیر فقیر، قبر اور تعویذ گنڈے کے خوف کے خلاف جہاد ضروری تھا اور ایک وقت میں پولیس کے سپاہی سے لے کر گاؤں کے نمبردار، ذیلدار اور پٹواری کا خوف نکالنا ضروری ٹھہرا۔ شاہ اسمٰعیل لکھتے ہیں

"سننا چاہیے کہ اکثر لوگ پیروں، پیغمبروں کو اور اماموں، شہیدوں کو مشکل کے وقت پکارتے ہیں، ان سے مرادیں مانگتے ہیں اور ان کی منتیں مانتے ہیں اور حاجت روائی کے لیے ان کی نذر و نیاز کرتے ہیں، اور بلا کے ٹلنے کے لیے اپنے بیٹوں کو ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ کوئی اپنے بیٹے کا نام عبدالنبی رکھتا ہے کوئی علی بخش کوئی حسین بخش کوئی پیر بخش، کوئی مدار بخش، کوئی غلام محی الدین کوئی غلام معین الدین اور ان کے جینے کے لیے کوئی کسی کے نام کی چوٹی رکھتا ہے کوئی کسی کے نام کی بدھی پہناتا ہے، کوئی کسی کے نام کے کپڑے پہناتا ہے کوئی کسی کے نام کی بیڑی ڈالتا ہے کوئی کسی کے نام کے جانور ذبح کرتا ہے کوئی مشکل کے وقت کسی کی دہائی دیتا ہے، کوئی اپنی باتوں میں کسی کے نام کی قسم کھاتا ہے۔ غرض کہ جو کچھ ہندو اپنے بتوں کے ساتھ کرتے ہیں سو وہ سب کچھ یہ جھوٹے مسلمان انبیاء اور اولیاء سے، اماموں سے شہیدوں سے اور فرشتوں سے کر گزرتے ہیں اور دعویٰ مسلمانی کا کیے جاتے ہیں سبحان اللہ! یہ منہ اور دعویٰ!"

تحریک کے بنیادی نعرے

اس تحریک کے بنیادی نعرے یہی عقائد کی اصلاح کے تھے اور یہی اصلاح اس کی رکنیت کا فارم ہے۔ یہی لباس (وردی) ہے جس طرح سے کسی زمانے میں کانگرسی اور خلافتی کی پہچان اس کا لباس ہوتا تھا۔ جس طرح کسی زمانے میں مسلم لیگی کے لیے جناح کیپ کا رواج ہوا تھا، اسی طرح ڈیڑھ صدی پہلے اس تحریک کو انسانوں کے انبوہ سے ممیز کرنے کے لیے یہ اصلاح بنیاد بنی۔ اسی اصلاح کی بنیاد پر بود و باش قائم ہوئی۔ کیا حاجی شریعت اللہ نے فرائضی تحریک کی

ابتدا کرتے ہوئے اپنے ماننے والوں کو سیدھی لنگی باندھنے کی ہدایت نہیں کی تھی؟ تحریکوں کے لیے یہ اقدام ضروری ہوتے ہیں اور ضروری ہی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ ان میں سے اکثر غیر شعوری ہوتے ہیں، لیکن غیر شعوری طور پر ہی سہی تاہم ان کا نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے کہ تحریک ایک خاص رنگ ڈھنگ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ اس کا خاصہ بن جاتا ہے اور اسی سے یہ تحریک پہچانی جانے لگتی ہے۔ چنانچہ یہ تحریک بھی اپنے عقائد اور اوران پر متشددانہ عمل سے اس انیسویں صدی میں ممیز ہونے لگی عقائد کی اصلاح کے لیے بنیادی بات عوام سے رابطہ ہونا ہے تقریباً آٹھ برس تک یہ تحریک دعوت و تبلیغ کے ذریعے عوام سے رابطہ قائم کیے رہی۔ اسی نعرے نے ان میں حرکت پیدا کی دین کے لیے لگن اور جذبہ ابھارا اور پھر اپنے عقائد پر پوری طرح عمل درآمد کے لیے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت لازمی قرار دی گئی۔ اسی مقصد کے لیے جہاد ضروری شرط بن گیا اور جماعت کی تبلیغی سرگرمیوں اوران کی بنیاد پر جماعت کی تنظیم اور عوام میں جہاد کے جذبے کی نشو و نما اور اس کے لیے تنظیم' اس دور میں سید احمد، سید اسماعیل اوران کے دوسرے رفقاء کے پیش نظر رہی ان مقاصد کے حصول کے لیے کوششوں کے متعلق مولانا غلام رسول مہر نے سید احمد کے پہلے دورے کا حال قلم بند کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"یہ دورہ بظاہر پیروں اور پیرزادوں کا سا تھا۔ یعنی سید صاحب مریدوں کی ایک جماعت کے ساتھ شہر بہ شہر، قریہ بہ قریہ پھرتے رہے ہر مقام پر دعوتیں بھی ہوئیں۔ توبہ وارشاد کی بیعت بھی لی جاتی تھی۔ عام پیروں کی طرح حلقے بنا کر توجہ بھی دی جاتی تھی۔ لیکن بعض خصوصیات میں یہ دورہ عام پیرزادوں کے دورے سے بالکل مختلف تھا مثلاً باقاعدہ وعظ کیے جاتے تھے جن میں بدعات و محدثات کے ردّ و ازالہ پر زور دیا جاتا تھا۔ اسلامی احکام کے فضائل ایسے انداز میں سنائے جاتے تھے کہ جو سنتا وہ دل وجان سے انھیں قبول کر لیتا تھا۔ ان رسموں کو پورے اہتمام سے ختم کیا جاتا تھا جو مدت تک ہندوؤں کی معیت میں رہنے کے باعث مسلمانوں میں بھی سرایت کر گئی ہیں۔ غیر اسلامی نام بھی بدل دیے گئے۔ مثلاً

امام بخش کا نام بدل کر امام دین رکھ دیا گیا۔ خود سید صاحب کی توجہ اس درجہ پر تاثیر تھی کہ اکثر لوگ ایک ہی مرتبہ آپ کے حلقے میں بیٹھ کر دینی شیفتگی کا پیکر بن گئے۔"

جہاں تک اس دعوت و تبلیغ کے اصل مقاصد کا تعلق تھا اس کے متعلق مولانا مہر فرماتے ہیں:۔

"اصل مدعا یہ تھا کہ اصلاح عقائد و اعمال کا پیغام پہنچایا جائے۔ ساتھ ساتھ یہ دیکھا جائے کہ مسلمان اس بڑے کام کے لیے کس حد تک مساعدت پر آمادہ ہیں۔ جو ابتدائے شعور سے سید صاحبؒ کے قلب و رُوح میں ایمان کی طرح متمکن تھا۔ یعنی اغیار کے تسلط کو ختم کرنے کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کا آغاز اور حکومتِ اسلامیہ کی تاسیس۔ اس نقطۂ نگاہ سے بھی سید صاحبؒ کا دورہ بہ ہمہ وجوہ کامیاب رہا۔ اسی طریقے پر دعوتِ احیائے اسلام دیتے ہوئے وہ رائے بریلی پہنچے، پھر اسی رنگ میں انھوں نے الٰہ آباد، بنارس، کانپور، اور لکھنؤ وغیرہ کے اطراف میں دورے کیے۔ یہاں تک کہ فدا کارانِ اسلام کی ایک قدوسی جماعت تیار ہو گئی اور مستقلاً جہاد کا آغاز ہو گیا۔ اس دور کے لیے روانگی سے پہلے شاہ عبدالعزیزؒ نے مختلف علاقوں میں سید احمدؒ کی آمد کے متعلق تعارفی خطوط بھی لکھے تھے اور پیغام بھی بھجوائے تھے کہ سید صاحبؒ ہمارے آدمی ہیں ان کی تواضع میں کوتاہی نہ ہو۔"

اس سے بھی اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ دورۂ دعوت و تبلیغ خود شاہ عبدالعزیزؒ کے ایما اور مشورے ہی سے شروع ہوا تھا اور یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ یہ نیا طریق کار بھی شاہ ولی اللہؒ کی چلائی ہوئی تحریک کا نیا طریقِ کار تھا جو براہِ راست رابطہ عوام کے اسلوب کو اپنا رہا تھا۔

اختتامیہ

میں پہلی جلد شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تبلیغی سرگرمیوں پر ختم کر رہا ہوں اگلی جلد سید احمد شہیدؒ کی تحریکِ جہاد پر تفصیلی تبصرہ سے لے کر شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کی سرگرمیوں پر ختم ہو گی یہ تقریباً ایک سو سال کا عرصہ بنتا ہے، اس ایک سو سال میں برصغیر پر کیا کیا نہیں بیتی۔ کیا کیا نہیں معرکے ہوئے، ۱۸۵۷ء کا دور گزرا، دیوبند قائم ہوا، سرسیّد کی تحریک نے تہلکہ مچایا پنجاب انگریزی عملداری میں آیا، سکھوں میں سنگھ سبھا کی تحریک اُبھری اور ہندوؤں میں آریہ سماج نے دیکھتے دیکھتے پورے شمالی ہند کو لپیٹ میں لے لیا۔ پھر مرزا غلام احمد کی تحریک نے طوفان بپا کیے، سودیشی کی تحریک ابھری مسلم لیگ قائم ہوئی، نوجوان ترکوں نے انقلاب بپا کیا اور اسی زمانے میں یہاں دہلی میں ۱۹۰۸ء میں شیخ الہندؒ نے دینی تعلیم کا اجراء کیا تو اس میں مولانا احمد علیؒ کو بھی درس و تدریس کی ذمہ داری سونپی گئی، پھر مولانا عبیداللہ سندھیؒ افغانستان جاتے ہیں، عارضی حکومتِ ہند قائم کرتے ہیں۔ شیخ الہندؒ خود حجاز جاتے ہیں۔ غرضیکہ یہ سو ل یعنی ۱۸۲۰ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک کا عرصہ بن کر وہ تحریکیں اپنے دامن میں چھپاتے ہوئے ہے، یہ پورا دور اگلی جلد میں کھنگالوں گا۔

اس تمام دفتر کا مقصد و مطلب یہ ہے کہ مولانا احمد علی رحمۃ اللہ کو ذکر و فکر اور صاحب کشف و کرامات کے ساتھ ساتھ ایک وسیع کینوس میں، ایک بڑے پس منظر میں رکھ کر دیکھنا چاہیے اور سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ جب حضرت مولانا احمد علی شرک و بدعت کے خلاف مناظرے بپا کرتے ہیں، پمفلٹ رقم کرتے ہیں۔ جلسے منعقد کرتے ہیں، گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے ہیں

اور مسلمانوں کو اصراف سے بچنے کے لیے نصیحتیں کرتے ہیں تو وہ تحریک کے تسلسل کو قائم رکھتے ہیں جس کے ڈانڈے شاہ ولی اللہؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ سے جا ملتے ہیں۔ اسی طرح جب وہ ہجرت کرتے ہیں تو وہ اسی سلسلہ کا ایک حصہ تصور ہوتے ہیں اسی زنجیر کی ایک کڑی ہوتے ہیں جس کی ابتداء سید احمدؒ کی تحریکِ جہاد سے ہوئی تھی۔

اسی طرح جب وہ کانگرس اور حکومت کی ہمنوائی کرتے ہیں، جب وہ جمعیۃ العلمائے ہند کے سرگرم قائد بنتے ہیں، جب وہ مجلس احرار کی مجلس عاملہ کے رکن چنے جاتے ہیں تو وہ کوئی نئی بات نہیں کر رہے ہوتے وہ فقط شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کی تحریک کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اس لیے میں نے مولانا احمد علیؒ کی سوانح کو ایک تسلسل میں رکھ کر دیکھا ہے اور جو کام میں نے پہلی جلد میں شروع کیا ہے وہ انشاءاللہ دوسری جلد میں بھی جاری رہیگا کیونکہ جو کام اور فکر صدیوں پر پھیلا ہوا ہو اس کو رقم کرنے کے لیے بھی تو ایک نہیں کئی جلدیں درکار ہیں۔

یہ کام جب شروع کیا تھا تو خیال تھا کہ دو جلدوں میں ختم کر دوں گا۔ لیکن اب جب یہ سلسلہ شروع ہوا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ غالباً دو جلدوں میں سمیٹا نہیں جائے گا۔ کیونکہ میں اس کو ایک طرف مولانا احمد علیؒ کے خانوادے کے حوالے سے موجودہ نظام مصطفےٰ کی تحریکوں کے مختلف گوشوں کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں اور یہ اس لیے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ آج مختلف مسلم ممالک میں زبردست سماجی تبدیلیاں ہو رہی ہیں، الجزائر، لیبیا، عراق اور شام میں سوشلسٹ حکومتیں قائم ہو گئی ہیں۔ ان کے مقابلے میں سعودی عرب میں بادشاہت ہے ایران میں شہنشاہیت دم توڑ چکی ہے۔ غرضیکہ دنیائے اسلام میں زبردست سماجی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، اس لیے ان سماجی تبدیلیوں کی پوری ماہیت جاننا ضروری ہے، اس لیے یہ کام دو جلدوں میں سمیٹا نہ جا سکے گا۔ بہرحال یار زندہ صحبت باقی۔

اگر زندگی رہی تو حضرت مولانا احمد علیؒ کے حوالے سے یہ عظیم کام مکمل ہو رہے گا۔

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ، مجھے کام اپنے ہی کام سے
ترے ذکر سے، تری فکر سے، تری یاد سے، ترے نام سے

آخر میں پڑھنے والوں سے درخواست ہے کہ وہ ایک تو اس پہلی جلد کے بارے میں اپنی آراء اور اپنے مشوروں سے مجھے نوازیں، دوسرے اگر مولانا احمد علیؒ کے سلسلے میں ان کے پاس کوئی خط، کوئی مواد ہو تو ازراہ مہربانی اس سے مجھے مستفید ہونے کا موقع دیں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچانے کی ہمت عطا فرمائیں۔

کیا جانیے کہ حشر ہو کیا صبح حشر کا
بیدار تیرے دیکھنے والے ہوئے تو ہیں

عبداللہ ملک
الکوثر۔ ۴۶ شوکت حیات کالونی
ماڈل ٹاؤن لاہور

عبداللہ ملک

کی اہم کتابیں

داستانِ دار و رسن

صفحات ۳۵۰، سائز ۱۸×۲۲/۸، مجلد مع گرد پوش

قیمت: ۳۵ روپے

یہ کتاب پاک و ہند اور بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک سے متعلق ہے۔ ایوب شاہی دور میں مارے جانے والے مشہور کمیونسٹ لیڈر حسن ناصر کی شہادت کی پوری تفصیلات۔ کس طرح شاہی قلعہ میں اس کی موت ہوئی اور اس موت کا ہائی کورٹ میں کیسے چرچا ہوا، کتنے مقدمے چلے، کتنی تحقیقاتیں ہوئیں۔ ان سب تفصیلات کو پہلی بار قلم بند کر کے یکجا بھی کیا گیا۔ اس کی پوری سوانح اور اس دور کی کمیونسٹ تحریک کے عروج و زوال کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

اسی طرح سے اس میں کیمبلپور کے میرداد کا تذکرہ ہے جو عین شباب میں ۱۹۴۶ء میں جہازیوں کی بغاوت میں بندوق بدست مارا گیا۔ یہ میرداد جو جیل سے فرار ہوا۔ اس کی پوری کہانی ہے کیسے اس نے روپوش رہ کر انقلابی تحریکوں میں حصہ لیا۔ کیسے وہ دیس دیس میں روٹی روزگار کے لئے مارا مارا پھرا۔ اور وہ پھر کس طرح بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک میں شریک ہوا۔ یہ سب کہانیاں ان صفحات میں بکھری پڑی ہیں۔

یہی نہیں بلکہ بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کے بعض عظیم دانشوروں کی روئداد حیات اور ان کی تحریریں اس کتاب میں پہلی بار یکجا ہوئی ہیں۔ ان میں جی گوریا کی مفصل سوانح اور تحریریں ہیں۔ ان میں پیرس کے گبریل پیری، چیکوسلوویکیہ کے جیولس فیوچک، انگلستان کے رالف فاکس اور چین کے سات شہید ادیبوں کا تذکرہ شامل ہے۔

پنجاب کی سیاسی تحریکیں

۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۰ء تک

صفحات ۳۵۰، مجلد مع گرد پوش
سائز $\frac{18 \times 22}{8}$، قیمت، ۳۰ روپے

ان صفحات میں اس دور کی ان تحریکوں کا تذکرہ اور تجزیہ ہے۔ جنہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے نچلے متوسط طبقہ کو متاثر کیا۔ ان تحریکوں کی تاریخ ہی نہیں بلکہ اس وقت کے پنجاب کا پورا سیاسی و سماجی پس منظر بھی بیان کیا گیا ہے۔ ان تحریکوں میں راشٹریہ سیوک سنگھ ہے۔ مجلس احرار ہے۔ خاکسار ہیں، چھپن فیصدی کی تحریک کا تذکرہ ہے۔ قادیانیوں کی تحریک کی مقبولیت اور مخالفت کی روئیداد اور تفصیلی تجزیہ ہے اُردو ہو یا انگریزی ان تحریکوں پر کوئی بھی ایسی جامع کتاب ابھی تک سپردِ قلم نہیں کی گئی۔

بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہدِ آزادی

۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء

صفحات ۵۰۰، سائز $\frac{18 \times 22}{8}$ قیمت ۵۰ روپے

یہ ضخیم کتاب بنگالی مسلمانوں کی تاریخ ہے اس میں انگریز کی آمد اور اس کے بندوبست دوامی کے نتائج میں چلنے والی مذہبی اور کاشتکاروں کی تحریکوں کی روئیداد ہے۔ بنگال میں اسلام کیسے آیا اور اس نے کن طبقوں کو متاثر کیا۔ بنگالی زبان اور ادب کیسے متاثر ہوئے۔ ان تمام باتوں کا ذکر ان صفحات میں ملے گا۔ اس میں "زمین خدا کی ہے" یہ نعرہ مولوی شریعت اللہ نے بلند کیا۔ جو فرائضی تحریک کے بانی تھے۔ ان تمام تحریکوں کا تذکرہ ہی نہیں۔ بلکہ ان تحریکوں اور سید احمد شہید کی تحریک کے تعلق پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ کیسے بنگال اور بہار کے کاشتکار صوبہ سرحد میں آزادی کی جدوجہد کے لئے جمع ہوتے رہے۔ اس کتاب سے بنگالی مسلمانوں کے اس ورثے کا پتہ چلتا ہے جو ہم سے ہم آہنگ بھی تھا اور الگ بھی، اور ایک صدی بعد کے رونما ہونے والے واقعات کا پورا پس منظر اس کتاب سے اجاگر ہوتا ہے۔